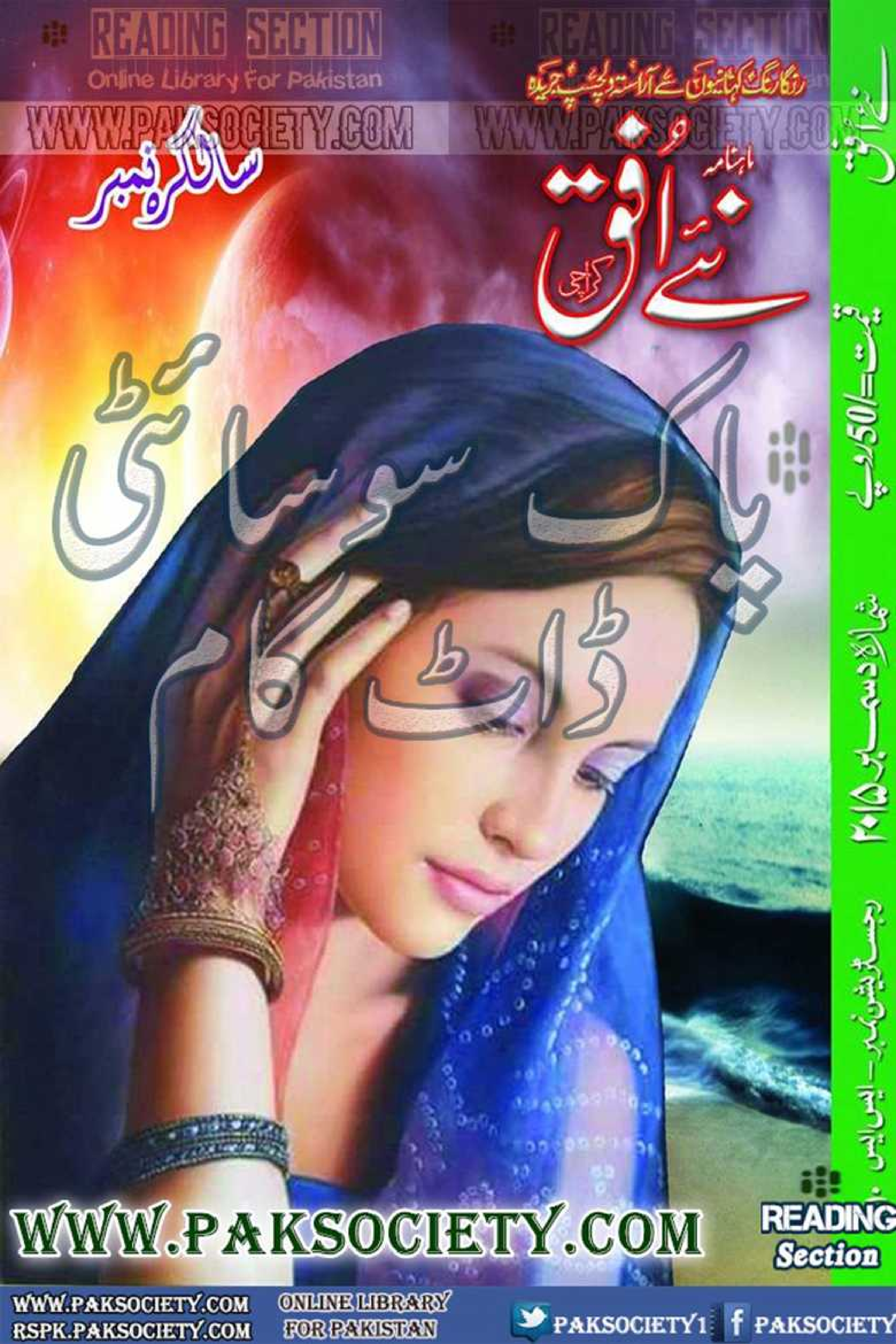

رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے اُفق
کراچی
سالگرہ نمبر
نئے اُفق
قیمت=/50 روپے
شمارہ دسمبر ۲۰۱۵
رجسٹریشن نمبر - ایس ایس
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

سسپنس تجسس اور حسن سے لبریز ایک ناقابل فراموش کہانی

امجد جاوید کے قلم کا شاہکار ناول

عورت زاد

عورت زاد اس حسینہ کی کہانی جسے اِس ظالم معاشرے نے جنم دیا

عورت زاد اس عورت کا احوال جس نے ظالم معاشرے میں علم بغاوت بلند کیا

عورت زاد آہنی ارادوں والی ریشم بدن کی روداد جس نے وقت کی لگام کو تھام لیا

عورت زاد حالات کی بنائی ہوئی سنگلاخ راہوں پر چلنے والی ایک نازک اندام

عورت زاد آگ وخون سے گذر کر منزل کی طرف گامزن رہنے والی برق صفت دلربا

عورت زاد ایک صنف نازک کی سرگذشت، جو باغی دلوں پر حکومت کرنا جانتی تھی۔

بہت جلد نئے افق کے صفحات پر ملاحظہ کیجیے

نئے افق کے سالانہ خریدار بن کر اپنی کاپی آج ہی محفوظ کرالیں

ماہنامہ
نئے افق کراچی

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
عمران احمد
مدیر معاون
اقبال بھٹی
مدیر خصوصی
طاہر احمد قریشی
مسئول
نورالدین

جلد	40
شمارہ	01
دسمبر	2015

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس

NAEYUFAQ PUBLICATION

پاکستان (فی پرچہ)..........50 روپے
پاکستان (سالانہ)..........600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchalpk.com/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

بھارت عدلی قوت کے اعتبار سے جدید ترین اسلحہ کے اعتبار سے عالمی سر پرستی اور تعاون کے اعتبار سے جوہری توانائی اور ہتھیار کے اعتبار سے غرض خطے میں ہر طرح کی برتری بھارت کو حاصل ہے۔ لیکن پھر بھی پاکستان سے وہ خوف زدہ رہتا ہے۔ بھارت جو کہ پاکستان سے کئی گنا بڑا ملک ہے۔ رقبے کے اعتبار سے بھی اور آبادی کے لحاظ سے بھی یقیناً خطے کا سب سے بڑا ملک ہے اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اسے روس، امریکا، فرانس، برطانیہ، اسرائیل کے علاوہ بھی دیگر یورپی ممالک کی سرپرستی کا اعزاز ہی حاصل نہیں ہے بلکہ ان میں سے کئی کا لاڈلا بھی ہے، ان ممالک سے اپنی دفاعی ضروریات کے لیے بے دریغ اسلحہ خریدتا رہتا ہے اور اپنی افواج کو ہر قوت، ہر قسم کی جدید ترین اسلحہ سے لیس رکھنے کے جنون میں مبتلا رہا ہے۔ اس کے باوجود بھارتی حکمراں اپنے سے کئی گنا چھوٹے پڑوسی پاکستان سے خوف زدہ رہتا ہے......! بھارتی حکمرانوں کا یہ خوف نہ تو افرادی کی بیشی کے باعث ہے، نہ ہی اسلحہ کی کسی کمی کے باعث اور تو اور بھارت تو کھلم کھلا بے دریغ ایٹمی تجربات کر کے پاکستان کے مقابلے میں کہیں آگے ہے اور ان تجربات کی حوصلہ افزائی، مدد و تعاون میں اس کے تمام غیر مسلم سرپرستوں کی بھی بھرپور حصے داری ہے۔ بھارتی حکمرانوں کو خوف نہ تو مادی ہے نہ فوجی بلکہ یہ ان کا نفسیاتی خوف ہے۔ کیوں کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور ایسا اسلامی ملک ہے جس نے اپنی مدد آپ اور اپنے وسائل اور خود اعتمادی سے ازخود ایٹمی قوت حاصل کرنے والا پہلا ملک ہونے کی وجہ سے بھی بھارتیوں کو مسلمانوں سے خوف رہتا ہے۔ کیوں کہ مسلمان ہندوستان پر ہزار برس حکمران رہے ہیں اور ہندوؤں کو ان کی تمام تر افرادی برتری اور قوت کے زیر نگیں رہنے پر مجبور رکھا وہ کئی نسلوں کا خوف ہے جو ہندو ذہن کے لاشعور سے ابھی تک نکلا نہیں ہے۔ بھارتی ہندوں مسلمانوں کو ایسا سانپ سمجھتے ہیں جس کا زہر نکلنے کے باوجود بھی اسے اتنا ہی خوف ناک زہریلا سمجھتے ہیں۔ بھارت ایک بے معنی خوف، بے چینی اور اضطراب کا شکار ہے اس کا یہی اضطراب خطے کو بے چین کیے رکھتا ہے۔

بھارت نے کبھی بھی پاکستان کے وجود کو خوش دلی سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا بلکہ اپنی سازشوں کی منصوبہ بندی پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ کرتا ہے جو ان کے دفاعی بجٹ کا حصہ ہوتا ہے۔ اب تک جتنی وارداتیں بھارت کے مختلف شہروں میں ہوئی ہیں چاہے وہ ممبئی دھماکے ہوں یا مکہ مسجد اجمیر یا مالی گاؤں میں ہونے والے بم دھماکے۔ گجرات کا قتل عام ہو یا

سمجھوتہ ایکسپریس کی آتش زدگی ان سب کا ملبہ بھارتی حکمران بڑی آسانی سے بلا تحقیق پاکستان پر ڈال دیتے ہیں اور عالمی سطح پر پاکستان کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں اور جب تمام تر تحقیقات کے بعد خود ان کے منہ پر سیاہی پھیلتی نظر آتی ہے تو کان دبا کر رہ جاتے ہیں۔ اب تک جتنے بھی حادثات بھارت میں رونما ہو چکے ہیں ان سب کا الزام بلا تحقیق اور بعد از تحقیق وہ پاکستانی تنظیموں خصوصاً لشکر طیبہ' حرکت الجہادِ اسلامی وغیرہ پر ڈال کر اپنا منہ کالا کر لیتے ہیں۔

امریکا جس کی آج کل ساری توجہ بھارت پر مرکوز ہے اس کی حمایت میں امریکہ نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں اگر بھارتی حکمران سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہتے ہیں تو امریکا اس کی آنکھ بند کر کے تصدیق کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہوتا ہے۔ اس کے پسِ پردہ کیا امریکی مفادات ہیں اسے سمجھنا ہوگا۔ جس طرح امریکا' کو سوویت یونین متحدہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا ایسے ہی چین' امریکی آنکھوں میں کھٹکتا رہتا ہے۔ پہلے امریکا نے پاکستان کے توسط سے روس کے ساتھ چین کا بھی راستا روکنے کی کوشش کی روس کو تو پاکستان کے توسط سے منتشر کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن چین پر اس طرح کا ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ اب بھارت پر اس کی کرم فرمائیاں صرف اس لیے بڑھ رہی ہیں کہ اس کی طویل سرحدیں چین سے ملحق ہیں اور بھارت خود بھی چین دشمنی میں امریکا سے دو ہاتھ آگے ہی ہے جب کہ پاکستان نے شاہراہ قراقرم بنا کر چین سے دوستی تجارت اور اخوت کے رشتے کو اور مضبوط اور مستحکم کر لیا ہے۔ پاکستان کا یہ عمل امریکا اور اس کے نئے حلیف بھارت کو پسند نہیں ہے۔ پہلے بھارت' امریکا اور اسرائیل کے گٹھ جوڑ سے بلوچستان میں آگ وخون کی ہولی کھیل رہا تھا اور بلوچستان کو مشرقی پاکستان کی طرح الگ کر دینے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا لیکن غیور بلوچوں پر قابو پانے میں بھارت کو اس طرح کامیابی نہیں ملی جیسے مشرقی پاکستان میں انہیں ملی تھی۔ چین کی پاکستان میں بڑھتی ہوئی مقبولیت سے نا صرف بھارت بلکہ امریکا بھی خوف زدگی کا شکار ہو رہا ہے اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آیا ہے۔ بھارت اور امریکی یہودی جو اسرائیلی مفادات کے لیے بے دریغ اربوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں جنہیں پاکستان کی ایٹمی قوت سے بھی نام نہاد خطرہ لگا رہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ پاکستان اپنے پڑوسیوں سے مل کر رہے اور خطے میں امن وسکون قائم ہو سکے۔ اللہ پاکستان کی حفاظت فرمائے اور پاک چین دوستی کو دشمنوں کی نظرِ بد سے محفوظ رکھے آمین۔

گفتگو

عمران احمد

"حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانوں کی مثال باہم محبت کرنے، آپس میں رحم دل ہونے میں اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کہ جب اس کے کسی ایک حصے کو تکلیف ہوتی ہے تو باقی سارا جسم بھی بیداری اور بخار میں اس کے ساتھ شریک ہونے کو پکار اٹھتا ہے۔" (متفق علیہ)

عزیزان محترم...... سلامت باشد

سال عیسوی کا آخری اور اسلامی سال کا دوسرا شمارہ حاضر مطالعہ ہے۔

اکتوبر جاتے جاتے ہمیں پھر صدمے دے گیا۔ ملک کے مختلف حصوں میں آنے والے زلزلے نے ہزاروں خاندانوں کو تباہ و برباد کر دیا اس زلزلے کی شدت گو پانچ سال پہلے آنے والے زلزلے سے زیادہ تھی لیکن گہرائی میں ہونے کی وجہ سے نقصان کم ہوا۔ آپ اس کی سائنسی توجیہات کچھ بھی پیش کریں لیکن یہ بات بہر حال طے ہے کہ ہمارا رب جو ہم سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے ہم سے ناراض ہے یہ زلزلے، طوفان، سیلاب اور اندوہناک حادثات اسی بات کی علامت اور اظہار ہے کہ ہم جو اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں اپنی راہ سے بھٹک چکے ہیں۔ غزہ ہو یا کشمیر عراق و شام ہو یا افغانستان یا پھر پاکستان ہر جگہ ہم کلمہ گو مسلمان سیاست فرقہ واریت کی بنا پر یہود سے زیادہ یہود و نصاریٰ کے آلہ کار بن کر ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم کس طرح پنپ سکتے ہیں۔ آیئے آپس میں محبتوں کو فروغ دے کر اپنے رب کو منائیں۔

اس ماہ ادارہ ہذا سے ایک اور پرچا "حجاب" بھی مارکیٹ میں آ گیا ہے اسے آپ آنچل کی بہن کہہ سکتے ہیں ہم اس کے معیار کے بارے میں کوئی بڑا دعویٰ تو نہیں کرتے لیکن یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ خواتین کے پرچوں میں حجاب ایک خوشگوار اضافہ ثابت ہوگا امید ہے قارئین نئے افق گروپ آپ پبلی کیشنز کے دیگر پرچوں کی طرح ماہنامہ حجاب سے بھی تعاون کریں گے۔

اس ماہ امجد جاوید صاحب نے نئے افق میں قلندر ذات کا اختتام کر دیا ہے۔ ویسے اس ناول کا ابھی اختتام نہیں ہوا، بقول ان کے کہانی اب جو موڑ لے گی نئے افق کے صفحات اس کے متحمل نہیں ہوسکیں گے۔ اس لئے وہ اسے کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ نئے افق میں وہ جلد ہی عورت ذات کے عنوان سے نئی سلسلے وار کہانی شروع کر رہے ہیں جو قلندر ذات سے بھی بڑھ کر ثابت ہوگی۔

﴿اس ماہ کا انعام یافتہ خط﴾

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم سے رقمطراز ہیں محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب سلام مسنون امید ہے آپ مع اپنے محنتی عملے کے خیریت سے ہوں گے۔ ماہ نومبر کا خوب صورت ٹائٹل والا نئے افق باصرہ نواز ہوا۔ عمران بھائی گزشتہ ماہ نئے افق لیٹ ملا کیونکہ میں منگلا سے باہر تھا خط لکھا لیکن لیٹ ہوگیا تھا بذریعہ ڈاک روانہ کرتا تو آپ کی بتائی ہوئی تاریخ پر نہ پہنچ پاتا کوشش کی کہ خط بذریعہ فیکس بھیج دوں مگر آپ کے دیئے گئے نمبر سے رسپانس نہ ملا لہٰذا لکھا گیا خط اب بھی میری فائل میں موجود ہے۔ میرے گزشتہ سے گزشتہ ماہ

کے خط کے جواب میں آپ نے مجھے جو اعزاز بخشا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس کا ذکر میں نے گزشتہ ماہ کے اپنے خط میں بھی کیا جو آپ تک بوجہ نہ پہنچ پایا۔ یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ محترم و مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کو اس سال فریضہ حج ادا کرنے کا شرف حاصل ہوا اللہ کریم ان کے اس فریضہ کو قبول و منظور فرمائے، آپ نے جس طرح سانحہ منیٰ پر روشنی ڈالی اس سے ہماری معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوا، گفتگو کے شروع میں آپ نے بہت پیاری حدیث بیان فرمائی ہے اور اپنی بات میں، ہم مسلمانوں کی زر پرستی پر صحیح چوٹ فرمائی ہے۔ ہم ان ہاتھوں کی میل کیلئے کتنی حدیں کراس کر جاتے ہیں یہ ہمارے لیے باعث شرم ہے کرسی صدارت پر اس بار اپنے خوب صورت خط کے ساتھ جناب فلک شیر ملک صاحب متمکن ہوئے بھائی فلک شیر صاحب بہت مبارک ہو آپ نے اپنے خط میں واقعی موتی پروئے ہیں۔ میری غزل پسند فرمانے کا بہت بہت شکریہ۔ دوسرا پیارا خط جناب مجید احمد جائی صاحب کا ہے یہ خط اتنا بھرپور ہے کہ اس کے مندرجات پر ہی تبصرہ کیا جائے تو خط بہت لمبا ہو جائے۔ انہوں نے ہماری قومی بے حسی پر جس طرح ضرب لگائی ہے وہ قابل ستائش ہے اے کاش ایسی لکھی گئی باتیں ہمارے دل میں اتر جائیں مگر ایسا ہوتا نہیں ہم یہ سب باتیں ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ محترمہ صائمہ نور کا خط بھی لائق ستائش ہے۔ انہوں نے جو دعا کی ہے میں اس پر آمین کہتا ہوں، صائمہ نور صاحبہ کسی کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ جائے اس سے بڑا کوئی سانحہ نہیں میں بھی اس مرحلے سے گزر چکا ہوں اس وقت جو فیلنگز ہوتی ہیں انہیں لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا لیکن ان حالات میں مایوس نہیں ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ آپ کا اور آپ کی فیملی کا حامی و ناصر ہو آمین۔ عمر فاروق ارشد بھائی آپ کی صحت کی خرابی کا پڑھ کر بہت پریشانی ہوئی خداوند قدوس اپنی خاص رحمت سے آپ کو صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے آمین۔ گزشتہ ماہ شائع ہونے والی آپ کی سوہنی من موہنی تحریر پر تبصرہ گزشتہ ماہ کے خط میں کیا تھا مگر وہ خط ادارہ تک نہ پہنچ سکا جس کی وجہ اپنے خط کے شروع میں بیان کر چکا ہوں۔ بہرحال بہت پیاری تحریر تھی اس طرح کی نگارشات سے ہمیں نوازتے رہا کریں۔ آپ نے یاسر عرفات اور جمال عبدالناصر کے بارے میں بالکل بجا فرمایا وہ اپنے دور کے میر جعفر میر صادق تھے۔ محترم ریاض بٹ صاحب آپ کا میرے بارے میں گمان لائق ستائش ہے۔ میں بفضل خدا انسان سے پیار کرنا سیکھا ہے بشرطیکہ وہ انسان ہو، انسان کے روپ میں بھیڑیے نہ ہوں، آپ کی گزشتہ ماہ چھپنے والی کہانی بہت خوب تھی اس پر میں نے تبصرہ بھی خوب کیا تھا اور اتنی اچھی کہانیاں لکھنے پر آپ کو مبارک باد بھی دی تھی مگر وہ خط نئے افق کے صفحات کی زینت نہ بن سکا، آپ اس کہانی اور اس ماہ چھپنے والی کہانی حفظ ما تقدم پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ حافظہ لائبہ قریشی صاحبہ کا خط غصے بھرا تھا جس میں انہوں نے محترم عمر فاروق ارشد صاحب اور ظہور احمد صائم صاحب کے خوب لتے لیے۔ اس معاملے میں جناب ایڈیٹر صاحب کی بات سے بالکل اتفاق کرتا ہوں کہ کسی سے تبصرہ لکھوانا اور شاعری میں اصلاح لینا کوئی بری بات نہیں اور دو دوستوں کی شاعری میں ایک جیسا رنگ پیدا ہونا بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں، جرم یہ ہے کہ کسی اور شاعر کا کلام من وعن اپنے نام اور تخلص کے ساتھ شائع کرا دیا جائے یہ قابل گرفت ہے۔ جناب ممتاز احمد کا مختصر تبصرہ خوب تھا ممتاز بھائی خط پسند فرمانے کا شکریہ، منشی عزیز کا تبصرہ بھی خوب ہے۔ محترم بھائی ابن مقبول جاوید احمد صدیقی حسب سابق بڑے اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے جناب عمران احمد صاحب نے واقعی مجھے بہت بڑا اعزاز بخشا ہے دراصل کسی کے لیے اپنے دل میں جگہ پیدا کرنا بڑی اعلیٰ ظرفی ہے۔ رب کریم ان کو اس کا اجر عطا فرمائے، آمین۔ اقراء کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف

ہے۔ ایمان کو تازہ کرنے والا یہ مختصر سیکشن بہت ہی قابل تعریف ہے۔ ذوق آگہی میں تمام انتخاب خوب ہے۔ خوشبوئے سخن بھی بہترین تخلیقات سے مزین ہے۔ تمام کہانیاں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں اللہ تعالیٰ اس لاجواب جریدے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، آمین۔

صائمہ نور...... ملتان السلام علیکم! اُمید کرتی ہوں، اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے ہنستے مسکراتے، ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ میرے سوہنے اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کی نعمتوں سے نوازیں، محبتیں اور چاہتیں ملیں، اُس کے محبوب کی خوشنودی حاصل ہو، بیماریوں سے محفوظ اور امن کی زندگی جینے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ ماہ نومبر کا نئے اُفق سترہ اکتوبر کو ہنستے مسکراتے گنگناتے ہوئے ملا۔ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ، حجاب کی آمد کی نوید سناتا، بھلا لگا۔ دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی منیٰ میں شہید ہونے والے حجاج کرام کا ذکر فرماتے ہوئے، وقوف عرفہ کا ذکر کر رہے تھے۔ واقعی ہم نیکیاں بھی کرتے ہیں تو دکھاوے کی، ہماری عبادتیں دکھاوے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کاش ربّ کی رضا کے لئے عبادتیں کرتے تو آج آنسو، رسوائی مقدر نہ بنتی۔ اللہ تعالیٰ شہیدوں کے درجات بلند فرمائے آمین۔ گفتگو میں عمران احمد صاحب بجا فرما رہے تھے، اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ محترم فلک شیر ملک کا لولیٹر انعام یافتہ ٹھہرا، مبارک باد کے پھول محبتوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں قبول کریں۔ مجید احمد جائی کا تفصیلی تبصرہ، جامع، جاندار اور شاندار تھا۔ مجھے نئے اُفق میں جگہ دینے کا شکریہ، عمر فاروق ارشد، مہر پرویز دولو، (آپ کے تبصرے میں تبصرہ تو تھا ہی نہیں) نازیہ خانم، ادیب ایسے نہیں ہوتے، ادیب تو حساس دل ہوتے ہیں، قارئین اور معاشرے میں بسنے والے عام آدمی کا دُکھ سمجھتے ہیں، چھوٹے سے چھوٹا دُکھ، واقعہ کو سنجیدگی سے لیتے ہیں، جو لکھاری قارئین کی طرف توجہ نہیں دیتے وہ لکھاری نہیں، ادب کے نام پر سیاہ دھبہ ہیں جو اپنے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے مطلب نکالتے ہیں۔ ان کے ارادے اور ذہنوں میں شیطانیت ہوتی ہے ایسے لوگوں سے کنارہ کش ہی رہنے میں بہتری ہے۔ ریاض بٹ، خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضر تھے، حافظہ لائبہ قریشی مختصر تبصرے میں شکایات ہی کررہی تھیں جن کا جواب ایڈیٹر نے خوب دیا ہے۔ پیارے انکل ممتاز احمد جامع اور شاندار تبصرے کے ساتھ حاضر تھے، بھتیجی کا سلام قبول ہو، محترم منشی محمد عزیز مئے پہلی انٹری کمال فرما رہے تھے۔ چھوٹی بہن خوش آمدید کہتی ہے۔ عبد الغفار عابد، بہترین تبصرہ فرما رہے تھے اور آخری سیٹ ابن مقبول انکل جاوید احمد صدیقی کے نام ٹھہری، بہترین جملوں پر مشتمل شاندار تبصرہ تھا۔ اقراء، طاہر قریشی کے خوبصورت جملوں میں ترتیب یا کالم، انسان عقل وشعور رکھتے ہوئے بھی دیوانوں، پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرتا ہے۔ پل کی خبر نہیں سامان سو برس، والی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بے شمار نشانیاں قرآن مجید میں بیان فرمادی ہیں اور دُنیا کے لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جب بڑی بڑی ڈگریاں رکھتے ہوئے بھی کہتے ہیں کہ یہ مریض لاعلاج ہے، حالانکہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ سوائے موت کے ہر بیماری کا علاج میرے اندر موجود ہے۔ عقل کے اندھے اِدھر رجوع نہیں کرتے۔ کہانیوں میں حفظ ماتقدم، ریاض بٹ صاحب نے کمال لکھا، سرفراز خان نے اسکیم خوب بنائی مگر شومئی قسمت کہ اپنے داماد کو مروا بیٹھا، اب جیل کی کال کوٹھری ہی اس کا مقدر تھی۔ ویلڈن ریاض انکل۔ سرد ہوا، پُراسرار تحریر میں دیہات کی خوب منظر کشی کی ہے۔ ہندو جن کا مریم پر فدا ہونا کمال تھا، کہتے ہیں جنات میں بھی ہر مذہب کے جن ہوتے ہیں، جو مسلم ہیں وہ انسانوں کو نقصان نہیں پہنچاتے اور جو غیر مسلم ہیں جیسا کہ ہندو، شرپسند ہوتے ہیں اور انسانوں کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ سے لو لگائے رکھتے ہیں ان پر جنات کا اثر کبھی بھی نہیں ہوتا۔ آپ باوضو رہیں کبھی بھی جنات کا حملہ نہیں ہوگا۔ پری گل، دُکھی تحریر تھی، راحیلہ تاج نے تحریر کے ساتھ خوب انصاف کیا ہے۔ کتنا خوبصورت جملہ تھا، اچھے لوگ پھول نہیں توڑا کرتے۔ پھول شاخ پر ہویا

کسی انسان کی ذات کا مان ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ بہت خوب راحیلہ تاج باجی، نکما سید احتشام، طنز و مزاح کے ساتھ خوب پنڈت کو سچا قرار دے رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں کہتے ہیں جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور زمین پر ٹوٹتے ہیں، قرآن مجید فرما رہا ہے، جیسا مرد ہوگا ویسی عورت ملے گی، نیک مرد، نیک عورت، برا مرد، بری عورت، پھر زمانے والے کیوں مارے مارے پھرتے ہیں۔؟ فن پارے میں با اصول پسند آئی، واقعی قتل کرنے والا اصول پسند تھا، زرد پتا بھی شاندار رہی، مکافات عمل، سزا جزا اچھی رہی، اب آتے ہیں قسط وار کی طرف، روپ بہروپ، خوبصورت موڑ پر اختتام پذیر ہوئی، انکل محمد سلیم اختر صاحب بہت بہت مبارک باد قبول کریں۔ قلندر ذات پہلی اقساط نہیں پڑھی تھیں، اب نئی آنے والی تحریر پڑھیں گے (انشاءاللہ!) بے نام چہرہ، خوب رہی۔ ذوق آگہی، خوشبوئے سخن شاندار ہے۔ نامعتبر کی ابتداز بردست رہی۔ اب اجازت، زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی، جاتے جاتے لبوں پر دعائیہ کلمات ہیں کہ اللہ تعالیٰ اہل مسلم کو ہدایت دے اور پاکستان کا امن لوٹا دے آمین ثم آمین۔

مجید احمد جائی...... ملتان شریف۔ مزاج گرامی! بعد از سلام و محبت ڈھیروں دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ، لبوں پر مسکراہٹ، آنکھوں میں خواب سجائے، حاضر خدمت ہوں۔ میرے اللہ جی! آپ کو آپ سے جڑے ہر فرد کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے، غموں سے دُور، حاسدین کے شر سے محفوظ اور اپنوں کی محفلوں میں ہمیشہ محبتیں پھیلاتے ہوئے رکھے آمین ثم آمین۔ ماہ نومبر 2015 کا نئے اُفق، نئے اسٹائل کے ساتھ بہت جلد ہماری دسترس میں آیا۔ آنکھوں کو ٹھنڈک، دل کو سُرور بخش گیا۔ لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور دل سے دعا نکلی، اللہ تعالیٰ اس سے جڑے ہر شخص کو اپنی رحمتوں، نعمتوں سے ہمیشہ نوازتا رہے آمین۔ سرورق نے اپنا گرویدہ بنالیا، قابل دید سرورق دیکھ کر دل بھنگڑے ڈالنے لگا، خوشی خوشی آگے بڑھے اور پلکیں دستک پر جا ٹھہری۔ محترم جناب مشتاق احمد قریشی حق اور سچ فرما رہے تھے۔ غلطی کسی کی بھی ہو، سزا کتنوں کو ملی، ہم نے تو سنا تھا کہ سعودی شہزادے کی آمد کے پیش نظر راستے بند کیے گئے، جس کی وجہ سے بھگدڑ مچ گئی اور ہزاروں جانیں شہادت کے رُتبے پر فائز ہوئیں۔ غلطی کس کی تھی، قصور کس کا تھا، غور طلب بات ہے۔ بے شک ہمارے کرتوتوں سے، اللہ تعالیٰ عذاب نازل کرتا ہے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب تو عرفات میں حاجیوں کے ناچ گانے کی باتیں کر رہے تھے، مگر ہمارے پاکستان میں ہزاروں واقعے ملتے ہیں، ابھی کل کی بات ہے، حاجیوں کا گروپ واپس آیا اور ان میں میرے ہمسائے بھی تھے۔ دعوتیں ہوئیں، مبارک باد کی صدائیں آتی رہیں، پھر چند دنوں بعد حاجی صاحب اپنے سابقہ کرتوں پر اُتر آئے۔ اپنی یتیم بھتیجی پر ظلم کے پہاڑ گرا دیئے، اُس کے بچوں کو سڑک پر مارتے، پیٹتے رہے اور یہ تماشہ اہل ایمان، اہل مسلم، اہل محلّہ نے دیکھا، مگر بے حسی کی انتہا یہ کہ کسی نے ان کو منع نہ کیا، قصور صرف یہ تھا کہ اُس نے اپنے باپ کے حصے سے آنے والی وراثت مانگ لی تھی۔ ''گفتگو'' میں عمران احمد دلوں کے زنگ اُتارنے کی سعی فرما رہے تھے اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ محترم فلک شیر صدارت کی کرسی سنبھالے ہوئے تھے اور انعام بھی لے اڑے، مبارکاں، جناب، برفی اکیلے اکیلے کھا گئے اور ہم؟ تبصرہ خوبصورت تھا اور انعام کا حق دار بھی۔ مجید احمد جائی، کو دل میں جگہ دینے کا بہت شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک فرمائے اور مجھے بیٹیاں عطا فرمائے آمین۔ صائمہ نور کے تبصرے نے متاثر کیا، عمر فاروق ارشد شکایات کرتے نظر آئے۔ مہر پرویز دولو صاحب، کسی ایک شخص کو تنقید کا نشانہ بنانا ادیب کی خاصیت نہیں ہے۔ تحریروں پر اصلاحی تنقید اچھی لگتی ہے اور بات رہی صادق اور امین کی تو میں اور آپ، سیاستدان، حکمران، عوام، یہ معاشرہ، کوئی بھی نہیں۔ اگر حضور اکرم ﷺ کی ان دو صفات کی پیروی کی جاتی تو ملک اور قوم کا یہ حال ہرگز نہ ہوتا۔ ہمیں تو ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کے علاوہ

کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہے۔ جھوٹ ہم بولتے ہیں اور امانتوں میں خیانت ہم کرتے ہیں۔ یتیموں کا حق ہم مارتے ہیں، اپنے فرائض میں غفلت ہم کرتے ہیں، نماز ہم نہیں پڑھتے، رشوت، سود منافع خوری، ملاوٹ ہم کرتے ہیں تو دوسروں کو الزام کیوں۔؟ چور تو اپنے اندر ہے اور ہم ڈھنڈورا پورے شہر میں کرتے پھرتے ہیں۔ کسی کی ذات کو نشانہ بنانے سے پہلے خود کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ بُرائیوں کا سدباب کرنا ہے تو ابتدا خود سے کرنا ہوگی۔ قصوروار ہم ہیں، دوسروں پر الزام تھوپ کر خود کو بری الذمہ نہیں ٹھہرانا چاہیے۔ حقیقت تو یہ ہے جو سچ بولتا ہے زمانہ اُس کا دُشمن ہو جاتا ہے۔ ہمیں سچ کا ساتھ دینا چاہیے۔ سچ کڑوا ضرور ہوتا ہے مگر سر نہیں جھکنے دیتا ہے۔ دُنیا اور آخرت میں سُرخرو کرتا ہے۔ نازیہ خانم نے پہلے تو ادیبوں کی واٹ لگادی اور پھر ساحل ابڑو صاحب کے لئے تعریفوں کے محل تعمیر کر لئے، ایسا تضاد کیوں؟ میری ناقص عقل کے مطابق ادیب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے اور اُس کا ادب پڑھنے والے اگر اصلاحی تعریف اور تنقید کریں تو اُس کی راہنمائی ہو جاتی اور وہ مزید بہتر سے بہترین لکھتا ہے۔ شروع میں آپ کا لیٹر پسند آیا لیکن دوسرا رُخ حیران کر گیا۔ ریاض بٹ صاحب نے کمال تبصرہ کیا۔ حافظہ لائبہ قریشی نے خوب فرمایا، مگر میرے خیال میں بہترین بات دوسروں تک پہنچانی چاہیے، چاہے نام کوئی بھی لکھا جائے، ہاں کسی رائٹر کا مواد چوری کر کے اپنے نام سے شائع کروانا (پاپ) ہے۔ پیارے ممتاز احمد صاحب مختصر اور جامع تبصرہ فرما رہے تھے، اُمید ہے نئے اُفق کے صفحات پر ان کی کہانیاں بھی چمکیں گی۔ محترم منشی محمد عزیز مئے، پہلی ملاقات خوب رہی، ویلکم، خوش آمدید، ست بسم اللہ، جی آیاں نوں، خوبصورت تبصرہ کیا، پیارے عبدالغفار عابد صاحب جامع تبصرے کے ساتھ، اصلاحی تنقید بھی کرتے نظر آئے۔ میرے بھائی ہر گھر میں (گھر کی سیاست تو چلتی ہی رہتی ہے) ملکی سیاست سے خدا محفوظ رکھے آمین، ہمیشہ محبتیں اور خوشیاں پرائی پرائی باتیں لگتی ہیں، اب تو دوسرے کو نیچا کیسے دکھانا ہے، اُسے ذلیل کیسے کرنا ہے، ایسا ہی کچھ چلتا رہتا ہے۔ اہل مسلم ہو کر صراط مستقیم والے راستے سے بھٹک گئے ہیں، اسی لیے تماشہ بنے ہوئے ہیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی بہترین تبصرہ تھا۔ اقرا نے دلوں پر لگے زنگ کو اُتار دیا۔ وہی رب ہی تو ہے۔ جس نے ہمیں زمین پر اپنا نائب بنا کر بھیجا اور ہم کچھ اور بننے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ وہی رب ہے جس کا نام ''اللہ'' ہے، اُس نے زمین میں مختلف رنگوں سے مزین پھول اُگائے، مختلف پھل، سیب، امرود، خوبانی، اخروٹ، انار اور انار کے اندر پردے، اُس کی شان کے کیا کہنے۔ واہ مولا، تیری شان پہ قربان۔ کہانیوں میں سرد ہوا، ناز سلوش ذشے، نے پُراسرار کہانی خوب لکھی، خوب منظر کشی کی گئی، بیری کے درخت کے ساتھ تنور پر روٹیاں والے جملے نے اپنا گھر دکھا دیا اور مجھے آج معلوم ہوا کہ مغرب کے بعد بیری کے درخت پر جنات کی آمد ہوتی ہے، بلکہ نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں۔ ہندو جن نے اسلام قبول کر بھی لیا مگر اپنے کرتوں سے باز نہیں آیا۔ اسی لئے ہمارے پیارے آقا حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ یہودی کبھی مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا۔ حفظ ماتقدم ریاض بٹ، سرفراز خان ہی اصلی مجرم تھا، جو اُس نے اسکیم بنائی تھی، رقم چھین لینے کی۔ اُسی کی اسکیم نے ہی فرخ کا قتل کروایا۔ زبردست تحریر تھی، ویلڈن، (ایک جملے کی وضاحت چاہوں گا، باغ میں (بید) کی بنی ہوئی خوب صورت اور دیدہ زیب کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ بید کونسا درخت ہے، راہنمائی فرمائیے۔ اس کی کوئی نشانی، کوئی حلیہ، ؟ پری گل، راحیلہ تاج، کمال کی تحریر تھی، بیچاری پری گل کے ساتھ بہت بُرا ہوا، کیا خوبصورت جملہ لکھا گیا کہ (تم سے تو پنکھ پکھیر بھلے ہیں، جو پو پھوٹتے ہی بیدار ہو کر اپنے رب کی تعریف کرتے ہیں) بندے کو بھی کچھ تو بندگی کا ثبوت دینا چاہیے۔ حقیقت یہی ہے کہ آج کے مسلم معاشرے میں مرد حضرات سورج چڑھنے تک سوئے رہتے ہیں اور پھر روتا روتے ہیں، پوری نہیں پڑتی، مہنگائی بڑھ گئی ہے۔ رزق

دینے والی ذات تو اوپر ہے اور تم اُس کے احکامات بجالانے میں غفلت کرتے ہو، پھر رزق میں فراوانی کیسے ہو؟ ویلڈن راحیلہ تاج صاحبہ۔ تاش کے پتے وقارالرحمان، عام سی تحریر لگی، نکما سید احتشام، طنز کے تیر چلاتی، ہلکی پھلکی تحریر بھلی لگی، پنڈت اپنی بات پر سچا تھا۔ فن پارے سزا جزا بہترین تحریر تھی، بااصول کمال کی تحریر تھی، واقعی وہ اپنے اُصول کا پکا تھا، فلک شیر ملک بھی بازی لے گئے، زرد پتا خوب تھی، مکافات عمل، جاوید احمد صدیقی، چھائے رہے، روپ بہروپ کا اختتام شاندار رہا، ویلڈن محمد سلیم اختر صاحب، اُمید ہے انہی صفحات پر کوئی اور ناول لے کر آئیں گے، نامعتبر ناصر ملک، پہلی قسط کمال کی تھی، ناصر ملک صاحب ویلکم، قلندر ذات امجد جاوید صاحب اختتام کی طرف آئے ہیں، اچھا فیصلہ ہے۔ ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن، انعام پانے والے کو مبارکاں۔ ایڈیٹر صاحب، پرچے میں ایک ہی ناول قسط وار ہو تو اچھا ہے، باقی آپ کی مرضی۔ والسلام!

اشفاق شاہین...... کراچی شمارہ عیدالاضحی بروقت مل گیا تھا اس بار پنجاب جانے کی وجہ سے لکھنے میں ذرا تاخیر ہوگئی ہے لیکن امید ہے کہ شامل بزم ہو جائیں گے۔ آپ کی عنایت سے دستک میں مشتاق صاحب آسان مگر سبق آموز باتیں لے کر آئے۔ امید ہے کہ اس بار ہم اپنے ووٹ کا صحیح حق ادا کریں گے۔ گفتگو میں پہنچے جہاں ممتاز احمد اپنی ابتدائی انٹری ہی انعامی خط سے کر رہے ہیں کیا بات ہے ممتاز صاحب مبارکباد قبول فرمائیں اور خوش آمدید بھی۔ ظہور صائم حوصلہ رکھیں اور بروقت لکھیں، میرا ماننا ہے کہ یہاں بے انصافی نہیں ہوتی۔ غفار عابد خوب صورت خط کے ساتھ شامل محفل ہیں۔ باقی دوستوں کے خطوط بھی خوب تر اور رونق بزم کو بڑھاتے نظر آئے۔ ریاض بٹ ہمارا تو سیروں خون بڑھ گیا آپ کے الفاظ سے بٹ صاحب سدا سلامت رہیں، ناز سلوش کے لیے ایک طویل خط کے ساتھ آخری لکھاری تھیں گفتگو کی، ان کو دوبارہ سے خوش آمدید اور ہمت مت ہاریں، یہ زندگی ایک امتحان ہی ہے ایک۔ اب چلتے ہیں تبصرے کی طرف خود رونے کوئی خاص مزہ نہیں دیا البتہ ناصر اور شینا کے کردار پسند آئے۔ تعاقب ایک دلچسپ تحریر تھی۔ قاتل حسینہ خلیل جبار نے بہت اچھا لکھا۔ قلندر ذات میں گزارش ہے کہ کچھ کردار کم کریں۔ عشق نامراد بھی مزیدار اور خوب تحریر رہی ریاض بٹ نیکی کا دریا لے کر آئے بہت زبردست رہی۔ روپ بہروپ بہت اچھی جا رہی ہے۔ مختصر فن پارے سب بہترین تھے خصوصاً تسیم سکینہ صدف کا روبرو، فیصلہ عوام کا بالکل فضول لگا۔ خوشبوئے سخن میں انتخاب اچھا تھا اور ذوق آگہی واہ میری تحریر انعام یافتہ واہ، ابھی تک یقین نہیں آیا تمام دوستوں کو بہت بہت آداب عرض ہے۔

ساحل ابڑو...... ڈیرہ اللہ یار، بلوچستان سدا خوش رہو، مسکراتے رہو، ماہنامہ نئے افق 26 تاریخ کو ملا جسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی آپ جناب نے اس ناچیز کو دونوں اعزاز سے نوازہ، آپ کی بھیجی ہوئی تمام رقم مجھے مل گئی، بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ اور میں اقبال بھٹی صاحب کے ہاں بہت شرمندہ بھی ہوں کہ تاریخی کہانی کو جلد از جلد نہ بھیج سکا جس کی وجہ تھی گھریلو مصروفیات اور سمو کے واقعات جو بلوچستان کی بہت سی لائبریریوں میں بھی نہیں ملے رہے تھے۔ چند واقعات کو سامنے رکھ کر کہانی کی شکل دی گئی ہے جو یقیناً پڑھنے والوں کے دلوں میں محبت کا رنگ بھر دے گی اور دوسری تحریر (اہرمن گزیدہ) بھی ارسال ہے جو تمام قارئین کے لیے سبق آموز ثابت ہوگی اور رہنما بھی۔ اب کچھ باتیں دوستوں سے بھی ہو جائیں فلک شیر ملک بھائی مبارک ہو خوب صورت تبصرہ لے کر آئے اور 500 کا نوٹ لے کر گئے واہ بھائی واہ ففٹی ففٹی، ممتاز احمد، عبدالغفار عابد، پرویز احمد دلونے بھی بہت اچھا لکھا۔ مقبول احمد صدیقی کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ صدیقی صاحب میں آپ کو کہانیوں کی دنیا میں بھی شوق سے پڑھتا ہوں۔ آپ کو ادبی تاج پہنایا جائے پھر بھی کم ہے کیونکہ آپ ہمارے لیے استاد کا درجہ رکھتے

ہیں۔ منشی عزیز میے صاحب ویلکم بھائی بہت بہت شکریہ۔ نازیہ خانم باجی کیا نام دوں آپ کو اور کہاں سے لاؤں رنگ برنگے الفاظ جو تحریر کرتا جاؤں پھر بھی کم ہیں۔ مگر ساحل کی یہ آنکھ اگر حسن بازار میں بھی اٹھ جائے تو بہن کا رتبہ پاتی ہے کیونکہ میرے نزدیک تمام کے تمام رشتے پاس وفا کا بھرم رکھتے ہیں۔ جی ہاں باجی نازیہ آپ کے دونوں خط میری نظروں سے بھی گزرے تھے میں نے جواب دینا چاہا مگر (اندھا بانٹے ریوڑیاں بندہ اپنی جھول بھرے) کچھ ایسا دستور تھا خیر (مٹی کتنی بھی اوپر کیوں نہ اٹھے اسے گرنا زمین پر ہی ہے) کیونکہ ہر ڈائجسٹ کے ایڈیٹر کے اپنے خیالات ہوتے ہیں میری ہر تحریر کے اختتام پر ہیرو یا ہیروئن کو موت ضرور ہوتی ہے۔ مگر یہ میری کوئی مہارت نہیں اور نہ ہی راز داری ہے کیونکہ کہانی کا رخ ایک ایسے موڑ پر آن کھڑا ہوتا ہے جہاں مجبوراً اسے موت دی جاتی ہے۔ باقی میں کیوں لکھتا ہوں اور کیسے لکھتا ہوں تو وہ ایک الگ داستان ہے جو میری تخلیق سے وابستہ نہیں۔ باجی نازیہ میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو بہت سی خوشیاں دے، آپ ادب مطالعہ نہیں بلکہ ادب تخلیق ہو کیونکہ آپ کے اندر جذبوں کی لڑی ہے اور محبت کا وہ پہلو چھپا ہوا ہے جو آپ ایک بہترین رائٹر بھی بن سکتی ہو، باجی نازیہ آپ کا بہت بہت شکریہ جو مجھے آپ نے اس کے قابل سمجھا ورنہ خدا کی قسم میں کچھ بھی نہیں ہوں ایک بار پھر بہت بہت شکریہ۔ محمد سلیم اختر (روپ بہروپ) اختتام پر پہنچی جو زبردست تحریر لکھی گئی تھی۔ اس معاشرے کی عکاسی بھی بنی اور سبق آموز بھی سلیم اختر اللہ پاک آپ کے قلم میں اور پختگی دے آمین فلک شیر ملک اور مقبول صدیقی صاحب کی بھی تحریر بہت اچھی تھی۔ باقی تمام کہانیوں پر تو میں تبصرہ نہیں کر سکتا کیونکہ اب تک نئے افق زیر مطالعہ ہے مجھے امید ہے کہ وہ کہانیاں بھی نئے افق کے معیار پر ہوں گی باقی تمام کے تمام سلسلے بھی اچھے اور معیار پر چل رہے ہیں۔ اگر غزلوں کے چند صفحات اور بڑھا لیے جائیں تو میرے خیال میں قارئین کے لیے بہت اچھا ہوگا کیونکہ بہت سے رائٹرز کی شکایتیں آ رہی ہیں کہ ایڈیٹر صاحب میری غزل کی باری کب آئے گی خیر آپ جانو آپ کا کام اس بار تو ہنستے مسکراتے دیجیے اجازت۔ اللہ نگہبان

عمر فاروق ارشد..... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ محترم مدیر جناب کیسے مزاج ہیں، سردیوں کی آمد نے تو ابھی سے نزلہ زکام ہمارے پلے باندھ دیا ہے۔ اس وقت بھی نہایت ڈھیلی ڈھالی طبیعت کے ساتھ تبصرے کا منہ کالا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ نومبر کا نئے افق توقع سے بہت پہلے ہاتھوں میں آ گیا۔ تمام تر ہنگاموں کے ساتھ شمارہ عمدہ رہا۔ دستک میں قریشی صاحب نے یہ انکشاف کر کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی کہ وہ خود بھی اس بار سانحہ منیٰ کے دوران وہاں موجود تھے۔ ہم اس ذات برکات کے انتہائی مشکور ہین کہ جس نے آپ کو محفوظ رکھا اور تمام شہدائے منیٰ کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہیں۔ گفتگو کی محفل میں داخل ہوئے تو نت نئے کارناموں کو اپنا منتظر پایا۔ مجید احمد جائی صاحب ارے ارے کیوں ہمیں گناہگار کرتے ہو یار، کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ خوش رہو، صائمہ نور میری پیاری بہنا بہاولپور سے تشریف لائیں، آپ تو ایک طرح سے میری ہمسائی ہیں پیاری بہنا، آپ کیوں دل چھوٹا کرتی ہو، ہم ہیں نا آپ کے بھائی، میں تو وہ شخص ہوں جسے بہن جیسی نعمت سے محروم رکھا گیا ہے۔ آج سے آپ میری بہنا ہوا اور میں آپ کا بھیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات آسان فرمائے بلاشبہ ماں باپ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ زندگی کے کسی موڑ پر اگر میری ضرورت پڑے تو آواز دے لینا، حافظہ لائبہ قریشی واہ بھئی واہ۔ میرے شہر سے اٹھ کر مجھ پر ہی بمباری شروع کر دی۔ کسی پرانے رکشے کے پھٹے سائلنسر کی مانند سارا غصہ ہم پر ہی اتار دیا۔ کچھ دھواں بچا کر بھی رکھ لیتیں۔ محترمہ آپ کو شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ ظہور احمد ایک جدوجہد کرتا ہوا نوجوان ہے اور میرا بہترین ساتھی ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ وہ مجھ سے لکھوا کر شائع کراتا ہے۔ ہاں البتہ اس

کی نگارشات کی اصلاح کا ذمہ میں نے لے رکھا ہے اور اصلاح کرنا یا کرانا کوئی جرم نہیں چاہیے آپ ادب کی کسی معتبر شخصیت سے فیصلہ کروالیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف ترجمہ شدہ کہانیوں کا تسلسل برقرار ہے۔ ابتدائی صفحات پر ناصر بیگ چغتائی صاحب نے خوب محنت کے ساتھ شاہکار تخلیق کیا۔ سلیم اختر کے ناول کا اختتام دیکھ کر دھچکا سا لگا۔ بالکل بھی امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی اینڈ ہوجائے گا میرے خیال میں یہ غلطی ہے۔ اس ناول کو لمبا چلنا چاہیے تھا۔ بہر حال قریشی صاحب مجھے ایک بات کی بڑی خوشی ہے آپ ڈھونڈ ڈھانڈ کر بڑے لکھاریوں کو نئے افق کی زینت بنا رہے ہیں۔ میرا اشارہ محترم ناصر ملک کی طرف ہے۔ میں ان کا بہت بڑا فین ہوں۔ آپ نے ان سے ناول شروع کرا کر ایک طرح سے ہم پر احسان کیا ہے۔ باقی مختصر کہانیاں تمام ہی اچھی تھیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اب آتے ہیں خوشبوئے سخن کی جانب۔ محترم مدیر صاحب یہ سلسلہ اس لیے ہے کہ اس میں ابھرتے ہوئے نئے شعرا اپنی نگارشات منظر عام پر لاسکیں نہ کہ وہی بڑے اور نامور شاعروں کا کلام انتخاب کے طور پر شائع کرنا شروع کردیا جائے۔ جو ساتھی انتخاب بھیجتے ہیں مجھے ان پر حیرت ہے بھئی اگر آپ خود نہیں لکھ سکتے مگر آپ کو اپنا نام شائع کرانے کا شوق بھی چڑھا ہوا ہے تو براہ کرم ذوق آگہی میں یہ شوق پورا کرلیں۔ میرا پرزور مطالبہ ہے کہ خوشبوئے سخن میں صرف قارئین کا اپنا کلام ہی شائع ہونا چاہیے۔ بہر حال مجموعی طور پر شمارہ بہترین تھا اللہ تعالیٰ مزید آسانیاں پیدا فرمائے، میرا کلام تھوک کے حساب سے آپ کے پاس محفوظ ہے۔ اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ اس کے علاوہ میرا مہینوں پرانا انعام بار ہا یاد دہانیوں اور مکمل ایڈریس کا مطالبہ پورا کرنے کے باوجود ابھی تک نہیں ملا آخر میں سید عبداللہ شاہد بھائی سے گزارش ہے کہ پلیز بھائی مجھ سے رابطہ کرو مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔ رابطے کے لیے میرا نمبر ہے۔ 0324-4204324 والسلام۔

☆ محترم بھائی آپ کا ایڈریس ملتے ہی آپ کو انعامی رقم ارسال کردی گئی ہے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! انتہائی غیر متوقع طور پر اس بار نئے افق 17 اکتوبر کو ہی مل گیا۔ سرورق اس بار بھی منفرد ہے محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نئی زندگی اور حج بیت اللہ مبارک ہو، واقعی ایسے حادثات بے صبری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ بڑھتے ہیں محفل کی طرف۔ محترم فلک شیر صاحب خط انعام یافتہ منتخب ہونے پر مبارک باد قبول کریں میری کہانی ''نیکی کا دیا'' پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ کا خط قابل تعریف ہے مجید احمد جائی بھائی آپ کی باتیں قابل غور اور سبق آموز ہیں آج کل ہر کام نمائش کے لیے کیا جاتا ہے ناک اونچی رکھنے کے لیے بے تحاشہ خرچ کیا جاتا ہے۔ لیکن غریب نادار اور مجبور پڑوسی کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا خدا بزرگ و برتر ہمیں عقل سلیم دے آمین۔ آپ نے لکھا کہ میں نے کہانی جلد ختم کردی بھائی تھانیدار کا کام مجرم کو پکڑ کر قانون کے حوالے کرنا ہوتا ہے آگے عدالت کا کام ہوتا ہے وکیلوں کی جرح ہوتی ہے ویسے تو تھانیدار اپنے تھانے کی حدود میں بادشاہ ہوتا ہے۔ لیکن اسے اثر ورسوخ والے مجرموں پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مخبروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ولی قندھاری بابا جی کے متعلق میری معلومات سنی سنائی باتوں تک محدود ہیں۔ ویسے بھی یہ صفحات ایسی معلومات کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ آپ اپنا ایڈریس دے دیں۔ جونہی کوئی مستند کتاب میرے ہاتھ لگی۔ میں اس سے معلومات حاصل کرکے آپ کو تفصیل سے لکھ دوں گا امید ہے آپ کہانیوں کے سلسلے میں اسی طرح میری رہنمائی کرتے رہیں گے۔ بہت شکریہ، صائمہ نور بہن خدائے بزرگ و برتر آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اب بندہ کس کس بات کا رونا روئے۔ یہاں صرف اپنے مطلب کے لیے قانون سازی ہوتی ہے عام بندے کے دکھوں کا مداوا کون کرتا ہے ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ میرا تبصرہ اور کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ عمر فاروق ارشد بھائی خدا آپ کو صحت دے اور آپ ہمیشہ

کی طرح تگڑے تبصرے کے ساتھ آئیں مہر پرویز دولو بھائی۔ میرا اندازہ سو فیصد صحیح نکلا یہ اندازہ میں نے آپ کی تحریر سے اخذ کیا تھا پیارے بھائی اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے اور آپ اس رسالے کو چھوڑنے کا فیصلہ واپس لیں میں التجا کرتا ہوں اگر آپ نے فیصلہ واپس نہ لیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ آپ نے اپنے بھائی کی بات نہیں مانی۔ نازیہ خانم یہ کیا بات ہوئی۔ پہلے خط کو آخری خط بنا دیا۔ میں آپ کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ خط لکھتی رہیے گا۔ ممتاز احمد بھائی آپ نے بھی خوب لکھا میری کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے میں لکھ رہا ہوں عبدالغفار عابد بھائی آپ کو میری کہانی سبق آموز لگی شکریہ ہے۔ میری محنت ضائع نہیں ہوئی اچھے لوگ ہر دور میں رہے ہیں جن کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے اب بات ہو جائے ابن مقبول جاوید احمد صدیقی بھائی سے بھائی سدا خوش رہو آپ کی حوصلہ افزائی میرے اندر لکھنے اور جینے کی آرزو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ میری کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ مہربانی نوازش۔ اب ذرا بات ہو جائے باقی سلسلوں کی ذوق آگہی میں فائزہ فاروق کراچی، ملک جواد نواز قریشی، جاوید احمد صدیقی، اشفاق شاہین اور انجم فاروق ساحلی کا انتخاب لاجواب ہے باقی انتخاب بھی قابل تعریف ہے۔ میں نئے افق کے تمام اسٹاف، عمران بھائی، مشتاق احمد قریشی، اقبال بھٹی وغیرہ کا انتہائی مشکور و ممنون ہوں کہ وہ میری کہانیاں شائع کرتے ہیں اور اس قدر میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ میں اس قرض کا بار اتار نہیں سکتا اب بات ہو جائے کہانیوں کی، امجد جاوید کی کہانی قلندر ذات کی موجودہ قسط بھی حسب معمول جاندار اور تیز رفتار ہے۔ سلیم اختر صاحب کی روپ بہروپ ختم ہو گئی۔ لیکن ہمارے ذہنوں پر انمٹ نقوش چھوڑ گئی بہت خوب، ایسی کہانیاں کبھی کبھی لکھی جا سکتی ہیں۔ اس نے پہلی قسط سے اپنے حصار میں رکھا۔ تاش کے پتے پڑھ کر احساس ہوا کہ جو کسی کا نہ ہوا۔ فن پاروں میں سزا جزا، زرد پتا، مکافات عمل، نمبر لے گئیں۔ باقی دونوں تحریریں بھی اچھی ہیں۔ بے نام چہرہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ناصر ملک کی کہانی نامعتبر پر تبصرہ اگلے ماہ۔ اب اجازت والسلام۔

محمد یاسر...... رحیم یار خان۔ جناب عمران صاحب اور مدیر اعلیٰ صاحب سلام قبول کریں۔ میں عرصہ دس سال سے نئے افق پڑھ رہا ہوں معیاری رسالہ ہے پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں وہ بھی آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ میرے بھائی رائٹر وقار الرحمان نے اس ماہ نومبر 2015 میں تاش کے پتے پہلے مئی 2015ء میں میں ابھی زندہ ہوں کے نام سے چھپوائی تھی۔ آپ مئی 2015ء کا رسالہ نئے افق دیکھ لیں وہی کہانی دوبارہ دہرائی گئی ہے۔ صرف نام کی تبدیلی ہے۔ پہلے انہوں نے غلام فرید ڈاکٹر کو ایڈ پر مارا اور اب سعید مٹھائی والے کو مار دیا۔ لگتا ہے اب اقبال عرف بابو (سوہن حلوے والے) کا نمبر ہے جو رحیم یار خان صادق بازار کی نکڑ پر سوہن حلوہ بیچتا ہے۔ کیا وقار صاحب کے پاس ایک ہی کہانی ہے جو بار بار چھپوائی جا رہی ہے غور کریں۔ باقی نومبر کا شمارہ ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ موت تو ہر جگہ دستک دے رہی ہے خواہ پاکستان ہو یا سعودی عرب بس دعا ہے کہ اللہ پاک سب کو بخش دے۔ فلک شیر ملک کو مبارک انعام ملنے پر (حافظ لائبہ قریشی صاحبہ) یہ عمر فاروق ارشد اور ظہور صائم والا معاملہ آپ نے بڑی تحقیق کر کے اٹھایا ہے (ویل ڈن)۔ اقرا پڑھ کر روحانی مسرت ہوئی اللہ نور ہے آسمانوں اور زمینوں کا کوئی شک نہیں۔ کہانیوں میں سب ہی اچھی تھیں۔ قلندر ذات ختم ہو رہی ہے تو امجد جاوید صاحب کو بتائیں کہ (ہتھ ہولا رکھیں) اسپیڈ کم ہی ٹھیک ہوتی ہے۔ فن پاروں کی تحریریں زبردست تھیں۔ ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن بہت اچھا انتخاب لیا گیا اقوال زریں بہت پیارے تھے۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت، والسلام۔

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان۔ جناب مشتاق قریشی صاحب، عمران احمد، اقبال بھٹی اور طاہر قریشی صاحب سلام عرض ہے۔ سب سے پہلے مشتاق صاحب کو حج کی مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ سعادت خوش

نصیبوں کو ہی نصیب ہوتی ہے جو افسوسناک واقع وہاں پیش آیا سن کر دل خون کے آنسو رویا۔ موت کا ایک دن متعین ہے اور پھر پاک مٹی پر شہید ہو کر وہ لوگ ابدی زندگی پا گئے۔ خدائے بزرگ و برتر ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔ بس غلطیاں کرنا تو انسانی فطرت میں شامل ہے اور پھر جلدی کرنا خاص کر ہمارے عوام بہت جلد باز واقع ہوئے ہیں جہاں بھی جائیں ہر بندے کی کوشش ہوتی ہے کہ میرا کام جلدی ہو جائے باقی جائیں کھڈے میں۔ عمران صاحب نے بہت قیمتی باتیں کیں جو اعمال اوپر جاتے ہیں تو جزا بھی اس کے مطابق ہی ہوگی نا۔ میرے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو انعام یافتہ لو لیٹر کا درجہ دیا گیا مشکور ہوں اور دوسری نوازش میرا افسانہ "زرد پتہ" فن پاروں میں شامل کر لیا گیا تھینکس۔ عمر فاروق ارشد صاحب بھولے بادشاہ تو آپ ہیں جناب جو انسان اس دنیا سے چلا جاتا ہے اس کی اچھائی بیان کی جاتی ہے ناں کہ برائی، مہر پرویز دولو صاحب آج کل راوی کی لہریں کیا کہہ رہی ہیں اور آپ کے تربوزوں کے دام بڑھے یا کم ہوئے؟ (از راہ مذاق) سیاست کو گولی مارو دوست جھوٹ کا دوسرا نام سیاست ہے۔ ریاض بٹ صاحب آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے اور کہانی (حفظ ما تقدم) بھی زبردست ہے دونوں لالچیوں کو آپ نے بڑی سمجھداری سے کیفر کردار تک پہنچا۔ حافظہ لائبہ قریشی صاحبہ آپ کی ذہانت کو سلام کہ آپ نے اتنی تحقیق کی۔ اقرا بہت خوب صورت انداز سے لکھتے ہیں طاہر صاحب اللہ کی واحدانیت پر بڑی جامع دلیلیں دی گئی ہیں۔ ناصر بیگ چغتائی نے انگریزی ناول کو اردو میں ترجمہ کر کے اچھی طرح پیش کیا ہے بعض حادثات ایسے انمٹ نقوش ذہن میں چھوڑ جاتے ہیں جو کبھی نہیں نکل پاتے اچھی تحریر تھی۔ (سرد ہوا) ناز سلوش ذشے نے خوب لکھی کلام پاک میں بڑی تاثیر ہے اشوک کیا اشوک کا باپ بھی ہوتا تو بھاگ جاتا۔ (قلندر ذات) کی شاید آخری اقساط ہیں امجد جاوید صاحب کچھ اور لکھنے والے ہیں دیکھتے ہیں آگے آگے ہوتا ہے کیا، راحیلہ تاج کی (پری گل) واقعی پری گل کی طرح حسین تحریر تھی۔ کمال کی منظر کشی کی گئی۔ مثلاً حویلی کی منظر کشی میں جملہ تھا "شان و شوکت لیے وہ حویلی مدہم مدہم آواز میں تالیاں بجاتے اخروٹ کے درختوں میں کسی معزز اور پر وقار عمر رسیدہ خاتون کی مانند دکھائی دیتی تھی" پھر ایک جگہ پری گل کی آنکھوں کو "اخروٹ رنگ آنکھیں کہا گیا" بہت خوب، پری گل کا کردار بہت اچھے طریقے سے واضح کیا گیا۔ روپ بہروپ گزارہ تھی۔ مگر اچھی کاوش کی گئی فن پاروں میں جاوید صدیقی کی (مکافات عمل) سبق آموز تحریر مختصر الکھی گئی مگر دلفریب انداز میں سمجھا دیا کہ صدقہ کرنے سے مال بڑھتا ہے اور بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ میرے (زرد پتہ) میں پرنٹنگ کی کچھ غلطیاں تھیں۔ فاطمہ زہرہ نے بھی کمال لکھا (سزا جزا) وہ ایک ضرب المثل ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ جو بوگے وہی کاٹو گے ناز یہ ثابت قدم رہ کر کامیاب ہو گئی۔ صداقت حسین نے (با اصول) لکھ کر لالچ بری بلا ہے کو سچ کر دکھایا۔ زعیم خان جتوئی کی یادیں ٹاپ پر رہیں بہت مختصر مگر ایسا پختہ انداز کہ حیران کر گیا۔ سندھ کے کلچر کو اجاگر کرتی ہوئی یہ میٹھی میٹھی اور شگفتہ تحریر نے مجھے بہت متاثر کیا بڑے پیارے انداز میں کاروکاری اور بدلہ لینے دینے میں قتل کے اس گھناؤنے جرم کو بے نقاب کیا گیا۔ اس تحریر کو رسالے کی جان کہنا بے جانہ ہوگا۔ ذوق آگہی میں بھی سکون دل کے لیے بہت کچھ تھا۔ اس حدیث پاک میں چھبیس ستائیس پوائنٹ بتائے گئے ہیں جس سے ہر انسان خواہ وہ بادشاہ ہے یا فقیر فائدہ اٹھا سکتا ہے دنیا اور آخرت سنوارنے کے اصول۔ بڑی حدیث ہے جو کنز العمال مسند احمد میں موجود ہے اور جو اس پر عمل کرے وہ دنیا و آخرت میں کامیاب ہے۔ ناز سلوش ذشے نے سفید و سیاہ میں جو واقعہ بیان کیا اس سے کالی رنگت والے خوش تو ضرور ہوں گے بہت اچھا اور سبق آموز واقعہ تھا۔ خوشبوئے سخن میں عظمیٰ طور، لاہور کا کلام تعریف کے قابل ہے آنکھوں سے آنسو نکل آئے نمبر ون شاعرہ عظمیٰ صاحبہ کا کلام بھی نمبر ون آخری تحفہ (نامعتبر)

ناصر ملک نے دیا۔ دل موہ لینے والی یہ کہانی پڑھ کر مزہ آیا دوسرے حصے کا بے چینی سے انتظار رہے گا اگر کسی صاحب کی دل شکنی ہوئی ہو تو معذرت چاہتا ہوں۔

علی حسنین تابش...... چشتیاں۔ محترم چیف ایڈیٹر، ایڈیٹر، تمام اسٹاف اور تمام قارئین نئے افق کو میرا اسلام۔ امید کامل ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ہر روز کی طرح وہ بھی اک ڈھلتی شام تھی، معمول کے مطابق اپنے کلینک سے گھر کو لوٹ رہا تھا کہ اک دوست کی کال آئی۔ حال احوال کے معلوم پڑا کہ میرے نہایت ہی محترم انکل جناب ''محمد سلیم اختر'' صاحب کا سلسلہ وار ناول ماہ نامہ نئے افق میں شائع ہو رہا ہے۔ دل خوشی سے جھومنے لگا اور بے خودی سے ہی قدم نیوز ایجنسی کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ایجنسی والے انکل جو کہ اک بڑا سا قفل ہاتھ میں تھامے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لمبے لمبے قدموں سے ان کو میں نے جا کر روک لیا اور کہا کہ جناب نئے افق کا تازہ شمارہ دیں وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہنے لگے واہ رے تابش اتنی بے چینی کبھی پہلے کسی پرچے کے لیے تمہارے چہرے پر سے عیاں نہ ہوئی تھی جلدی سے شمارہ ماہ نومبر لیا اور پہلے تین شماروں کے منگوانے کا آرڈر دے کر گھر کو لوٹ آیا۔ رات بھر میں شمارہ مکمل پڑھ لیا کیا خوب لکھتے ہیں سلیم انکل اللہ ان کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ کہانیاں سب اپنی مثال آپ تھیں۔ فن پارے میرا پسندیدہ سلسلہ بن گیا اور احوال میں حصہ لینے کے لیے آج قلم اٹھایا مگر افسوس کہ کاش تین ماہ پہلے مجھے معلوم ہوتا تو سلیم صاحب کا ناول مکمل پڑھ سکتا۔ خیر اگر سلیم صاحب یہ لیٹر پڑھ رہے ہیں تو براہ کرم مجھے اپنا مکمل ناول پڑھنے کا موقع فراہم کریں نوازش ہوگی۔ ایک ہی پرچے نے مجھے اپنا دیوانہ بنا ڈالا۔ خوشبوئے سخن کے لیے غزل اور نظم حاضر خدمت ہے امید ہے قبول فرمائیں گے اور شائع فرمائیں گے اگر اس بار لیٹر اور غزل شائع ہوئی تو ہر ماہ حاضری کو یقینی بنائے رکھوں گا۔ چیف ایڈیٹر صاحب اور شمارے کو خداوند کریم بے حد کامیابیاں عطا فرمائے، آمین۔ حرف آخر سب کو سلام، اللہ نگہبان۔

گل مھر...... کراچی۔ السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے نئے افق کی محفل گفتگو میں یہ میری پہلی انٹری ہے مگر میں نیو کمر نہیں ہوں پڑھنے لکھنے سے تعلق پرانا ہے میرا میں رائٹر ہوں ردا ڈائجسٹ کے لیے لکھ چکی ہوں میرا ناولٹ شائع ہو چکا ہے اس میں جہاں تک پڑھنے کا تعلق ہے تو ایک عشرہ بیت گیا مجھے نئے افق کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ یہ رسالہ باذوق لوگوں کی اولین پسند ہے۔ لوگ ترجیحی بنیادوں پر اسے حاصل کرتے ہیں ہمیں بھی جستجو ہوتی ہے کہ یہ ہمیں بروقت مل جائے اکتوبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے سب سے پہلے ٹائٹل دیکھا ڈائجسٹ کا نام اور ٹائٹل دونوں بالکل مختلف برائے مہربانی تبدیلی اچھی چیز ہے لیکن وہ جو آنکھوں کو بھلی لگے۔ ٹائٹل ایسے دیجیے جو ڈائجسٹ کے نام سے میچ کرتے ہوں اب کچھ ڈائجسٹ کی تحریروں کے بارے میں سب سے پہلے تو محترم مشتاق احمد قریشی کی دستک پر دھیان رہا آپ جناب برسوں سے اپنی دستک سے لوگوں کے ذہنوں کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں دیکھیے آپ کی دستک کب لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے ایک بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی ہم سب لوگ منہ بھر بھر کے امریکہ اور سیاستدانوں کو گالیاں دیتے ہیں امریکہ کا تو ہمیں معلوم ہے اسے ہمارے حکمرانوں نے ملک پر مسلط کر رکھا ہے لیکن ان سیاستدانوں کو کس نے عوام پر مسلط کر رکھا ہے اس کا جواب یقیناً یہ ہے کہ عوام نے۔ میں نے ایک حدیث پڑھی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جیسے عوام ہوں ایسے ہی حکمران ان پر مسلط کر دیے جاتے ہیں سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ تبدیلی کیسے اور کیونکر آئے گی کیا ان چہروں سے جنہیں لوگ چار چار دفعہ بھگت چکے ہیں پھر بھی نابینا بن کر ثبوت دیتے ہوئے ان ہی چہروں کو سیٹوں پر بٹھا دیتے ہیں۔ جنہوں نے ملک کو لوٹنے کھانے کے علاوہ کبھی کچھ کیا ہی نہیں کہاں ہے ہمارا

شعور؟ بات دراصل یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ روٹی بوٹی اور روو بٹی کی فکر میں مبتلا ہیں انہیں یہ فکر ہی نہیں کہ ملک دلدل میں دھنستا چلا جارہا ہے آج 18 کروڑ عوام ان چند سوسیاستدانوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں آخر ہم کب جاگیں گے جب پانی سر سے اونچا ہوجائے گا کیا 18 کروڑ عوام کا سیلابی ریلہ اس گند کو نہیں ہٹا سکتا۔ اپنے ملک کو تباہی سے بچانے کے لیے ہم سب کو مل کر اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اب کچھ کہانیوں کے بارے میں جو پڑھ چکی ہوں سب سے پہلے راجپوت اقبال صاحب کی خودروپڑھی یہ فکشن کہانی تھی جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں جوممکن نہیں اسے سپوز بھی کوئی کیسے کرے گا بہر حال کہانی دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے بھی اچھی لگی سلسلے وار کہانی قلندر ذات میری فیورٹ ہے ریاض بٹ صاحب کی نیکی کا دیا اچھی تھی مختصر فن پارے میں ساحل ابڑو کی ٹوٹا ہوا تارا اور نسیم سکینہ صدف کی روبرو متاثر کن تھیں اسرار احمد کی جوابی حملہ میں پہلے بھی پڑھ چکی ہوں محترمہ زریں قمر کی ضرب عضب بہت متاثر کن تھی انہوں نے اپنی تحریر کے ذریعے پاک فوج کی دلیرانہ کوششوں پر روشنی ڈالی ہے۔ میرے خیال میں سابق جنرل کی وجہ سے پاک فوج کا جو امیج مسخ ہوا تھا وہ موجودہ جنرل کی وجہ سے بہتر ہوگیا ہے ہماری فوج کو سلام جو ایک نہیں بلکہ کئی محاذوں پر پامردی اور مستقل مزاجی سے ڈٹی ہوئی ہے اور دشمن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے آخری صفحات پر مشتاق احمد قریشی کی دلی کے بانکے تھی۔ پڑھ کر مسکرانے پر مجبور ہوئے یہ تحریر سبق آموز بھی تھی اکثر خواتین پاس پڑوس کے چکر میں گھر اور گھر والوں سے غافل ہوجاتی ہیں خوشبوئے سخن میں محمد ذیشان ہاشمی کی انعام یافتہ غزل کے علاوہ نیر رضوی اور فریدہ خانم کی غزل اچھی لگیں۔ اپنی ایک تحریر ساحل تشنہ نئے افق کی نذر کر رہی ہوں دیکھ لیجیے گا۔ اسے امید ہے آپ کے معیار پر پوری اترے گی تحریر مختصر بھی ہے اور پراثر بھی ایک درخواست ہے آپ سے اس میں شاعر محمود غزنوی کی غزل شامل ہے اگر آپ میری تحریر شائع کریں تو برائے مہربانی پوری غزل بھی شائع کیجیے گا کیونکہ یہ غزل کہانی کے مرکزی کردار کی سابقہ اور حالیہ صورت حال سے ریلیٹڈ ہے۔ نئے افق کی کامیابی کے لیے دعاگو۔

بشیر احمد بھٹی ...... **بھاولپور** نومبر ۲۰۱۵ کا نئے افق سامنے ہے۔ میں کچھ عرصہ کے لیے نئے افق سے دور ہوکر رہ گیا تھا۔ اب پھر ہم دونوں دوست قریب ہوگئے ہیں۔ نئے افق میرے سامنے ہے اور میں نئے افق کے سامنے ہوں۔ ۲۰ اکتوبر کو شمارہ خریدا ہے اس میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی ہیں آج سے کئی سال پہلے نئے افق کی صحت بہت عمدہ تھی اندرونی، بیرونی طور پر نئے افق خوب صورت تھا پھر درمیان میں کچھ عرصہ تک اس کی صحت خراب رہی۔ یعنی صحت مندی اور اقبال مندی سے دور رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسرے شماروں کی وجہ سے یہ عدم توجہی کا شکار ہوگیا تھا۔ ادارے کے کارکنوں کی مصروفیت نے نئے افق کی صحت کو تہہ و بالا کرڈالا تھا۔ نہ اسکیچز تھے، نہ کوئی انعامی سلسلے۔ اس دوران کہانیوں کا سسپنس پھر بھی برقرار رہا اور ٹائٹل تو ہر ماہ ہر دور میں منفرد رہا اب جب میں واپس پلٹا کوئے جاناں کی جانب تو ڈھنگ ہی نرالے دکھے۔ اب پھر نئے افق کی رعنائیاں جوبن پر ہیں۔ انعامی سلسلے بھی جاری کردیے گئے ہیں۔ اندرونی صفحات میں تصویریں بھی موجود ہیں۔ ٹائٹل تو حسب ریت زبردست ہے۔ اب اگلے ماہ حجاب بھی میدان میں آرہا ہے نت نئے شمارے کا مارکیٹ میں آنا بھی ادب میں اضافہ ہے۔ ہر شمارے کو بنا سنوار کے قارئین کی تفریح کا بندوبست کرنا بھی نیکی ہے کیونکہ ان شماروں کے ذریعے قارئین احادیث مبارکہ اور قرآن پاک کا ترجمہ بھی پڑھ لیتے ہیں گو کہ ہمارے ملک کے بے شمار مسلمان مسجدوں کا رخ نہیں کرتے۔ دنیاوی کھیل کھال میں اس طرح مصروف ہیں کہ جیسے ہم نے مرنا ہی نہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے جو لوگ عبادت سے اور قرآن پاک کی تلاوت سے محروم ہیں ان ادبی شماروں میں لکھی گئی نور کی کرنوں سے ان کی

معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے ان جریدوں کے اسلامی صفحات بھی گویا تبلیغ کا ذریعہ ہیں مولوی صاحبان منبر پر بیٹھ کر جو تقریر کرتے ہیں وہ سامعین کے ایک کان میں داخل ہوتی ہے اور دوسرے کان سے پھر کر کے اڑ جاتی ہے۔ بعد جمعہ کے پھر تمام ویسے کے ویسے۔ جمعہ پڑھ کر پھر عصر، مغرب، عشا سے دور۔ جس طرح مذہب عیسائیت کے پیروکار ہفتے میں صرف اتوار کو چرچ جاتے ہیں اسی طرح ہمارے سست کاہل مسلمان بھی ہفتے میں صرف جمعہ کی نماز پڑھ کر پھر جمعہ کا انتظار کرتے ہیں۔ کئی تو ایسے ہیں جمعہ کی نماز بھی ادا نہیں کرتے اللہ پاک ہم سب کو پنجگانہ نماز ادا کرنے کی توفیق دے۔ اب آتا ہوں تبصرے کی طرف گفتگو میں محترم فلک شیر ملک صاحب کا انعام یافتہ تبصرہ خوب رہا ان کو انعام کی مبارک باد پیش کرتا ہوں ساتھ میں ان کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ موصوف میں لکھنے کی صلاحیت بھی ہے اور تحریر شناس ہیں جناب نے میری تحریر خوشخبری کو سراہا۔ فلک شیر صاحب آپ کا شکریہ اور وہ بھی بہت بہت۔ باقی ساتھیوں کے تبصرے بھی خوب رہے۔ طاہر قریشی صاحب کے صفحات اقرا میں اللہ پاک کی تعریف اور صفات کا خوب تذکرہ پڑھا لطف آیا بلاشک تمام تعریفیں اللہ جل شانہ کی ہیں جو ساری کائنات کا مالک ہے اور تمام کلی اختیار کا مالک بھی۔ بے نام چہرہ انگریزی ناول کی تلخیص، زبردست رہی۔ جس مکان میں ایک کم عمر لڑکی کے والدین کا قتل ہوا پھر اسے اسی مکان میں جا کر صورتحال کا جائزہ لینا پڑا سطر سطر سسپنس سے بھرپور رہی۔ پہلی کہانی کے بعد چھلانگ لگا کر آخری کہانی نامعتبر پر پہنچا کیونکہ پہلے اور آخری صفحات میں آپ جو بھی کہانی لگاتے ہیں ان کا انداز جداگانہ ہوتا ہے ناصر ملک صاحب نے نامعتبر کو سسپنس کی مالا میں پرو کر ایسا انداز اختیار کیا ہے نامعتبر کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ قلندر ذات نہیں پڑھی۔ چند قسطیں نہیں پڑھ سکا۔ پہلے وہ شمارے ڈھونڈ کر قلندر ذات پڑھ کر اس کی قسط پڑھوں گا۔ کوپن شوپن بھی انعامی سلسلوں کے ساتھ ضرور شائع کیا کریں تاکہ ہر سلسلے کے ساتھ قارئین کوپن تراش کے ہمراہ بھیجیں شکریہ اللہ حافظ اگلے ماہ تک کے لیے۔ نئے افق میں خط و کتابت کا پتا آپ نے آنچل پوسٹ بکس نمبر 75 شائع کر دیا ہے کیا پوسٹ بکس نمبر 874 منسوخ ہو چکا ہے، اس طرح تو ڈاک گڈمڈ ہو جائے گی۔ برائے مہربانی نئے افق کی خط و کتابت کو علیحدہ کریں تاکہ خطوط ضائع نہ ہوں، کیا خط ماہنامہ نئے افق کے دفتر کے ایڈریس پر بھی بھیجا جا سکتا ہے اس بارے میں ضرور جواب عنایت فرمائیں تاکہ تمام قارئین کے لیے آسانی رہے، شکریہ۔

☆ بشیر صاحب یاد آوری کا شکریہ، آپ خط دفتر کے پتے پر بھی ارسال کر سکتے ہیں، لیکن گفتگو اور دیگر سلسلوں کے لفافے الگ ہونا چاہیے تاکہ تمام ڈاک خلط ملط نہ ہو۔

ممتاز احمد ...... سرگودھا۔ محترم مشتاق احمد قریشی، عمران احمد، اقبال بھٹی، طاہر قریشی پیار اور خلوص بھرا اسلام قبول فرمائیں، ماہنامہ نئے افق اس بار بھی بروقت مل گیا۔ ٹائٹل پر پیلی آنکھوں والی حسینہ جلوہ گر تھی۔ دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے سانحہ منیٰ کے حوالے سے بہت ہی تلخ حقائق سے پردہ اٹھایا بلاشبہ جلد بازی ہی کے نتیجہ میں ایسے سانحے رونما ہوتے ہیں۔ قرآن پاک جو ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور حضور نبی کریم رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور اسوہ حسنہ سے ہمیں زندگی کے ہر موڑ ہر قدم پر صبر و تحمل، برداشت اور نظم و ضبط کا درس ملتا ہے اور فرض عبادات بھی ہمیں یہی درس اور پیغام دیتی ہیں مگر صد افسوس ہم لوگ انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر یہ درس بھول چکے ہیں اللہ رب العزت منیٰ میں شہید ہونے والے تمام حجاج کرام کے درجات بلند فرمائے اور ہم سب کو صبر، تحمل، برداشت اور نظم و ضبط کی پابندی کا دامن تھامنے کی توفیق نصیب فرمائے، آمین۔ گفتگو میں حدیث پاک اور اقرا کے مطالعے سے روح سیراب ہوئی جزاک اللہ۔

محترم فلک شیر ملک صاحب کرسی صدارت پر اپنے خوب صورت خیالات اور جامع تبصرے کے ساتھ رونق افروز تھے ملک صاحب دل کی اتھاہ گہرائیوں سے انعام کی مبارک باد قبول فرمائیں۔ بہت ہی پیارے دوست مجید احمد جائی صاحب آپ کے خوب صورت خیالات، جذبات اور احساسات بہت پسند آئے، پیاری بھتیجی صائمہ نور آپ نے جس خلوص سے دعائیں کی ہیں ان شاء اللہ رب کے حضور وہ ضرور قبولیت کے مرتبہ پر سرفراز ہوں گی۔ اللہ کریم اپنے پیارے حبیب نبی مکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پاک کے صدقے میں آپ کو اولاد جیسی رحمت اور نعمت سے نواز دے، آمین۔ آپ نے زندگی کی بائیس بہاریں نئے افق کے ساتھ گزاری ہیں تو یہ حیرانگی کی بات نہیں علم و ادب سے محبت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ قابل صد احترام ریاض بٹ صاحب اور ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب آپ نے میرا خط پسند فرمایا خوش آمدید کہا۔ انعام کی مبارکباد دی۔ بہت بہت شکریہ، آپ صاحبان کا حکم سر آنکھوں پر جی ان شاء اللہ ضرور ہر ماہ حاضر ہوا کریں گے۔ یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے کہ آپ جیسے نامور علم و ادب سے محبت کرنے والے بلند پایہ قلمکاروں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ چمنستان ادب میں نئے افق ایک قدآور سایہ دار شجر ہے جس کی چھاؤں تلے ہم سب بیٹھ کر اس کے ثمر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں وہیں پر آپ جیسے کہنہ مشق اور دیگر قلمکاروں سے لکھنا سیکھ رہے ہیں۔ دعا ہے اللہ کریم اس چمن کو ہمیشہ آباد رکھے اور اس کی خوشبو سے ہم سب کے دل و دماغ معطر رہیں، آمین۔ پیارے بھائی اور عزیز از جان دوست منشی عزیز مئے وعلیکم السلام آپ کی محبتوں، پیار اور خلوص کا پہلے ہی مجھ پر بہت قرض ہے میری درخواست پر آپ نے دستک کی محفل کو اپنے خوب صورت خط سے سجایا اپنے قیمتی خیالات سے رونق بخشی مجھے عزت دی میرا مان بڑھایا مجھ پر آپ کی محبت کا قرض اور بڑھ گیا ہے۔ اس بار برادرم عامر زمان عامر، محترم اشفاق شاہین، محترم ارشد وفا فرام گوجرانوالہ اور ساحل ابڑو، سلیم اختر صاحب محفل سے کیوں غیر حاضر ہیں، پلیز اپنی غیر حاضری کی وجوہات اور وضاحت کے ساتھ محفل میں اپنی شرکت کو یقینی بنائیں کیونکہ آپ سب کے بنا محفل پھیکی اور ادھوری ہے۔ میں ایک چھوٹی سی گزارش کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ خطوط درحقیقت نامہ محبت ہوتے ہیں دوستوں سے رابطہ کا ذریعہ ہیں نہ کہ کوئی علمی دریافت یا علم کے میدان میں بھونچال لانے کا ذریعہ ہیں اور نہ ہی خطوط میں کالم نگاری اور اداریہ لکھنے کا جواز ہے یہ ادبی دوستوں کے ساتھ تعلق اور ان کی تحریروں جو کہ کہانیوں کی صورت میں ہوتی ہیں کے بارے میں پسند یا مثبت تنقید کے اظہار کا ذریعہ ہیں اگر کسی دوست کے خط پر انعام دیا جاتا ہے تو یہ ادارے کی اور ایڈیٹر کی پالیسی ہے ان کا طریقہ کار ہے تو خوامخواہ حسد اور جلن کی بدبو سے محفل کے ماحول کو پراگندہ نہیں کرنا چاہیے باقی قارئین کرام کی اکثریت ڈائجسٹ صرف کہانیاں پڑھنے کے لیے خریدتی ہے۔ لہٰذا آسان اور سہل الفاظ پر اچھی تخلیقات کہانیوں کی صورت میں لکھنے کی کوشش کرنی چاہیے مجھے امید ہے کہ مجھ ناچیز کے اس پیغام سے تمام ادبی دوست اتفاق کریں گے۔ سب دوستوں کا بے حد شکریہ جنھوں نے مجھے مبارکباد دی اب بات ہو جائے ماہ نومبر میں شائع ہونے والی کہانیوں کی تو سب سے پہلے ریاض بٹ صاحب کی کہانی ”حفظ ماتقدم“ پڑھی بہت عمدہ کہانی تھی واقعی یہ حقیقت ہے کہ انسان جو سوچتا ہے مگر بسا اوقات ہوتا کچھ اور ہے۔ سرفراز خان نے اپنی بیٹی کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے جو اسکیم بنائی وہ الٹ گئی اور دو جانیں موت کی دہلیز پار کر گئیں۔ ناز سلوش ذشے کی کہانی بعنوان ”سرد ہوا“ ایک خوب صورت اور متاثر کن تحریر تھی مرزا ناصر بیگ چغتائی کی ”بے نام چہرہ“ نے ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف اچھے اینکر پرسن ہیں بلکہ بہت اچھے لکھاری بھی ہیں انہوں نے بہترین ترجمہ قارئین کو پڑھنے کے لیے دیا بہت پسند آیا۔ راحیلہ تاج کی ”پری گل“ اچھی تخلیق تھی۔ محترم سلیم اختر کی روپ بہروپ خوب

صورت انجام کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی کہانی نے ثابت کردیا کہ محمد سلیم اختر صاحب کی گرفت قلم پر مضبوط ہے وقار الرحمان کی تحریر تاش کے پتے، بہت اچھی کاوش تھی تاش کے منحوس پتوں نے سعید کی جان لے لی کسی نے سچ کہا ہے کہ جو اکس کا نہ ہوا فن پارے میں شامل تمام تحریریں دل کو چھو گئیں تمام قلمکاروں نے بہت خوب اور عمدہ لکھا بالخصوص جاوید احمد صدیقی کی مکافات عمل پڑھ کر دل خوش ہوگیا یہ سچ اور حقیقت ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کے لیے اللہ کے دیے ہوئے مال کو مخلوق خدا اور خاص طور پر یتیموں پر خرچ کرنا بہت ہی افضل عبادت ہے کہانی نے زبردست اور پراثر پیغام دیا۔ ذوق آگہی میں سب نے بہت خوب لکھا۔ فائزہ فاروق کو مبارکباد، فلک شیر ملک، اشفاق شاہین، انجم فاروق ساحلی، نبیلہ ملک، مختار احمد اور شجاع جعفری کے انتخاب لاجواب تھے۔ خوشبوئے سخن میں بلال اسعد کو انعام یافتہ کلام پر مبارکباد۔ باقی سب دوستوں کا کلام بھی اچھا تھا پسند آیا۔ ناصر ملک کی تحریر "نامعتبر" بہت پسند آئی۔ اب اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ حسب وعدہ ایک عدد کہانی خط کے ساتھ ارسال کررہا ہوں اگر آپ کو پسند آئی معیار پر پوری اتری تو شائع کرکے شکریہ کا موقع دیجیے گا۔ یہ ایک سچی کہانی ہے ان شاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر روح کا جسم سے ناتہ جڑا رہا تو۔ اللہ نگہبان۔

منشی محمد عزیز مٹے ...... وھاڑی۔ جناب مشتاق احمد قریشی، عمران احمد و اقبال بھٹی صاحبان، سلام محبت قبول ہو، 18 اکتوبر کو مجید احمد جائی کا ایس ایم ایس موصول ہوا لکھا تھا "نئے افق میں آپ کا خط بہت زبردست ہے۔" میں نے جواباً پوچھا۔ "نومبر کا شمارہ آگیا ہے؟" تو جائی صاحب کا جواب اثبات میں تھا۔ میں نے فوراً حاصل پور والے کا نمبر ڈائل کرکے نئے افق کے تازہ ترین شمارے کے بارے میں استفسار کیا تو اس کا جواب بھی مثبت تھا پھر کیا تھا میں نے بائیک ایک دوست کے حوالے کی اور خود پنجابی محاورے کے مطابق بس کی پشت پر سوار ہوگیا (حقیقت میں سفر ہائی ایس کے اندر بیٹھ کر کیا تھا) خیر جناب تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد میں حاصل پور بک اسٹال سے رسالہ خرید چکا تھا لیکن جناب ایک اور پنجابی محاورے کے مطابق ڈاڑھی سے مونچھیں بڑھ گئیں۔ اس کا آپ کو ترجمہ اردو میں کرکے بتادوں ورنہ آپ کو الجھن بھی ہوسکتی ہے یہ محاورہ تب بولا جاتا ہے جب اصل کام سے زیادہ مہنگا ضمنی کام پڑجائے۔ مزید وضاحت کردوں کہ نئے افق کا شمارہ تو پچاس روپے میں ملتا ہے لیکن کرایہ کی مد میں ساٹھ روپے خرچ ہوجاتا ہے اور یوں نئے افق کا ایک شمارہ مجھے کم از کم ایک سو دس روپے میں پڑتا ہے اور اس سے بچنے کا آسان اور سستا ترین طریقہ تو میں بھی جانتا ہوں یعنی سالانہ خریدار بننا لیکن سچ بتاؤں کہ اس بار کپاس کی فصل نے بہت نقصان پہنچایا ہے اور میں ابھی تک الجھن میں ہوں کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں، خیر جناب اب ہم چھوڑنے والوں میں سے تو ہیں نہیں اب اگر تعلق جڑا ہے تو ان شاء اللہ ٹوٹنے نہیں پائے گا بشرطیکہ آپ کی محبت شامل احوال رہی تو۔ موجودہ شمارے کا سرورق بڑا منفرد سا تھا ایک طرف چاند کے گرد غالباً چکور ہے تو سرورق والی خاتون بھی دیکھنے کی چیز ہیں۔ خصوصاً بلی کی سی سبز آنکھیں بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ سبز آنکھوں والے لوگ "بے وفا" ہوتے ہیں لیکن ہمیں کیا لینا دینا ہے ان محترمہ سے خوش رہیں اپنے خرچے پر۔ اشتہارات سے پہلوتہی کرتے ہوئے سب سے پہلے تو گفتگو کے صفحات پلٹے اور دل پہ ہاتھ رکھ کر دھڑکنوں کو قابو میں رکھتے ہوئے اپنا خط تلاش کیا۔ بہت شکریہ، آپ سب کی محبتوں کا مقروض ہوگیا ہوں، کوشش کروں گا کہ آپ کا یہ قرض چکا سکوں، چلیے جی اب اطمینان سے رسالے پر بات کرتے ہیں۔ سب سے پہلے جناب مشتاق احمد قریشی کی دستک پڑھی۔ واقعی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی دولت کے بل بوتے پر جج پر بھی محض پکنک کی طرح جاتے ہیں اور پھر گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ گفتگو کے آغاز میں آپ کی باتیں بھی بہت خوب صورت اور قابل

عمل ہوتی ہیں۔ پہلا اور انعام یافتہ خط جناب فلک شیر ملک کا تھا مبارک باد جناب مجید احمد جائی کا خط بھی تبصرے سے بھرپور تھا۔ صائمہ نور، جی دل چھوٹا نہ کریں اللہ آپ کو ڈھیروں خوشیاں عطا کرے گا۔ عمر فاروق ارشد کا خط بھی معلوماتی تھا ہیں جی، یہ اپنے مہر صاحب یعنی مہر پرویز احمد دولو صاحب بڑے غصے میں لگ رہے ہیں اللہ خیر کرے، مہر صاحب اور کچھ نہیں تو اپنی صحت کا خیال کرتے ہوئے غصے کو پی جایا کریں۔ پہلے ہی میری طرح دبلے پتلے سے ہیں مزید غصہ کر کے یوں اپنا خون نہ جلایا کریں چلو اب مٹی پاؤ، پرانی باتوں پر نازیہ خانم کا خط تو ساحل ابڑو کے نام تھا ساحل جی نازیہ کی باتوں پر دل کی گہرائیوں سے غور کرنا۔ عبدالغفار عابد اور جاوید احمد صدیقی کے خطوط بھی بہترین تھے۔ اقرا میں کائنات اور اس سے متعلق نظام پر بھرپور تفسیر بیان کی جناب طاہر قریشی نے۔ ناصر بیگ چغتائی کی تحریر بے نام چہرہ کا انجام افسردہ کر گیا۔ ناز سلوش ذشے (ویسے اس لفظ کا مطلب کیا ہے) کی تحریر سرد ہوا ایک چالاک جن کے ایک آدم زادی سے نام نہاد محبت سے متعلق تھی جو کہ بالآخر اپنے انجام سے دوچار ہوا، ریاض بٹ صاحب حفظ ما تقدم کے عنوان سے ایک تھانیدار کی آپ بیتی کے ساتھ تھے جس نے بالآخر قاتل کو گرفتار کر ہی لیا۔ راحیلہ تاج کی پری گل بہت ہی خوب صورت اور سبق آموز تحریر تھی۔ پری گل کا دامن بھی صاف رہا اور اس کے مجرم اپنے انجام کو پہنچ گئے خس کم جہاں پاک، تاش کے پتے بھی اداس کر گئی۔ نکما کے آخر میں پنڈت جی کا جواب پڑھ کر ہنسی نکل گئی۔ خوشبوئے سخن میں زبیر قیصر کی غزل اور ناز ذشے کی نظم پسند آئیں۔ والسلام

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ "گفتگو" کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

اللہ

قرآن بتاتا ہے کہ اللہ کا قیام کہاں ہے؟

اسلام کا نظریہ توحید ایسا عقیدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں ہر قسم کے انسانی تصورات کا راستہ روکتا ہے' ان کا قلع قمع کر دیتا ہے اور یہ عقیدہ توحید اللہ کے افعال کی کیفیات کے تجسس کی بھی نفی کرتا ہے کیونکہ انسانی تصوّر اللہ کی کسی بھی طرح کوئی تصویر نہیں کھینچ سکتا' انسانی تصوّر اور عقل وادراک وہی تصوّراتی خاکے اللہ کی ذات پر چسپاں کرے گا جو وہ اپنے ماحول سے اخذ کرے گا اور ان میں اُن اشکال کا دخل ہوگا' جو انسان دیکھتا ہے کہ اللہ کی ذاتِ الٰہی ایسی ہے۔ جیسا کہ ہندو مذہب میں یا دیگر بت پرستی کے مذاہب میں ہوا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عظیم کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جس کا ادراک و تصوّر انسانی ذہن کسی شکل وصورت میں کر سکے یعنی ذاتِ الٰہی کا تصور انسانی دائرہ تصویر کشی سے قطعی باہر ہے اور اللہ کے تمام افعال کی کیفیات بھی دائرہ عقل سے باہر ہیں۔

چنانچہ ایسے تمام سوالات' سوچ وفکر کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات زمین وآسمان کو کس طرح پیدا کیا؟ اور پھر عرش پر کیسے تشریف فرما ہوا؟ اور وہ عرش کیسا ہے' جس پر رب ذوالجلال متمکن ہوا؟ یہ تمام سوالات اسلامی تصورات وعقائد کے اصولوں کے خلاف ہیں۔ انسان کی معلومات اور علم کے لیے جتنا کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مبارک قرآنِ حکیم میں بتایا اور سمجھایا ہے بس وہی کافی وشافی ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے بڑا حکیم ودانا کوئی نہیں' اس ذاتِ باری نے جتنا بتانا مناسب سمجھا' بہتر جانا بتا دیا ہے' سمجھا دیا ہے اور ایمان کا تقاضہ تو یہ ہے کہ بلا حیل وحجت بلا تردد' کے اللہ کی آیات پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پہ آیات پر بالکل ویسے ہی عمل کیا جائے' یقین کیا جائے جیسا کہ ان کے بارے میں ہدایت کی گئی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیاتِ قرآنی پر تدبر' غور وفکر اور عمل کا حکم دیا ہے لیکن اس کے لئے بھی اللہ نے حدود مقرر فرما دی ہیں' اس سے باہر نہیں جایا جا سکتا۔ قرآنِ حکیم اہلِ ایمان کو اطلاع دے رہا ہے کہ اللہ کا قیام عرش عظیم پر ہے' ساتھ ہی یہ بھی بتا رہا ہے کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ بظاہر یہ دو مختلف باتیں ہیں لیکن حقیقت یہی ہے اس پر اہلِ ایمان کا ایمان ویقین ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو جو شرف وامتیاز عطا فرمایا ہے اسے خلیفہ فی الارض کے عظیم ترین منصب پر فائز کیا ہے اور تمام انسانوں میں ممتاز ترین اور اللہ کی محبوب ترین شخصیت نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ مبارک ہے۔ اللہ نے اپنے محبوب ترین اور ممتاز ترین بندے نبی کریم ﷺ کے واقعہ معراج کے ذریعے تمام انسانیت کے لیے بہت سے ایسے رازوں سے پردہ اٹھا دیا جو انسانی فہم سے ماورا تھے۔ بلکہ اپنی ذاتِ عالی

پر پڑے پردے بھی کسی حد تک سرکا دیئے اور پوری انسانیت کی ممتاز ترین اشرف ترین شخصیت کی شہادت کا اہتمام بھی فرما دیا کیونکہ یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ اپنے بندوں سے جن سے وہ اپنی تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ محبت وشفقت فرماتا ہے ان کی ہی سطح پر آ کر بات کرتا ہے۔ ان کو ان کے ہی لہجے و انداز میں سمجھاتا ہے تاکہ انہیں احکام الٰہی ہدایاتِ الٰہی کو سمجھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول کریم ﷺ کو واقعہ معراج کے ذریعے ان مقامات و واقعات کا نظارہ کرا دیا جو ذاتِ الٰہی کے پردے میں پوشیدہ تھے ہیں اور رہیں گے۔ یہ صرف اللہ کا کرم و احسان ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ایمان پر جم جانے قائم ہو جانے کے لیے ان کے تجسس کو دور کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ کے واقعہ معراج کے ذریعے اس کی تکمیل فرمائی۔ جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل مین خود ربِ کائنات ارشاد فرما رہا ہے۔

ترجمہ: پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک لے گیا جس کے اردگرد کو ہم نے برکت دے رکھی ہے اس لیے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ (بنی اسرائیل۔ 1)

معراج نبی کریم ﷺ کے دو حصے ہیں جو قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ پہلا حصہ اسرا کہلاتا ہے۔ جس کا ذکر آیت طیبہ میں کیا گیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کے نام ہے۔ مسجد اقصیٰ پہنچ کر آپ ﷺ نے تمام انبیاء کی امامت فرمائی۔ اس طرح آپ ﷺ کو امام الانبیاء کے جلیل القدر منصب پر فائز کیا گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو آسمانوں پر لے جایا گیا۔ یہ سفر معراج کا دوسرا حصہ ہے جس کو معراج کہا گیا ہے۔ معراج سیڑھی کو کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا حصہ بنایا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا۔ "مجھے آسمان پر لے جایا گیا یا چڑھایا گیا۔" اس دوسرے حصہ سفر کا ذکر قرآن حکیم میں سورۃ نجم میں کیا گیا ہے۔ ابتدائی بارہ آیات میں جبرائیل علیہ السلام کا نبی کریم ﷺ کی ملاقات کا اور پیغام الٰہی پہنچانے کا اور انہیں دیکھنے کا ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۳ میں جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ اس طرح ہے۔

ترجمہ: اسے تو ایک مرتبہ اور بھی دیکھا تھا۔ سدرۃ المنتہٰی کے پاس۔ اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے۔ جب کہ سدرہ کو چھپائے لیتی تھی وہ چیز جو اس پر چھا رہی تھی۔ نہ تو نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی۔ یقیناً اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دیکھ لیں۔ (النجم۔ ۱۳ تا ۱۸)

آیاتِ مبارکہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھا کہ ان کے چھ سو پر تھے۔ ان کا ایک پر مشرق و مغرب کے درمیان جتنے فاصلے کا تھا۔



اغوا
برائے تاوان

زرین قمر

یہ کہانی امریکی صدر John cormads کے بیٹے Sinan cormeck کے اغوا کی داستان ہے جیسے اس کی موسم گرما کی تعطیلات کے دوران برطانیہ سے اغوا کیا گیا اور حس بے جا میں رکھنے کے بعد ایک بھاری رقم کے عوض آزاد کیا گیا لیکن وہ اپنے والدین سے نہ مل سکا۔



آکسفورڈ یونیورسٹی میں ۱۹۸۹ء اکتوبر کے نئے ٹرم کا آغاز تھا جسے آٹھ ہفتوں میں بانٹا جاتا تھا۔ ابھی اکتوبر میں پہلا ہفتہ شروع ہوا تھا تعلیمی سال ختم ہونے پر غیر تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز ہوتا تھا خاص طور سے کھیل، ڈرامے اور کشتی رانی کے مقابلے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ تقریری مقابلے بھی رکھے جاتے تھے اور نئے تعلیمی سال کے شروع ہونے پر طالب علموں کی تعداد کچھ کم ہی ہوتی تھی۔ زیادہ تر اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے آغاز کی تیاریوں میں مصروف ہوتے تھے یا پھر کھیلوں کے مقابلوں میں شرکت کی ٹریننگ کر رہے ہوتے تھے۔ اس عرصے کو ''ناٹ ویک'' کہا جاتا تھا۔

۲ اکتوبر کو ناٹ ویک کا پہلا دن تھا اور وسٹنس کلب میں نئے طالب علموں کی گہما گہمی دیکھنے میں آرہی تھی۔ ان میں کچھ انڈر گریجویٹ اتھلیٹس بھی شامل تھے۔ ان کے درمیان ایک لمبا دبلا پتلا طالب علم بھی موجود تھا' جسے سائمن کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک سالہ کورس کے لیے داخلہ لیا تھا اور وہ اپنے تعلیمی سال کا تیسرا اور آخری ٹرم پورا کر رہا تھا۔

''ہیلو سائمن تم جلدی واپس آگئے۔'' اسے عقب سے کسی نے خوشگوار انداز میں مخاطب کیا۔ یہ ایئر کموڈور برسر کی آواز تھی' جو اس اتھلیٹ کلب کا سینئر ٹریجرار تھا۔

''لیس سر۔'' سائمن نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں چڑھ جانے والا موٹاپا دور کرنے کی تیاریاں کر رہے ہو؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور سائمن اس کی بات پر مسکرا دیا۔

''گڈ مین۔'' اس نے سائمن کے نادیدہ پیٹ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''لندن میں ہونے والے کھیلوں کے مقابلوں میں تم ہمارے جیتنے کی آخری امید ہو۔''

''جی میں جلد ہی صبح کی جوگنگ اسٹارٹ کر رہا ہوں جناب تاکہ دوبارہ شیپ میں آجاؤں۔'' سائمن نے جواب دیا۔

اور اس نے واقعی اگلے روز سے علی الصباح دوڑنے کی مشق شروع کر دی تھی۔ اس نے پانچ میل کی دوڑ سے اسٹارٹ کیا تھا اور اس کا ارادہ ہفتے کے اختتام تک اسے بارہ میل تک کرنا تھا۔

بدھ ۹ اکتوبر کو اس نے معمول کے مطابق شمالی آکسفورڈ کے سمرٹاؤن میں واقع اپنے گھر سے اپنی سائیکل نکالی جو وڈ اسٹاک روڈ پر واقع تھا اور ٹاؤن سینٹر کی طرف روانہ ہو گیا وہ مرٹائرز میموریل اور سینٹ میری چرچ سے ہوتا ہوا بائیں طرف براڈ اسٹریٹ پر مڑ گیا اور اپنے کالج بالی اول کے گیٹ کے سامنے گزرتا ہوا ہائی اسٹریٹ پر آگیا پھر تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ میگڈیلن کالج کی حدود سے باہر آگیا تھا۔ وہاں وہ سائیکل سے اترا کالج کی باؤنڈری کے ساتھ اپنی سائیکل کھڑی کی اور دوڑنا شروع کر دیا۔

دوڑتے ہوئے اس نے میگڈیلن برج پار کیا اور مشرق کی سمت دوڑنا شروع کر دیا اس وقت صبح کے چھ بجے تھے جلد ہی سورج اس کے سر پر آنے والا تھا اور ابھی اسے چار میل تک مزید دوڑنا تھا۔ اس نے آکسفورڈ کے مضافاتی علاقے کارنگ روڈ کراس کیا اس وقت اس کے اردگرد اور کوئی شخص موجود نہیں تھا روڈ کی اونچائی والے حصے پر چڑھتے ہوئے اسے اپنی کمر میں درد محسوس ہوا آگے جا کر روڈ ختم ہو گیا اور ایک پگڈنڈی شروع ہو گئی جس کے دونوں طرف گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ رات ہونے والی بارش کا پانی کہیں کہیں جمع تھا جو اس کے پیروں کے نیچے آ کر

اسے خوشگوار احساس دے رہا تھا۔
سائمن کے پیچھے پہاڑی درختوں کی اوٹ سے ایک سیڈان نمودار ہوئی اور پگڈنڈی کے اونچے نیچے راستے پر جھومتی ہوئی آگے بڑھنے لگی راستہ جتنا آگے جا رہا تھا تنگ ہوتا جا رہا تھا آگے راستے کے درمیان میں ایک گھنا درخت بھی موجود تھا۔ ٹھیک درخت کے قریب سبز رنگ کی ایک فورڈ کھڑی تھی' جس پر Barlows Orchard کا لوگو بنا ہوا تھا اس میں کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں تھی۔ اکتوبر کے شروع میں بارلو کی یہ وینز سارے علاقے میں دیکھی جا سکتی تھیں' جو آکسفورڈ سائیر کے میٹھے سیب مختلف علاقوں میں سپلائی کرتی تھیں۔ اگر کوئی وین کی پشت سے دیکھتا تو اسے سامنے سے آنے والی کار میں بیٹھے لوگ نظر نہیں آتے' وین میں سیبوں کے کریٹ رکھے تھے۔

وین کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ یہ سامنے کا پہیہ تھا اور ایک شخص بیٹھا اسے سنبھال رہا تھا۔ اس نے وہیل کو جیک لگا کر اونچ کیا ہوا تھا۔ سائمن اس کے قریب سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔

جیسے ہی وہ وین کے قریب سے گزرا وین کا پچھلا دروازہ کھول کر دو آدمی باہر آ گئے' جنہوں نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا اور ان کے چہروں پر ماسک تھے انہوں نے تیزی سے دوڑ کر سائمن کو نیچے گرا دیا۔ وہیل درست کرنے والا شخص اٹھا' اس نے ہیٹ پہنا ہوا تھا لیکن اس کے چہرے پر بھی ماسک تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک سب مشین گن تھی اس نے بغیر دیر لگائے سامنے سے آتی ہوئی سیڈان پر فائر کھول دیا جو تقریباً ساٹھ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ کار سے بھی فائر کیے گئے' جو اس شخص کو لگے جس نے سیڈان پر فائر کیا تھا وہ زمین پر گر گیا اور سیڈان رک گئی۔

کار کی پچھلی سیٹ سے ایک شخص باہر نکلا اس نے زمین پر دو قلابازیاں کھائیں اور فائر پوزیشن میں آتے آتے اپنی نائن ایم ایم سے دو فائر کر دیے وین کی طرف سے بھی جواب دیا جا رہا تھا۔

کار سے نکلنے والا دوسرا شخص بھی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ اس عرصے میں وین سے دو افراد نکلے' انہوں نے سائمن کو اٹھا کر زبردستی وین میں ڈالا اور وین کا جیک نکال کر اس میں سوار ہو گئے پھر وین تیزی سے پیچھے مڑی تھی اور وہ نچلے فارم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

کار کے قریب پڑا زخمی سیکرٹ ایجنٹ آہستہ آہستہ کھسک کر کار کی ڈرائیونگ سیٹ تک آیا اور ہاتھ بڑھا کر مائیکرو فون اٹھایا۔ اس نے کوئی کال سائن یا کوڈ ورڈ بولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"مدد...... ہمیں مدد چاہیے...... کسی نے ابھی سائمن کارمک کو اغوا کر لیا ہے۔" اس نے کہا اور مائیکرو فون اس کے ہاتھ سے گر گیا وہ خود بھی زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا ٹھیک پانچ منٹ بعد مدد پہنچ گئی تھی۔

مرتے ہوئے سیکرٹ ایجنٹ کی کال کے ختم ہوتے ہی بہت سی چیزیں وقوع پذیر ہوئی تھیں اور بہت تیزی سے ہوئی تھیں۔

امریکی صدر کے اکلوتے بیٹے سائمن کارمک کا اغوا صبح 7:05 بجے ہوا تھا ریڈیو کال 7:07 پر ہوئی اور یہ کال تین جگہوں پر سنی گئی پہلی جگہ وڈ اسٹاک روڈ پر وہ کرائے کا گھر جو سائمن کی رہائش کے لیے لیا گیا تھا' جہاں سائمن کے لیے رکھے جانے والے دس سیکرٹ ایجنٹ موجود تھے' جن کی تعداد سائمن کے اعتراض کے بعد کم کی گئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پچاس سیکرٹ ایجنٹ کی حفاظت میں وہ مضحکہ خیز لگے گا اور ایک عام آدمی کی طرح اس کا آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کرنا مشکل ہوگا۔ امریکن سفارت خانے نے لندن میں اس کے لیے یہ گھر کرائے پر لیا تھا اور اس

کے لیے مہینوں برطانیہ کے ذمہ دار افراد رابطے میں رہے تھے پھر انہوں نے برطانوی افسران سے مشورے کے بعد تین قابل بھروسہ افراد کو سائمن کے لیے ملازم رکھا تھا۔ جن میں ایک مالی تھا ایک باورچی اور ایک عورت جو صفائی ستھرائی کے لیے رکھی گئی تھی۔

یہ تینوں برطانوی تھے اور یہ سب انتظامات اس لیے کیے گئے تھے کہ سائمن اپنی تعلیمی زندگی کو بھرپور طریقے سے گزار سکے حفاظتی ٹیم کے آٹھ افراد ہر وقت ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ ڈیوٹی مین نے اس ٹیم کے چار حصے بنا دیے تھے اور ان کی تین شفٹیں تھیں جو چوبیس گھنٹے گھر پر اپنی ڈیوٹی انجام دے رہی تھیں اور دو آدمی ہر وقت سائمن کے ساتھ سائے کی طرح رہتے تھے جب بھی وہ گھر سے باہر جاتا تھا۔

جیسے ہی اس گھر میں کال سنی گئی' ٹیم کے باقی ساتھی بھی دو کاروں میں بیٹھ کر موقع پر پہنچ گئے۔ سائمن اپنی صبح کی دوڑ کے لیے جو راستہ استعمال کرتا تھا' اس کے بارے میں سب جانتے تھے۔

کار کی کی جانے والی کال دوسری جگہ امریکی سفارت خانے میں سنی گئی' جو لندن میں واقع تھا جہاں سے فوراً ایک کال ایف بی آئی کے ڈائریکٹر ڈونلڈ ایڈمنڈ کو کی گئی اور تیسری کال حادثے کے قریب کھڑی ایک پولیس کار میں سنی گئی' جس کے ڈرائیور نے فوراً برطانیہ پولیس کے ذمہ دار افسر تک یہ خبر پہنچا دی' ان تین مقامات پر اس کال کا سنا جانا تھا کہ برطانیہ اور امریکا کے حساس ادارے حرکت میں آ گئے اور کچھ ہی منٹوں میں جائے حادثہ سے تحقیقات کا آغاز ہو گیا۔

جس سڑک پر حادثہ ہوا تھا اسے دونوں اطراف سے بند کر دیا گیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق جس وین سے فائرنگ کی گئی اسے سڑک کے کسی بھی سرے سے باہر نکلتے نہیں دیکھا گیا تھا۔

''ہم نہیں جانتے کہ پولیس کار سے ہونے والی کال اور سائمن کے اغوا کے درمیان کتنا وقت لگا لیکن اگر وقفہ کم ہے اور پولیس کار ہیڈنگٹن روڈ پر تھی اور انہوں نے کسی کو گزرتے بھی نہیں دیکھا تو اغوا کرنے والے لوگ وین سمیت علاقے میں موجود ہونا چاہیے۔'' ہیڈ پولیس آفیسر نے کہا۔

لیکن علاقے میں تفتیش کرنا اتنا آسان نہ تھا کیونکہ یہاں کے مضافاتی علاقے بھی بہت گنجان آباد تھے' جن میں بے شمار چھوٹی سڑکیں اور پگڈنڈیاں تھیں پھر گاؤں کے درمیان لمبے لمبے راستے اگر تلاش کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو چپہ چپہ چھان مارنا بہت مشکل تھا اور اگر اغوا کاروں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ایک دوسرے سے ملتی ہوئی پگڈنڈیوں پر شارٹ کٹ لے کر کہیں چھپ جانا بہت آسان تھا۔

تحقیقات شروع کرنے سے پہلے برطانیہ وزارت داخلہ کے ہوم آفس میں اطلاع دی گئی جسے ہیری میریٹ گورنمنٹ ہوم سیکرٹری نے ریسیو کیا اور ٹھیک 8 بج کر 4 منٹ پر اس نے 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ کال کر کے مسز تھیچر سے بات کرنے پر اصرار کیا جس کی اجازت اسے فوراً مل گئی۔

''پرائم منسٹر میں فوراً آپ سے ملنا چاہتا ہوں، میں اس کام میں دیر نہیں لگا سکتا۔''

''تو آ جاؤ ہیری۔'' مارگریٹ تھیچر نے فوراً جواب دیا۔

''مجھے صرف تین منٹ چاہیے۔'' ہیری میریٹ نے کہا اور ریسیور رکھ دیا پھر وہ نیچے کھڑی اپنی کار میں مسز تھیچر سے ملنے روانہ ہو گیا تھا۔

☆☆

اغوا کرنے والے تعداد میں چار تھے ایک گن مین تھا جو پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اس نے گن کو اپنے دونوں گھٹنوں کے درمیان پکڑا ہوا تھا اور اپنے چہرے سے یلوکلر کا ماسک اتار دیا تھا اس کے چہرے پر نقلی موچھیں اور سر پر وگ تھی اور آنکھوں پر بغیر شیشے لگی عینک تھی جو اس نے اتار دی تھی اس کے برابر میں ڈرائیور تھا جو ٹیم کا لیڈر تھا اس نے بھی وگ لگائی ہوئی تھی اور نقلی داڑھی بھی تھی۔ ان دونوں نے کچھ دیر کے لیے یہ بہروپ اپنایا تھا کیونکہ وہ چند میل تک پرسکون اور آزادرہ کر سفر کرنا چاہتے تھے پچھلی سیٹ میں دو افراد سائمن کارنک کے ساتھ بیٹھے تھے ان میں سے ایک لمبے قد کا امریکن جس کی داڑھی تھی اور دوسری جسامت میں دبلا پتلا تھا۔ وین کچھ دور جانے کے بعد ڈیتھلے کی طرف مڑ گئی تھی۔ سائمن کے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں افراد سائمن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے اور سائمن ان کی گرفت سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا پھر ان میں سے ایک نے اس کے سر پر کوئی چیز ماری تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

راستے میں ڈاؤن ہل کے دور دور بنے ہوئے کاٹیجز سے گزرتی ہوئی یہ وین ڈیتھلے ٹاؤن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انہوں نے راستے میں ایک ملک کی وین کو پاس کیا تھا اس علاقے میں دودھ سپلائی کرنے والی یہ وینز عام تھیں، جو مضافات سے دودھ لے کر شہروں میں سپلائی کرتی تھیں اور پھر تقریباً سو گز آگے جا کر وین ڈرائیور نے ایک اخبار ڈالنے والے بچے کو بھی دیکھا تھا، وہ بھی ان کی طرف دیکھ رہا تھا پھر کچھ دور جانے کے بعد یہ وین فوکس کورٹ کے علاقے میں داخل ہو کر ایک فارم کے گیٹ میں داخل ہو گئی اور کچھ آگے جا کر ایک اجڑے ہوئے سے احاطے میں داخل ہو کر رک گئی تھی اس احاطے میں جگہ جگہ درختوں کی کئی لکڑیاں پڑی تھیں۔ یہ جگہ ان اغوا کاروں نے دو ہفتے قبل لی تھی جس وقت وہ اس احاطے میں پہنچے صبح کے سات بج کر سولہ منٹ ہوئے تھے۔

دن کی روشنی تیزی سے پھیل رہی تھی اور چاروں آدمی تیزی سے کام کر رہے تھے انہوں نے سبز رنگ کی وین کی پچھلی سیٹ سے بے ہوش سائمن کو اٹھایا اور احاطے میں کھڑی سرخ رنگ کی بڑی گاڑی میں رکھے ایک ٹرنک میں ڈال دیا جس میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے پھر انہوں نے اپنی نقلی داڑھی موچھیں اور ماسک بھی اسی ٹرنک میں ڈال دیتے تھے اس کے بعد عام شہریوں والے لباس پہن کر سیاہ کپڑے جو پہلے پہنے ہوئے تھے وہ بھی ایک تھیلے میں رکھ کر سرخ رنگ کی بڑی گاڑی میں سائمن والے ٹرنک میں ڈال دیے تھے پھر وہ چاروں گاڑی میں سوار ہو کر احاطے سے باہر نکل گئے تھے۔

اب سرخ رنگ کی بڑی گاڑی شمال کی طرف سفر کر رہی تھی گن مین اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس وقت صبح کے سات بج کر بائیس منٹ ہوئے تھے۔

وہ تیزی سے سفر کرتے ہوئے آکسفورڈ شائر کی مارکیٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے بکنگھم کی طرف بڑھ گئے تھے۔ یہاں سے ان کے پیچھے ایک پولیس کی کار بھی سفر کر رہی تھی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ایک شخص تنبیہی انداز میں کچھ بڑبڑایا تھا اور گن مین کا ہاتھ فوراً گن پر گیا تھا لیکن ڈرائیور نے اسے کچھ نہ کرنے کا اشارہ کیا تھا اور گاڑی ڈرائیو کرتا رہا تھا کچھ ہی دور جانے کے بعد ایک سائن بورڈ نظر آیا جس پر خوش آمدید بکنگھم شائر لکھا تھا یہاں پر پولیس کار رک گئی تھی اور سرخ رنگ کی بڑی گاڑی عام رفتار میں آگے بڑھتی چلی گئی تھی اور نظروں سے غائب ہو گئی تھی یہ وہ وقت تھا

جب سر ہیری میرٹ 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ میں مسز تھیچر کو کال کر رہے تھے۔

☆☆

سر ہیری میرٹ نے مارگریٹ تھیچر کو سائمن کارلک کے اغوا کی خبر دی تھی تو وہ بہت جذباتی ہو گئی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔

''اوہ میرے خدا یہ تو بہت برا ہوا۔'' انہوں نے افسردگی سے کہا۔

''ہم جان کارمک کو کیا جواب دیں گے۔'' انہوں نے تاسف سے کہا۔

''ہمیں بہت بڑی مشکل کا سامنا ہے۔'' ہیری میرٹ نے کہا اور تھیچر نے اثبات میں سر ہلایا ان کے چہرے پر کرب کے آثار تھے پھر انہوں نے اپنے انٹر کام کا بٹن دبایا۔

''چارلی فوراً میری بات صدر کارمک سے کراؤ اور وائٹ ہاؤس کو میری طرف سے بتاؤ کہ یہ ارجنٹ ہے اس کے لیے انتظار نہیں کیا جا سکتا' میں جانتی ہوں کہ اس وقت واشنگٹن میں کیا وقت ہو گا لیکن میں انتظار نہیں کر سکتی۔'' تھیچر نے کہا۔ لیکن انہیں انتظار کرنا پڑا تھا کیونکہ برطانیہ سے امریکا ہوٹ لائن پر کال کنیکٹ ہونے میں پانچ منٹ درکار تھے۔

☆☆

جائے وقوعہ پر کام بہت تیزی سے جاری تھا' پولیس اور سراغ رساں محکموں کے تیس افراد وہاں تحقیقات میں مصروف تھے انہوں نے جائے حادثہ سے تمام ثبوت وشواہد جمع کر لیے تھے اس کے علاوہ قریبی رہائشیوں سے بھی پوچھ گچھ کی تھی کسی نے بھی وقوعہ ہوتے نہیں دیکھا تھا صرف ایک عورت نے اپنے کچن میں کام کرتے ہوئے کسی گاڑی کے گزرنے کی مدہم سی آواز سنی تھی اور ایک شخص نے صبح سات بجے ایک گرین کلر کی وین کو دتھلے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا پھر جاسوسوں نے نو بجے سے پہلے پہلے دودھ والی وین کے ڈرائیور اور اخبار سپلائی کرنے والے ایک لڑکے سے بھی پوچھ گچھ کی تھی جو صبح سات بجے اس علاقے میں موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے گرین کلر کی وین دیکھی تھی جس پر بارلوز کا لوگو بنا ہوا تھا۔ لیکن جب تحقیقات آگے بڑھی تو بارلوز کے مارکیٹنگ منیجر نے بتایا تھا کہ اس علاقے میں صبح سات بجے ان کی کوئی گاڑی نہیں جاتی تھی۔

پولیس نے سارے علاقے کو چھان ڈالا تھا بہت سے لوگوں سے پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ کچھ لوگوں سے پتا چلا تھا کہ انہوں نے ایک نوجوان لڑکے کو سڑک پر جاگنگ کرتے دیکھا تھا جس کے پیچھے ایک کار آہستہ آہستہ چل رہی تھی جیسے اس کا پیچھا کر رہی ہو۔

صبح نو بجے تک اسپیشل برانچ آپریشن کے ہیڈ کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے ہاتھ کوئی ایسا ثبوت نہیں آیا تھا' جس سے مجرموں تک پہنچنے میں مدد مل سکے۔ وہ جو کوئی بھی تھے ان کی پہنچ سے نکل چکے تھے ابھی تک میڈیا والوں کو پتا نہیں چلا تھا لیکن آپریشن برانچ ہیڈ کو اندازہ تھا کہ خبر چھپنے والی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ آپریشن برانچ ہیڈ یہ نہیں جانتا تھا کہ قریب کے گھر کی ایک خاتون اپنے کتے کے ساتھ چہل قدمی کرنے باہر نکلی تھی تو اس نے روڈ پر تین لاشیں پڑی دیکھی تھیں اور وہ چیختی ہوئی واپس گھر میں چلی گئی تھی اور اس نے اپنے شوہر کو یہ بات بتائی تھی وہ بہت ہی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کا شوہر جو ایک مقامی اخبار آکسفورڈ میل میں پرنٹر تھا اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ جب آفس پہنچے گا تو ڈیوٹی ایڈیٹر کو یہ

بتائے گا۔

⚙……☆☆……⚙

مارگریٹ تھیچر کی کال جو ڈاؤننگ اسٹریٹ سے کی جارہی تھی اسے وائٹ ہاؤس میں کمیونیکیشن سینٹر کے سینئر ڈیوٹی آفیسر نے ریسیو کیا تھا۔ اس وقت واشنگٹن میں صبح کے ساڑھے تین بجے تھے یہ جاننے کے بعد کہ کس کی کال آرہی ہے اس نے یہ کال آگے فارورڈ کرنے سے پہلے سینئر سیکرٹ سروس ایجنٹ کو دی تھی' جو اس وقت وائٹ ہاؤس مینشن کے باہر پہرے پر تھا اور دوسری منزل پر واقع فیملی کوارٹرز سے بہت قریب تھا۔

''وہ بات کرنا چاہتی ہیں کیا ان برطانویوں کو پتا نہیں کہ اس وقت کیا ٹائم ہوا ہے۔'' اس نے ریسیور میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا پھر کچھ دیر تک دوسری طرف کی بات سنتا رہا تھا۔

''ٹھہرو میں دیکھ کر بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور کال ہولڈ پر کردی۔

سیکرٹ سروس گارڈ لپ انسکی اپنے کمرے سے متصل سیٹنگ ہال میں داخل ہوا تھا اور بائیں ہاتھ پر بنے صدر کارمک کے بیڈروم کے دروازے پر رک گیا تھا پھر اس نے ایک گہری سانس لی تھی اور دروازے پر دستک دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ذرا سی بھی غلطی ہوئی تو اس کی نوکری جاسکتی ہے پھر ڈرتے ڈرتے اس نے صدر کارمک کی خوابگاہ میں قدم رکھا تھا اور ان کے بیڈ کے قریب پہنچ کر ان کا کاندھا ہلایا تھا۔

''جناب صدر۔'' اس نے آہستہ سے آواز دی۔

''مہربانی کرکے آنکھیں کھولیں جناب۔''

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اس پر صدر کا عتاب بھی نازل ہوسکتا تھا۔

جان کارمک نے آنکھیں کھولیں اور گارڈ کو کھڑے دیکھ کر حیرت سے پوچھا تھا کہ کیا وقت ہوا ہے۔

''صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں جناب۔'' گارڈ نے بتایا۔

''سر میں معافی چاہتا ہوں دراصل جناب صدر برطانوی وزیراعظم مسز تھیچر آن لائن ہیں ان کا کہنا ہے کہ کوئی ضروری بات ہے وہ انتظار نہیں کرسکتیں۔ میں معافی چاہتا ہوں جناب۔'' اس نے ایک بار پھر معافی مانگی۔

جان کارمک نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر بیڈ سے اٹھ گئے گارڈ نے قریب رکھا ہوا گاؤن انہیں دیا۔ تین سالہ صدارت کی مدت گزارنے کے بعد کارمک کو اندازہ تھا کہ برطانوی وزیراعظم کس قسم کی شخصیت کی مالک ہیں وہ دو بار ان سے انگلینڈ میں مل چکے تھے اگر انہوں نے کال کی تھی تو ضرور کوئی اہم بات ہوگی۔

''کوئی بات نہیں تم نے ٹھیک کیا۔'' کارمک نے خوفزدہ گارڈ کی ہمت بندھائی۔

''میں اپنے اسٹڈی روم میں کال ریسیور کروں گا۔'' انہوں نے کہا صدر کارمک کا اسٹڈی روم ان کے ماسٹر بیڈروم اور یلو اوول روم کے درمیان میں تھا اس کی کھڑکیاں لان میں کھلتی تھیں وہ اسٹڈی روم میں اپنی کرسی پر جاکر بیٹھے اور ریسیور اٹھالیا۔ دس سیکنڈ میں مسز تھیچر لائن پر تھیں۔

''کیا ابھی تک کسی نے آپ سے رابطہ کیا ہے۔'' مارگریٹ تھیچر نے پوچھا۔

''نہیں، کسی نے نہیں، کیوں کیا بات ہے؟'' کارمک نے پوچھا۔

''مجھے یقین ہے کہ مسٹر ایڈمنڈ سیکرٹری آف اسٹیٹ اور ڈونلڈ ڈائریکٹر ایف بی آئی کو اب تک خبر ہوچکی ہوگی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں پہلی فرد ہوں

جس نے اس سلسلے میں آپ سے رابطہ کیا ہے۔" پھر مارگریٹ تھیچر نے آہستہ آہستہ انہیں خبر بتائی تھی صدر کارمک نے سختی سے ریسیور تھاما ہوا تھا اور سامنے لگے پردے کو تک رہے تھے ان کا حلق خشک ہو رہا تھا انہیں مارگریٹ کی آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"سب کچھ کیا جا رہا ہے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی بہترین ٹیم کام کر رہی ہے مجرم بھاگ نہیں سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے، شکریہ۔" صدر کارمک نے میکانکی انداز میں کہا اور ریسیور رکھ دیا انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے ان کے سینے پر گھونسا مارا ہو انہیں اپنی بیوی مائرہ کا خیال آیا جو ابھی سو رہی تھیں اور وہ سوچ رہے تھے کہ وہ مائرہ کو کیسے بتائیں گے وہ بہت دکھی ہوگی۔

"اوہ، سائمن۔" انہوں نے سرگوشی کی۔

"سائمن، میرے بیٹے...... یہ کیا ہوا۔" انہوں نے دکھ سے کہا وہ جانتے تھے کہ اس صورت حال کو وہ تنہا نہیں سنبھال سکتے انہیں ایک دوست اور ہمدرد ساتھی کی ضرورت تھی، جس وقت وہ مائرہ کو اس مخبر کے بارے میں بتائیں۔ چند منٹ ٹھہرنے کے بعد انہوں نے آپریٹر کو کال کی وہ اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اوڈیل کو بھیجو...... ہاں...... ابھی۔"

پھر جب اوڈیل وہاں پہنچا تو صبح کے چار بجے تھے۔

☆☆

کرائسس مینجمنٹ برطانیہ کی ایسی کمیٹی ہے جس کے ممبران کی شمولیت مختلف کرائسز کے مطابق بدلتی رہتی ہے لیکن اس کی میٹنگ کی جگہ کم ہی تبدیل ہوتی ہے اور ایک خاص کانفرنس ہال میں ہمیشہ ہی کیبنٹ آفس کی بریفنگ ہوتی ہے یہ زمین میں دو منزل نیچے بنا ہوا ایک ایئر کنڈیشن ہال ہے تھا۔ سرکاری طور پر اس کمیٹی کو Cobra کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تھیچر کی ہدایت ملنے کے بعد سر ہیری میرٹ کو اپنے اسٹاف کو جمع کرنے میں صرف ایک گھنٹہ لگا تھا اور صبح 9:56 منٹ پر تمام نمائندگان کیبنٹ آفس میں جمع ہو چکے تھے حالانکہ اغوا کا کیس ایک جرم تھا اور سیدھا سیدھا پولیس کے محکمے کا معاملہ تھا جو ہوم آفس کے تحت آتا تھا لیکن یہ معاملہ منسٹر آف اسٹیٹ کا بھی تعلق تھا جو واشنگٹن میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے تعلقات استوار کرنے میں لگا تھا۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر سائمن کارمک کو مجرمین یورپ لے جانے میں کامیاب ہو گئے تو ایک سیاسی مسئلہ بھی پیدا ہو جائے گا جبکہ سیکرٹ انٹیلی جنس سروس کا خیال تھا کہ یہ ممکن ہے کہ اس اغوا کے پیچھے کوئی غیر ملکی دہشت گرد گروپ ملوث ہو۔ یہ سوال سب کے ذہنوں میں گھوم رہا تھا کہ اس اغوا کے پیچھے کون ہے ٹرانسفر مینجمنٹ کی میٹنگ میں مختلف ذمہ داریاں مختلف اداروں کو دی گئی تھیں۔ برطانوی منسٹری آف ٹرانسپورٹ میں مختلف ائرپورٹس اور پورٹس کی ذمہ داری شیئر کی گئی تھی جس کا مقصد یہ نظر رکھنا تھا کہ خفیہ رہ کر یہ نگرانی کی جائے کہ سائمن کارمک کو کسی بھی طرح ملک سے باہر نہ لے جایا جا سکے اس کے لیے ہر سرکاری اور پرائیویٹ ٹرانسپورٹ پر نظر رکھنا تھی اور سر ہیری نے خود یہ ذمہ داری نیگل کرامر کو دی تھی۔ جس کے ماتحت لندن کی ساری پولیس فورس تھی اس کانفرنس میں دو غیر ملکی بھی شامل تھے۔ ایک پیٹرک سیمر جو امریکن سفارت خانے میں ایف بی آئی کا آدمی تھا اور دوسرا لیو کولن جو لندن میں سی آئی اے کا آفیسر تھا ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ لندن میں ہونے والی تحقیقات سے آگاہ رہیں

اور اگر کوئی مدد کر سکتے ہیں تو کریں۔
اس میٹنگ میں سر ہیری میرٹ نے دو نکات بیان کیے تھے۔
سائمن کارمک کو اغوا کر کے اس علاقے میں کہیں چھپا دیا گیا تھا۔
اغوا کرنے والوں نے اب تک کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔
ہم جانتے ہیں کہ اس اغوا میں ایک گرین کلر کی فورڈ استعمال ہوئی ہے۔ جس کے دونوں اطراف بارلو فرٹ کمپنی آکسفورڈ شائر کا لوگو بنا ہوا ہے اور اسے وتھلی سے مشرق کی جانب جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے یعنی وقوعہ کی جگہ سے دور جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور وقوعہ کے صرف پانچ منٹ بعد دیکھا گیا ہے اور درحقیقت وہ بارصر کی وین نہیں تھی یہ کنفرم کرلیا گیا ہے گواہ اس کا رجسٹریشن نمبر نہیں جان سکا تھا اور اس میں بیٹھے ہوئے اشخاص کو بھی بغور نہیں دیکھا جاسکا جبکہ گواہ کا کہنا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے چہرے پر داڑھی تھی۔ جائے وقوعہ سے کار کا ایک جیک ملا ہے اور ٹائر پرنٹس سے پتا چلتا ہے کہ ٹائر نئے تھے اور گولیوں کے خول ملے ہیں جو جانچ کے لیے ماہرین کو بھیج دیے گئے ہیں۔'' سر ہیری میرٹ نے خاص خاص لوگوں کو چند ہدایات دینے کے بعد میٹنگ ختم کر دی تھی۔

٭٭

نائب صدر اوڈیل جب صدر کارمک سے ملنے پہنچا تو اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کس سے مدد مانگنا چاہیے۔
''میں مسئلہ اکیلے حل نہیں کر سکتا مائیکل اوڈیل۔'' صدر کارمک نے کہا۔
''میں اپنی صدارتی ذمہ داریاں پوری کرنے کی کوشش کروں گا میں اپنے آفس میں بھی بیٹھوں گا لیکن میں کرائسز مینجمنٹ کمیٹی کی ذمہ داری نہیں سنبھالوں گا میں بہت دلبرداشتہ ہو چکا ہوں۔
''مائیکل تم اسے میری خاطر واپس لاؤ میں اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' صدر کارمک کی آواز رندھ گئی تھی۔
''میں آپ کے لیے جو کچھ بھی کر سکا کروں گا۔''
اوڈیل نے کہا وہ اپنے صدر کا بڑا مداح اور خیر خواہ تھا اس نے فوراً سارے معاملات سنبھال لیے تھے اور کئی اہم شخصیات سے رابطہ کیا تھا۔
''جب تک مجرموں کے چھپنے کی جگہ کا پتا نہیں چلتا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک کہ وہ خود ہم سے رابطہ نہیں کرتے وہ یقیناً ایک بھاری رقم کا مطالبہ کریں گے۔'' فلپ کیلی نے کہا جو لندن میں موجود سب سے بہتر کرائم ایکسپرٹ تھا اور اوڈیل نے اسے مشورہ کرنے کے لیے بلایا تھا۔
''اس کے بعد ہم اس قابل ہوں گے کہ سائمن کو بازیاب کرانے کے لیے اقدامات کریں۔'' فلپ کیلی نے اپنی رائے مکمل کی۔
''ہاں ہمیں اپنی تحقیقات جاری رکھنا چاہیے تاکہ ان کے ٹھکانوں کا پتا چل سکے اگر ایسا نہیں ہوا تو ان سے کوئی سودے بازی نہیں کی جاسکے گی۔'' اوڈیل نے کہا۔
''اگر ایسا موقع آیا کہ مجرموں سے بات چیت کرنا پڑی یا کوئی سودا کرنا پڑا تو یہ کام کون کرے گا۔'' فلپ کرک نے پوچھا۔
''ہمیں کسی نہ کسی کا بندوبست کرنا ہوگا ہم اس معاملے کو مکمل طور پر برطانیہ پر نہیں چھوڑ سکتے۔'' اوڈیل نے کہا۔ ''ہمیں کچھ نہ کچھ ایسے اقدامات کرنا ہوں گے کہ ہم اس بچے کو باخیریت واپس لاسکیں۔''

''لیکن برطانوی حکومت کا کہنا ہے کہ وہ اس سلسلے میں سرگرم ہیں۔'' فلپ کرک نے کہا۔
''ہاں لیکن ہمیں زور دینا ہوگا کہ اس معاملے میں ہمیں بھی تحقیقات میں شامل کیا جائے۔'' اوڈیل نے کہا۔
''لیکن ہم واشنگٹن پولیس ڈیپارٹمنٹ ٹیم کو اسکاٹ لینڈ یارڈ کی جگہ لینے کے لیے ان کی ریاست میں نہیں بھیج سکتے اپنے ملک میں وہی کارروائی کرنے کے مجاز ہیں۔'' فلپ نے کہا۔
''لیکن اگر ثالثی کی بات ہوئی تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ دنیا میں بہترین Negotiato ثالث کون ہے۔'' اوڈیل نے کہا۔
''اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس امریکا میں بیورو سائنس گروپ ہے اور وہ بہت اچھی طرح یہ کام کرسکتا ہے اس میں بہترین تربیت یافتہ ثالث موجود ہیں۔'' فلپ نے کہا۔
''میں نے کہا کہ دنیا میں بہترین ثالث کون ہے؟'' اوڈیل نے اپنی بات پر زور دیا۔
''دنیا میں بہترین ثالث تو کوئین ہے میں اسے جانتا ہوں۔'' فلپ نے کہا۔
''اس کا بیک گراؤنڈ بتاؤ۔'' نائب صدر اوڈیل نے کہا۔
''وہ امریکی ہے آرمی چھوڑنے کے بعد اس نے ایک انشورنس کمپنی کو جوائن کرلیا تھا اور دو سالوں سے وہ اسے ثالث کے طور پر مختلف کیسوں میں استعمال کر چکے ہیں۔ وہ یورپ میں ان کے سارے کلائنٹس کو جانتا ہے شادی شدہ ہے اس کی ایک بیٹی ہے اس کی فرانسیسی بیوی اور ایک بچہ روڈ ایکسیڈنٹ میں مارے گئے تھے تو وہ شراب کا عادی ہوگیا تھا پھر اسے کمپنی والوں نے نکال دیا کچھ عرصے بعد اس نے لندن میں ایک فرم میں کام شروع کردیا جو ایک سیکورٹی کمپنی ہے اور مجرموں سے بات چیت کرکے اغوا ہونے والوں کو بازیاب کراتی ہے۔'' فلپ نے تفصیل بتائی۔
''لیکن اب وہ فارغ ہے اس فرم میں اس نے دس سال کام کیا آج کل ذاتی طور پر مختلف کیسوں پر کام کرتا ہے اور اس نے یورپ میں بہت کامیابی حاصل کی ہے وہ تین زبانیں بول سکتا ہے اور برطانیہ اور یورپ سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔''
''کیا وہ ہمارے لیے مناسب رہے گا؟'' اوڈیل نے پوچھا۔
''جناب نائب آپ نے پوچھا تھا کہ دنیا میں بہترین کون ثالث ہے۔'' فلپ نے جواب دیا۔
''وہ اس وقت کہاں ہے؟'' اوڈیل نے پوچھا۔
''میری اطلاع کے مطابق وہ اس وقت اسپین میں ہے۔''
''ٹھیک ہے جاؤ اسے لے کر آؤ، تمہیں ہر حال میں اسے لانا ہے چاہے کوئی بھی قیمت ادا کرنا پڑے۔''

☆☆

برطانیہ میں تمام احتیاطوں کے باوجود ایک چھوٹے سے ریڈیو سے سائمن کارمک کے اغوا کی خبر نشر ہوگئی تھی اور ذرا سی دیر میں ہر طرف پھیل گئی تھی ہر کسی کو تجسس تھا کہ کیا ہوا ہے اور کیسے ہوا ہے اور اب اس سلسلے میں کیا اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ برطانوی محکمہ پولیس لوگوں کے سوالات کے جوابات دے کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر برطانوی کمشنر نے ہنگامی طور پر آٹھ پرد پرائٹروں بیس ایڈیٹرز اور دو ٹی وی نیٹ ورکس کے چیف اور بارہ ریڈیو اسٹیشن سے رابطہ کیا تھا انہیں یقین دلایا تھا کہ لوگ چاہے کچھ بھی کہیں اس کا قومی امکان

ہے کہ مجرم برطانیہ ہی میں کہیں چھپے ہوئے ہیں اور وہ یقیناً برطانوی ریڈیو سن رہے ہوں گے برطانوی ٹی وی دیکھ رہے ہوں گے اور برطانوی اخبارات پڑھ رہے ہوں گے اس نے درخواست کی کہ کوئی حماقت نہ کی جائے کوئی چھوٹی کہانی شائع نہ کی جائے نہ ہی یہ بتایا جائے کہ پولیس اپنی کارروائی میں کہاں تک پہنچی ہے ورنہ وہ ہوشیار ہو جائیں گے اور اگر انہیں کوئی شبہ ہو گیا تو وہ خوفزدہ ہو کر یرغمالی کو مار بھی سکتے ہیں اور پھر وہ فرار ہو جائیں گے پھر کمشنر نے ان سب سے ایک ایگریمنٹ سائن کروالیا کہ وہ لوگ دی جانے والی ہدایات پر عمل کریں گے۔

کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ سائمن کو اغوا کرنے والی وین لندن میں واقع اسکاٹ لینڈ یارڈ کے دفتر سے صرف چالیس میل دور قصبے کے درمیانی علاقے میں موجود تھے۔ جہاں وہ موجود تھے اس گھر کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا نہ ہی وہ بہت ویران جگہ پر کوئی تن تنہا مکان تھا جو اس پر شک کیا جاسکے اور نہ ہی اس کے آس پاس پڑوسیوں کے زیادہ مکانات تھے اس گھر تک پہنچنے سے دو میل پہلے ہی ٹیم لیڈر نے دوسرے تین ساتھیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ جھک کر بیٹھیں تاکہ کوئی انہیں دیکھ نہ سکے وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور انہوں نے اپنے اوپر ایک کمبل ڈالا ہوا تھا۔

اگر کوئی گاڑی کی طرف دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی داڑھی والا بزنس مین اپنی گاڑی گیٹ سے اپنے گیراج میں لے گیا ہے۔

گیراج ریموٹ سے کھولا گیا تھا اور گاڑی کے اندر جانے کے بعد آٹومیٹکلی بند ہو گیا تھا اس کے بعد ہی لیڈر نے گاڑی سے باہر آکر دوسرے ساتھیوں کو کمبل اتارنے کی اجازت دی تھی گیراج گھر سے ملحق تھا اور درمیان میں گھر میں داخل ہونے کے لیے ایک دروازہ تھا۔

چاروں افراد نے ٹرنک کھولنے سے پہلے اپنے سیاہ لباس تبدیل کر لیے تھے' سائمن کارک کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا گاڑی کی ہیڈ لائٹ سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی جس سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں پھر جلد ہی اس کے سر پر ایک سیاہ غلاف اوڑھا دیا گیا تھا اور وہ اپنے اغوا کاروں کے چہرے نہیں دیکھ سکا تھا۔

اسے گیراج میں بند دروازے کے ذریعے ہی گھر میں لے جایا گیا تھا اور پھر سیڑھیاں اتر کر ایک قید خانے میں پہنچایا گیا تھا۔ تہہ خانہ پہلے سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کا فرش سفید اور صاف ستھرا تھا وہیں پر ایک جانب اسٹیل کا بیڈ پڑا تھا۔ پلاسٹک کی ٹوائلٹ چیئر تھی تھی دروازے میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جس کے باہر لوہے کے شٹر بھی لگے تھے جن کے دو اسٹیل کے بولٹ تھے اسے دو افراد نے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا ایک نے اس کے ایک بازو میں اسٹیل کی ہتھکڑی ڈال دی تھی۔ جس میں دس فٹ کی اسٹیل کی زنجیر لگی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا بیڈ کے ایک سرے کے ساتھ بندھا ہوا تھا پھر وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے ان میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔

پھر اس نے سر سے کالا غلاف اتارنے کے لیے آدھے گھنٹے تک انتظار کیا تھا۔ ب وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لوگ اب بھی وہاں ہیں یا نہیں اس نے صرف کسی دروازے کے بند ہونے کی آواز سنی تھی۔

اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اس نے بہت آہستگی سے غلاف اتارا تھا۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی کمرے کی لائٹ کی روشنی میں کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئی تھیں اسے پچھلے گزرے ہوئے چند گھنٹے یاد

آ رہے تھے۔ وہ ٹھنڈی گھاس پر بھاگ رہا تھا پھر ایک سبز وین اس کے راستے میں آئی تھی ایک شخص اس کا ٹائر بدل رہا تھا پھر دو سیاہ سائے اس کی طرف بڑھے تھے پھر گن فائر کی آواز سنائی دی تھی پھر اسے اپنے اوپر کسی چیز کا وزن محسوس ہوا تھا۔ وہ گرا تھا اور اس کے منہ میں گھاس گھس گئی تھی۔

اسے وین کے کھلے دروازے یاد تھے وہ چیخنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا اور ایک صحت مند آدمی نے اسے دبوچا ہوا تھا اور پھر وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور اب وہ یہاں تھا اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی وہ وہاں تنہا تھا اس نے اپنے دل کو مضبوط رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''اوہ ڈیڈ۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''ڈیڈ...... میں شرمندہ ہوں میری مدد کریں۔'' اس نے پھر ہم کلامی کی۔

☆☆

فلپ کرک نے نائب صدر کے احکامات پر عمل کرنے کے لیے پولیس کمشنر وین تھروب کا انتخاب کیا تھا اور ہنگامی بنیادوں پر اسے فرانس روانہ کیا تھا جہاں اسے Andalusia کے علاقے سے کوئین کو لے کر آنا تھا اس کا سفر بڑی عجلت میں کٹا تھا اور جب وہ اینڈالوسیا کے قصبے میں کوئین کے چھوٹے سے گھر کے باہر کھڑا تھا تو رات اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا اپنے کوٹ کی جیب سے پستول نکالی اور دبے قدموں گھر میں داخل ہو گیا۔ اندر اندھیرا تھا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا ایک کمرہ خالی تھا اس نے برابر کے کمرے میں قدم رکھا وہاں نیم تاریکی تھی کمرے میں رکھا ہوا سامان واضح نظر نہیں آ رہا تھا

کوئین اس کمرے میں بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تو اس کی کمر میں کسی چیز کی نوک کی چبھن محسوس ہوئی۔

''کون ہو؟'' سرگوشی میں پوچھا گیا۔

''میں وین تھروب ہوں۔'' پولیس کمشنر نے جواب دیا۔ اس نے کوئین کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ پہلے بھی اس سے مل چکا تھا۔

''اوہ۔'' کوئین نے جواب دیا اور کمرے کی لائٹ آن کر دی۔

''تمہیں میرے آنے کا اندازہ ہو گیا تھا۔'' وین تھروب نے حیرت سے پوچھا۔

''ظاہر ہے امریکی صدر کا بیٹا اغوا ہوا ہے وہ بھی اکلوتا بیٹا تو کوئین کی ضرورت تو پڑے گی۔'' کوئین نے تیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتا ہے۔'' وین تھروب کے لہجے حیرت تھی۔

''ظاہر ہے میرا کام ہی ایسا ہے سب خبر رکھنا پڑتی ہے اسے یوک شائر کے علاقے سے اٹھایا گیا ہے وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک سالہ کورس کر رہا تھا اور بہترین ایتھلیٹ ہونے کے ناتے آج کل صبح کو جوگنگ میں مصروف تھا۔'' کوئین نے کہا۔ وین تھروب کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اسے اندازہ نہیں تھا کہ کوئین کو اتنی معلومات ہوں گی۔

''جب تم جان ہی گئے ہو تو بتاؤ کہ اس معاملے میں کیا کہتے ہو؟''

''میں یہ کام نہیں کروں گا۔'' کوئین نے جواب دیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو بند کر کے میز پر رکھ دیا جو کچھ دیر پہلے اس نے وین تھروب کی کمر میں چبھویا تھا۔

''لیکن تم جانتے ہو میں تمہیں لیے بغیر نہیں

جاؤں گا۔" وین تھروب نے کہا۔
"میں ریٹائر ہوگیا ہوں اور اب ایک پرسکون زندگی جینا چاہتا ہوں۔" کوئین نے کہا۔
"دیکھو، بس یہ آخری کام سمجھ کر کردو۔"
"نہیں۔"
"دیکھو کوئین ہم کسی اور کو اس کام میں شامل نہیں کرسکتے تمہارے پاس وہ ساری صلاحیتیں ہیں جو اس کام کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔"
"لیکن میں مجبور ہوں۔"
"تم یہ کام میرے لیے مت کرو، صدر کارمک کے لیے مت کرو لیکن اس بچے کے لیے کردو جو دشمنوں کے نرغے میں ہے وہ معصوم ہے، صرف اس کی خاطر تمہیں یہ کام کرنا ہوگا کوئین، انسانیت کے لیے۔"
"معاوضہ کیا دو گے؟" اچانک کوئین نے پوچھا۔
"منہ مانگا...... جو تم کہو گے ملے گا۔" وین تھروب نے کہا۔
"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" کوئین نے جواب دیا اور وین تھروب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
وہ دونوں اسی وقت وہاں سے روانہ ہوگئے تھے اور ائرپورٹ پہنچنے کے بعد وین تھروب اسی طیارے سے کوئین کو لے کر واشنگٹن کے لیے روانہ ہوگیا تھا جس میں یہاں آیا تھا۔
پھر جیسے ہی وین تھروب اور کوئین نے طیارے سے زمین پر قدم رکھا تھا ان کی آمد کی اطلاع امریکا کے نائب صدر اوڈیل کو ہوگئی تھی اس وقت صبح کے چار بجے تھے۔
"انہیں فوراً یہاں لے آؤ کسی تاخیر کے بغیر۔" اوڈیل نے حکم دیا اور اس کے ساتھ ڈائریکٹر ایف بی آئی اور مسٹر فلپ کرک کو بھی لے آنا۔"
اوڈیل کے حکم کی فوراً تعمیل ہوئی تھی اور وین تھروب اور کوئین کچھ ہی دیر بعد ان کے آفس میں موجود تھے۔ کوئین ابھی تک اسی لباس میں تھا جس میں اسپین سے روانہ ہوا تھا اس نے ٹھنڈ سے بچنے کے لیے ایک سوئٹر پہنا ہوا تھا اور بلیک ٹراؤزر کے ساتھ بلو شرٹ پہنی تھی کمرے میں موجود کمیٹی ممبرز حیرت سے کوئین کو دیکھ رہے تھے جس کے کپڑوں پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔
کوئین خاموشی سے چلتا ہوا میز کے آخری سرے پر رکھی خالی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا تھا اس نے انتظار نہیں کیا تھا کہ کوئی اسے بیٹھنے کی آفر کرے۔
"میں کوئین ہوں۔" اس نے خود ہی اپنا تعارف کرایا تو نائب صدر اوڈیل نے اپنا گلا صاف کیا۔
"مسٹر کوئین ہم نے آپ سے یہاں آنے کی درخواست اس لیے کی ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ سائمن کارمک کے اغوا کے سلسلے میں ثالث کا کردار ادا کریں۔" ان کی بات پر کوئین نے اثبات میں سر ہلایا۔
"اس کیس کے بارے میں ساری معلومات یہ ہیں۔" اوڈیل نے کہا اور ایک ٹائپ شدہ پیپر اس کی طرف بڑھا دیا جسے کوئین خاموشی سے پڑھنے لگا اس اثنا میں ایک شخص نے کافی لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔
"انہوں نے اب تک کوئی رابطہ کیا؟" کچھ دیر بعد کوئین نے کافی کی چسکی لگاتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں۔" اوڈیل نے جواب دیا۔ "ویسے بہت سی جعلی کالیں آرہی ہیں کچھ برطانیہ میں وصول ہوئی ہیں اور صرف واشنگٹن میں سات کالیں ہم نے ریسیو کی ہیں احمقوں کے لیے ایک مصروفیت مل گئی ہے۔"
کوئین خاموشی سے دستاویز کا معائنہ کر رہا تھا حالانکہ وہ خود بھی بہت کچھ جانتا تھا اور وین تھروب

نے بھی سفر کے دوران فلائٹ میں اسے خاصی معلومات دی تھیں لیکن وہ جاننا چاہتا تھا کہ اگر اور کوئی خاص بات ہو لیکن اسے چند پوائنٹ کے علاوہ کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

"مسٹر کوئین کیا تمہیں کوئی اندازہ ہے کہ یہ کام کون کر سکتا ہے۔" ایف بی آئی ڈائریکٹر نے پوچھا تو کوئین نے سر اوپر اٹھایا۔

"محترم حضرات۔" اس نے کہنا شروع کیا۔

"دراصل اغوا کاروں کی چار اقسام ہوتی ہیں، صرف چار اور ہمارے نقطہ نظر سے وہ لوگ بہتر ہوتے ہیں جو زیادہ عمر والے ہوں وہ بہت غلط طریقے سے پلان بناتے ہیں اور اگر وہ اغوا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ کچھ نہ کچھ نشانات چھوڑ جاتے ہیں، اکثر انہیں ڈھونڈ لیا جاتا ہے اور انہیں تلاش کرنے والی ٹیم آسانی سے ان تک پہنچ کر اغوا کیے جانے والے کو آزاد کرا لیتی ہے اور انہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے لیکن یہ لوگ ایسے نہیں ہیں۔" کوئین نے کہا اور سب چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"سب سے بری قسم ان لوگوں کی ہے جو نفسیاتی ہوتے ہیں ان تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے وہ کوئی بھی کام کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں رکھتے انہیں رقم کی بھی ضرورت نہیں ہوتی وہ صرف تفریح طبع کے لیے قتل کرتے ہیں۔" کوئین نے کہا۔

"اور دوسری دو قسم کن لوگوں کی ہیں۔" اس بار فلپ کرک نے پوچھا۔

"ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو سیاسی اور مذہبی جواز رکھتے ہیں اور اس کے لیے ہی اغوا کرتے ہیں ان کے مطالبات پورے کرنا مشکل ہوتا ہے وہ زیادہ تر مشہور ہونے کے لیے یہ کام کرتے ہیں۔ ان کا ایک مقصد ہوتا ہے جس کے لیے وہ جان بھی دے دیتے ہیں اور وہ سب اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قتل بھی کر سکتے ہیں وہ احمق نہیں ہوتے ان کے دلوں میں حساس اداروں کے لیے نفرت بھری ہوتی ہے اور وہ صرف اپنا رعب دکھانے کے لیے بھی قتل کر دیتے ہیں۔"

"اور آخری قسم۔" کرک نے دوبارہ پوچھا۔

"آخری قسم پیشہ ورانہ اغوا کاروں کی ہے انہیں رقم چاہیے ہوتی ہے انہوں نے اغوا کرنے کے لیے اچھی خاصی رقم خرچ بھی کی ہوتی ہے جسے وہ انویسٹمنٹ کرنا کہتے ہیں اور جو وہ منافع کے ساتھ واپس لیتے ہیں اغوا ہونے والے کو یرغمال بنا کر قید رکھتے ہیں اور وہ آسانی سے اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹتے۔"

"اور یہ لوگ جنہوں نے سائمن کو اغوا کیا ہے؟" اوڈیل نے پوچھا۔

"یہ جو بھی کوئی ہیں چاہے ان کا تعلق ساؤتھ امریکا کے گوریلاز سے ہو یا سسلی کی مافیا سے یا جنوبی بیروت کے حزب اللہ سے وہ سب بڑے مطمئن انداز میں کام کرتے ہیں وہ قتل نہیں کرتے کیونکہ انہیں جلدی نہیں ہوتی وہ اپنے یرغمالی کو کافی عرصے تک چھپا کر رکھ سکتے ہیں ایسے لوگ برطانیہ میں کثرت سے ہیں ان کی ساری توجہ اپنے شکار کو حاصل کرنے اور فرار ہو جانے پر ہوتی ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر انہیں پتا چلے کہ حساس ادارے یا انہیں ڈھونڈنے والی ٹیمیں ان تک پہنچ گئی ہیں تو وہ فرار ہو جائیں اور اپنے پیچھے یرغمالی کی لاش چھوڑ جائیں۔"

"کیا تم ان کے ساتھ معاملہ کر سکتے ہو؟" فلپ کرک نے پوچھا۔

"ہاں میرا خیال ہے کہ میں کر سکتا ہوں اگر وہ رابطہ کریں کسی نہ کسی کو تو یہ کام کرنا ہی ہوگا۔" کوئین نے کہا۔

"کیا ان سے کسی قسم کی رعایت کی توقع کی جاسکتی ہے یا رحم کی توقع کی جاسکتی ہے۔" کرک نے پوچھا۔

"کوئی بھی اغوا کار رحم دلی نہیں دکھاتا ان سے صرف اور صرف سفاکی کی توقع کی جاسکتی ہے۔" کوئین نے کہا اس پر نائب صدر اوڈیل نے سر اٹھا کر کمرے میں موجود گردن ہلا رہے تھے۔

"مسٹر کوئین کیا تو اس بچے کے اغوا کے سلسلے میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہو۔" اوڈیل نے پوچھا۔

"ہاں لیکن یہ تب ہی ہوسکتا ہے جب اغوا کرنے والے ہم سے رابطہ کریں لیکن میرے کام کرنے کی کچھ شرائط ہوں گی۔" کوئین نے کہا۔

"ہاں...... ہاں ضرور تم اپنی شرائط بتاؤ۔" اوڈیل نے فوراً ہی کہا۔

"میں امریکی گورنمنٹ کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔ مجھے اپنے کام میں اس کی مدد چاہیے میں صرف اور صرف سائمن کے والدین کی خاطر یہ کام کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اوڈیل نے کہا۔

"مجھے لندن سے باہر رہ کر کام کرنا ہوگا یہاں سے نہیں میں یہاں سے بہت دور ہوں گا میرے بارے میں کسی کو بھی کوئی معلومات نہیں دی جاسکے گی مجھے شہرت نہیں چاہیے مجھے میرے لیے ایک اپارٹمنٹ چاہیے جہاں رہ کر میں کام کرسکوں مجھے کچھ فون لائنز چاہیں اپنی ضرورت کے مطابق اور تلاشی کے معاملات میں مکمل رازداری اور کام کرنے کی آزادی چاہتا ہوں مجھے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی بھی مدد نہیں چاہیے۔" کوئین نے کہا۔

"لیکن یہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی بھی مجرمانہ سرگرمی کے خلاف کام کرنے کی مجاز ہے۔" اوڈیل نے کہا۔

"میں اپنے طریقے سے کام کروں گا۔ میں اپنے فیصلے خود کروں گا کہ مجھے ان لوگوں سے کس طرح نمٹنا ہے۔ ممکن ہے کہ اس سلسلے میں وہ لوگ کسی بڑی رقم کا مطالبہ کریں چنانچہ آپ کو وہ بھی فراہم کرنا ہوگی، میرا کام صرف لڑکے کو واپس لانا ہوگا اور بس اس کے آزاد ہونے کے بعد تم چاہو تو مجرموں کو پکڑنے کے لیے اس دنیا کے دوسرے سرے تک بھی جاؤ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" کوئین نے کہا۔

"اوہ، وہ تو ہم جائیں گے ہم انہیں نہیں چھوڑیں گے۔" ڈائریکٹر ایف بی آئی نے کہا۔

"رقم ادا کرنا ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" فلپ کرک نے کہا۔ "اس بچے کے لیے ہم کتنی بھی رقم ادا کرسکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے مجھے لوگوں کا رش نہیں چاہیے کوئی چھپ کر میری نگرانی نہیں کرے گا اور میں واپسی سے پہلے صدر کارمک سے ملنا چاہتا ہوں وہ بھی تنہائی میں۔" کوئین نے کہا تو کئی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

"وہ صدر ہیں امریکا کے صدر تم کیا بات کررہے ہو۔" ایف بی آئی کے ڈائریکٹر نے کہا "تم ان سے نہیں مل سکتے۔"

"میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ وہ امریکا کے صدر ہونے کے ساتھ ساتھ یرغمالی کے والد بھی ہیں کچھ ایسی چیزیں ہیں سائمن کے بارے میں جو میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں اور وہی مجھے بتاسکتے ہیں۔" کوئین نے کہا۔

"وہ بہت پریشان اور غمزدہ ہیں کیا تم انہیں اس سے الگ نہیں رکھ سکتے۔" اوڈیل نے کہا۔

"میرا تجربہ ہے کہ والد خاص طور سے ایسے موقع پر کسی سے بات کرنا چاہتے ہیں تا کہ ان کے دل کا

بوجھ ہلکا ہو جائے چاہے سامنے والا کوئی اجنبی ہی کیوں نہ ہو، مجھ پر یقین کرو۔" کوئین نے یہ بات کہہ تو دی لیکن اسے ڈر تھا کہ اس کی بات کو مانا نہیں جائے گا۔

"میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

اوڈیل نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا پھر وہ فلپ کرک کی طرف مڑ گئے تھے۔

"لندن میں بتاؤ کہ کوئین آ رہا ہے اور انہیں بتاؤ کہ ہم سب بھی یہی چاہتے ہیں مسٹر کوئین کو نئے کپڑے دو اور کوئین تم نیچے بنے ہوئے غسل خانے میں فریش ہونے کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔" اوڈیل نے کوئین سے کہا۔

"میں لندن کال کر کے معاملات سمجھاتا ہوں۔" اوڈیل نے کہا پھر وہ فلپ کی طرف مڑے۔

"لندن تک جانے کا اس وقت تیز ترین کیا ذریعہ دستیاب ہے۔"

"تین گھنٹے میں ایک کانکرڈ طیارہ ڈلاس کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔" فلپ کرک نے کہا۔

"ٹھیک ہے اس میں کوئین کے لیے جگہ رکھواؤ۔" اوڈیل نے کہا پھر وہ اپنی سیٹ سے اٹھ گیا تھا اور اس کے ساتھ باقی کمیٹی ممبرز بھی اٹھ گئے تھے۔

کیبنٹ روم سے نکلنے کے صرف ایک گھنٹے بعد ہی کوئین ایکسی کیوٹیو مینشن میں دوسری منزل پر واقع اسٹڈی روم میں پہنچ گیا تھا اوڈیل خود اس کے ساتھ وہاں تک آیا تھا اور اسٹڈی روم میں اسے چھوڑنے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔

صدر کارمک سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے سے تھکن نمایاں تھی انہوں نے سر کے اشارے سے کوئین کو بیٹھنے کے لیے کہا تھا پھر انہوں نے کچھ بولنا چاہا تھا کہ کوئین ان سے پہلے بول پڑا۔

"مسز کارمک کہاں ہیں۔" اس نے کہا اس نے جان بوجھ کر خاتون اول کا لفظ ادا نہیں کیا تھا صرف مسز کارمک کہا تھا یعنی کارمک کی بیوی۔" صدر کارمک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"اوہ، وہ سو رہی ہے، یہ اس کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ وہ خود کو اس صدمے سے نکال نہیں سکی ہے۔" صدر کارمک کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

"کیا تم اس قسم کے معاملات سے پہلے بھی گزرے ہو؟" کچھ دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

"بہت بار جناب۔"

"ٹھیک ہے دیکھو تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے سامنے صرف ایک شخص ہے ایک بہت فکر مند اور پریشان شخص۔" انہوں نے کہا۔

"جی جناب میں سمجھتا ہوں۔" کوئین نے کہا۔

"آپ مجھے سائمن کے بارے میں بتائیں۔"

"سائمن کے بارے میں تم کیا جاننا چاہتے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"وہ کیسا ہے اور اس معاملے میں اس نے کس طرح ردعمل کا اظہار کیا ہوگا اور آپ کی زندگی میں وہ اتنا تاخیر سے کیوں آیا؟" کوئین نے پوچھا تو صدر کارمک اسے حیرت سے دیکھنے لگے وائٹ ہاؤس میں کسی کی جرات نہیں تھی کہ ان سے اس طرح پوچھ سکے وہ میز کے دوسری طرف دیوار کو گھورنے لگے۔

"تاخیر سے۔" انہوں نے دہرایا۔

"میں نہیں جانتا، جب میری شادی ہوئی تو میں تیس سال کا تھا اور مائرہ اکیس کی تھی پھر دس سال بعد سائمن پیدا ہوا اس وقت میں چالیس کا اور مائرہ اکتیس سال کی تھی اور یہ ہمارا اکلوتا بیٹا ہے اور کوئی اولاد نہیں۔"

"آپ اس سے بہت زیادہ پیار کرتے ہیں نا۔" کوئین نے پوچھا اور صدر کارمک اپنی سیٹ سے اٹھ کر

کوئین کے قریب کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔
''مسٹر کوئین وہ میرا چاند ہے میرا سورج ہے، ہم دونوں اسے بہت پیار کرتے ہیں خدا کے لیے تم اسے ہمارے لیے واپس لے آؤ۔'' انہوں نے کہا۔
''مجھے اس کے بچپن کے بارے میں بتائیں، جب وہ بہت چھوٹا تھا۔'' کوئین نے کہا۔
''میرے پاس اس کے بچپن کی تصویر ہے۔'' کارمک نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا پھر اسٹڈی روم میں موجود ایک کیبنٹ کھول کر ایک تصویر نکالی تھی اور کوئین کو دی تھی اس میں موجود بچہ چار یا پانچ سال کا تھا اس نے تیراکی کا بچوں کا لباس پہنا ہوا تھا اور وہ سمندر کے کنارے پر تھا اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ایک بالٹی اور بیلچہ تھا صدر کارمک کوئین کو بغور دیکھ رہے تھے۔
''یہ تصویر سن 75ء کی ہے تب میں نیو ہیون کے علاقے سے کانگریس کے ممبر کے طور پر منتخب ہوا تھا۔'' انہوں نے کہا۔
''مجھے ان دنوں کے بارے میں بتائیں۔'' کوئین نے کہا پھر صدر کارمک اس کے ساتھ ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے تھے یوں لگ رہا تھا کہ اس سے باتیں کرنے سے وہ پرسکون ہوتے جارہے ہیں جب کوئین ان سے رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہوا تو صدر کارمک نے ایک پیپر پر ایک نمبر لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔
''یہ میرا پرائیویٹ نمبر ہے...... یہ کم ہی لوگوں کے پاس ہے اس پر تم دن ہو یا رات ہر وقت براہ راست بات کرسکتے ہو۔'' انہوں نے کہا اور پھر کوئین نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔
''خدا حافظ مسٹر کوئین خدا تمہارے ساتھ دے۔'' انہوں نے دعا دی وہ اپنے جذبات قابو میں رکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ کوئین نے اثبات میں سر ہلایا اور تیزی سے ان کے کمرے سے نکل گیا۔
وہ اس قسم کے تاثرات پہلے بھی کئی چہروں پر دیکھ چکا تھا۔
جس وقت کوئین صدر کارمک سے مل رہا تھا، اس وقت امریکا اور برطانیہ دونوں جگہ انٹیلی جنس اداروں کے سربراہ یہ فیصلہ کررہے تھے کہ وہ کوئین کے کام کی نگرانی کے لیے ٹیم بنائیں۔ کوئین کی ناکامی کی صورت میں معاملات کو سنبھال لے۔ وہ کسی بھی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا اس صورت حال سے برطانیہ میں سر ہیری میرت اور امریکا میں نائب صدر اوڈیل واقف تھے۔
ایک سیکرٹ سروس ایجنٹ نے کوئین کو ائرپورٹ سے کانکرڈ میں سوار کروایا تھا۔ اس سے پہلے ہی ائرپورٹ کی ڈیوٹی فری شاپ سے کوئین نے کچھ سامان کی خریداری کی تھی اور رقم کی ادائیگی سیکرٹ سروس ایجنٹ سے کرائی تھی۔
جہاز میں اس کے سامنے والی سیٹ پر ایک خاتون آ کر بیٹھی تھی اس کے بال سنہرے اور چمکدار تھے اس کی عمر پینتیس سال کے قریب تھی چہرے پر قدرے کرختگی تھی۔ اس نے کوٹ اور پتلون پہنا ہوا تھا اور اس کے کوٹ میں شناختی کارڈ رکھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ کوئین کی چھٹی حس چونکنا ہوگئی۔ وہ سامنے بیٹھی خاتون کی طرف جھکا۔
''تمہارا تعلق کس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔'' اس نے پوچھا اور وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
''میں کچھ نہیں۔'' اس نے کہا لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ یہ ہونا ہی تھا دیر بدیر یہ راز فاش ہونا ہی تھا۔
''میں معافی چاہتی ہوں، مسٹر کوئین میرا نام سمرویل ہے ایجنٹ سیم سمرویل مجھے کہا گیا ہے

کہ......!"

"ٹھیک ہے۔" کوئین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مس سمرویل میں جانتا ہوں کہ آپ سے کہا گیا ہوگا۔" کوئین نے کہا۔

سیکرٹ سروس ایجنٹ نیگل کرامر اس کیس کی تحقیقات میں مصروف تھا اسے اندازہ تھا کہ اصل اغوا کرنے والے خاموش ہیں اور وہ حکام بالا کا امتحان لے رہے ہیں وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ حکومت کیا اقدامات کرتی ہے کرمنل انٹیلی جنس برانچ کی بہترین افراد کی ایک ٹیم بنادی گئی تھی جو اپنا کام کررہی تھی سب کو ہی یہ انتظار تھا کہ اغوا کرنے والے کب رابطہ کرتے ہیں۔

نیگل کرامر اپنے آفس میں ٹہل رہا تھا اس نے آفس کی کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں وکٹوریہ اسٹریٹ پر مختلف اخباروں اور ٹی وی کے نمائندے کھڑے تھے جنہیں انتظار تھا کہ کوئی خبر انہیں ملے ان کی وجہ سے کرامر بھی جب ادھر سے گزرتا تو اپنی کار کے شیشے چڑھا کر گزرتا تھا تاکہ وہ اس سے کچھ نہ پوچھ سکیں اس کے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس نے اپنی کھڑکی کی طرف دیکھا اسے کوئین کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر چند گھنٹوں تک اغوا کرنے والوں سے ان کا رابطہ نہیں ہوا تو کوئین آکر سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لے گا اور نیگل کرامر نے اب تک جو محنت کی ہے اس پر پانی پھر جائے گا اور پھر اسے کوئین کی سربراہی میں کام کرنا ہوگا اس کا حکم ماننا ہوگا اور اسے یہ ہرگز پسند نہیں تھا۔ اس نے سی آئی اے کی دی ہوئی کوئین کی فائل بھی پڑھی تھی اور اسے کوئین کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوگیا تھا۔

کوئین لندن پہنچنے کے بعد سمرویل اور میکرا کے ساتھ Arrival ایریا کی طرف بڑھ گیا تھا میکرا اس سفر میں سمرویل کے ساتھ تھا اور ان دونوں کو کوئین کے ساتھ بھیجا گیا تھا کوئین سے ان کی موجودگی کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن جہاز ہی میں کوئین نے ان کی شناخت کرلی تھی۔

"مسٹر کوئین۔" راستے میں کھڑے ایک شخص نے اسے آواز دی تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہمیں آپ کا انتظار تھا جناب آپ میرے ساتھ آئیں میرے ساتھی آپ کا سامان لے آئیں گے۔" اس نے کہا۔

کوئین نے ائرپورٹ آفس سے خود کو اور اپنے ساتھیوں کو کلیئر کرایا اور پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گیا جہاں ایک کار اس کا انتظار کررہی تھی کوئین اپنے ساتھیوں سمیت اس میں بیٹھ گیا۔

"ہم آپ کو وی آئی پی رہائشگاہ لے جائیں گے جہاں امریکن سفارت خانے کے نمائندے برطانوی نمائندے اسکاٹ لینڈ یارڈ، سی آئی اے، ایف بی آئی آپ کے ساتھ ہوں گے جو آپ کی مدد کریں گے۔"

کوئین نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا بیس منٹ میں ان کی کار ایک شاندار عمارت کے سامنے پہنچی تھی تو کوئین نے بے ساختہ چیخ کر کہا۔

"کار روک دو۔" اور ڈرائیور نے بادل ناخواستہ کار روک دی کوئین کار سے نکلا اس نے اپنا اٹیچی کیس اٹھایا اور ڈرائیور کی طرف مڑا۔

"ہم کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

"ون فیلڈ ہاؤس میں جناب۔" جواب دیا گیا۔

"یہاں آپ کا انتظار ہورہا ہے آپ کی رہائش کا انتظام یہاں کیا گیا ہے۔"

''اسے کینسل کردو۔'' کوئین نے کہا اور عمارت کے بیرونی گیٹ کی طرف چل دیا۔

''آپ کہاں جارہے ہیں۔ مسٹر کوئین۔''

''واپس اسپین۔'' کوئین نے جواب دیا۔ تب ہی اس کے پیچھے آنے والی کار سے ایک شخص اتر کر اس کی طرف آیا وہ فون پر کسی سے بات بھی کررہا تھا۔

''اس گدھے کو جو بھی چاہیے اسے دو۔'' دوسری طرف سے کہا تھا۔

''جناب اگر آپ کو یہ جگہ پسند نہیں ہے تو ایک اور اپارٹمنٹ ہے، بہت پرائیویٹ ہے اور خاص شخصیات کے لیے ہے۔''

''ایڈریس۔'' کوئین نے کہا اور اس شخص نے ایک کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا کوئین اثبات میں سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا پھر اس سڑک پر پہنچ کر ایک ٹیکسی کو روکا تھا اور اسے کچھ ہدایات دیں چند ہی لمحوں میں ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی اور دوسری کار میں اس کے پیچھے آنے والے لوگ کھڑے اسے دیکھتے رہ گئے تھے جس میں سمرویل اور میکرا بھی شامل تھے۔

کوئین کین سنگٹنس کے علاقے میں واقع ایک اپارٹمنٹ کے سامنے ٹیکسی سے اترا تھا اور مطلوبہ نمبر کے فلیٹ پر پہنچا تھا جو تیسری منزل پر واقع تھا ملازم نے دروازہ کھولا تھا۔

''تم کون ہو؟'' ملازم نے پوچھا۔

''میں آگیا ہوں، تم جاؤ۔'' کوئین نے کہا اور فلیٹ میں داخل ہوگیا پھر اس نے فلیٹ کا جائزہ لینا شروع کردیا تھا۔

فلیٹ ایک بڑے ڈرائنگ روم ایک سٹنگ روم اور دو چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا کوئین نے بڑا کمرہ اپنے لیے پسند کیا تھا اس کے یہاں پہنچنے کے تین منٹ بعد اس کے پیچھے سمرویل، میکرا، کولن (اسپیشل پولیس آفیسر) اور سیمور بھی پہنچ گئے تھے۔

''یہ دونوں میرے ساتھ رہیں گے۔'' کوئین نے سمرویل اور میکرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو کوئین، بچوں جیسی باتیں مت کرو یہ صدر کے بیٹے کا معاملہ ہے ہمیں ہر قیمت پر اسے بازیاب کرانا ہے۔ کوئی غلطی برداشت نہیں کی جائے گی ہر کوئی باخبر رہنا چاہتا ہے کہ اس سلسلے میں کیا کارروائی ہورہی ہے اور کیسے ہورہی ہے یہ ناممکن ہے کہ ان کے اطمینان کے لیے انہیں کچھ نہ بتایا جائے۔'' کولن نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' کوئین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''تم دونوں اس سلسلے میں کیا کرسکتے ہو۔'' اس نے پوچھا۔

''میں آپ کے لیے کارآمد ہوسکتا ہوں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں لاکر دے سکتا ہوں۔'' میکرا نے کہا۔

''اور میں بہت اچھا کھانا بنانا جانتی ہوں اور آپ کو اپنے اسٹاف کے لیے یہاں کھانا پکانے والے کی ضرورت تو ہوگی۔'' سمرویل نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' کوئین نے کہا اور پھر کولن اور سمور کی طرف مڑ گیا۔

''تم لوگ سارے کمروں میں سننے والے آلات اور فون کا سسٹم لگادو اور جو دو کمرے باقی رہ گئے ہیں ان میں تم رہ سکتے ہو اور کولن اور سمور نیچے کے ہال میں رہیں گے لیکن اس کے علاوہ مجھے کوئی مہمان نہیں چاہیے اور مجھے برطانوی پولیس سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ویسے انچارج کون ہے۔''

''ڈینگل کرامر۔'' کولن نے جواب دیا اسی وقت فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف ڈینگل کرامر ہی تھا کولن

کچھ دیر تک بات سنتا رہا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کوئین کی طرف مڑا۔

"کرامر ہے وہ ون فیلڈ ہاؤس سے بول رہا ہے وہ تم سے ملنے وہاں گیا تھا تو پتا چلا کہ تم وہاں نہیں ہو وہ یہاں آنا چاہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" کوئین نے کہا۔

پھر بیس منٹ کے بعد ایک سادہ کار میں کرامر وہاں پہنچ گیا تھا کوئین نے سٹنگ روم میں اس سے ملاقات کی تھی پورے فلیٹ میں سننے والے آلات لگے ہوئے تھے اور ان کی گفتگو سنی جا رہی تھی وہ پہلے بھی ایسے حالات میں کام کر چکے تھے کرامر کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ امریکی ریاست میں موجود ہو اور ان کے درمیان رہ کر کام کر رہا ہو وہ بہت محتاط انداز میں بات کر رہا تھا۔

"مجھے کہا گیا ہے کہ آپ کو جو مدد بھی چاہیے میں آپ کو فراہم کروں میری حکومت ہر طرح آپ کی مدد کو تیار ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔" کرامر نے کہا۔

"میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار رہوں گا۔" کوئین نے کہا۔

"آپ دراصل کیا چاہتے ہیں؟" کرامر نے پوچھا۔

"اس کیس پر کوئی نئی معلومات اگر ہوئی ہیں تو میں جاننا چاہتا ہوں۔" کوئین نے کہا۔

"کیا ابھی تک اغوا کاروں نے کوئی رابطہ کیا؟" کوئین نے پوچھا۔

"نہیں ابھی نہیں۔" کرامر نے کہا "کچھ کالیں وصول ہوئی ہیں لیکن وہ جعلی ہیں جب تک ہمیں یہ نہ پتا چل جائے کہ ان کے پاس سائمن کا رمک ہے ان سے بات نہیں ہو سکی۔" کرامر نے کہا۔

"یہ کیسے پتا چلے گا؟" کوئین نے پوچھا۔

"سائمن کے بارے میں کچھ ذاتی سوالات جو سائمن ہی جانتا ہو ابھی تک کسی نے درست جواب نہیں دیا۔"

"اگر انہوں نے فون پر رابطہ کیا تو آپ اسے کس طرح ہینڈل کریں گے مسٹر کوئین؟" کرامر نے پوچھا۔

"رات دس بجے کی خبروں میں ایک پبلک اناؤنسمنٹ کرا دیں کہ جس کسی کے پاس بھی سائمن کا رمک ہے وہ امریکن سفارت خانے سے رابطہ کرے پھر امریکی سفارتخانے کے نمبر دیے جائیں۔ امریکی سفارت خانے کے تہہ خانے میں سوئچ بورڈ کی ایک لائن ہوگی جوان کالز کو چیک کرے گی اور درست کال کو اس اپارٹمنٹ میں منتقل کر دے گی۔" کوئین نے کہا۔

"تمہارے ٹیلی کام کے لوگ ہر کال کو ٹریس کر سکتے ہیں جو بھی سفارت خانے میں آئے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" کرامر نے کہا پھر وہ واپسی کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔

"چلو، میں تمہیں کار تک چھوڑ آؤں۔" کوئین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اسے کچھ باتیں کرامر سے کرنا تھیں جو وہ کمرے میں لگے تکنیکی آلات کی موجودگی میں نہیں کر سکتا تھا اور فلیٹ کے باہر سیڑھیوں پر کوئی آلات نہیں تھے۔

"میں جانتا ہوں جس طرح یہ سب ہو رہا ہے تمہیں پسند نہیں آئے گا میں بھی اس صورت حال سے خوش نہیں ہوں۔" کوئین نے کرامر کے ساتھ فلیٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

"تمہیں فون پر سب کچھ سنائی دے گا اور میرے لوگ بھی سب سن رہے ہوں گے یہ سسٹم بالکل ریڈیو

کی نشریات کی طرح کام کرے گا لیکن صرف وہاں جہاں یہ نصب ہوگا۔'' کوئین نے کہا۔

''ٹھیک ہے تمہیں جو چاہیے مل جائے گا۔'' کرامر نے کہا۔

''ایک آخری بات۔'' کوئین چلتے چلتے ٹھہر گیا۔

''انہیں پکڑنے کی کوشش مت کرنا اگر وہ فون کریں یا اگر لائن پر کچھ دیر زیادہ باتیں کریں کوئی پولیس کی کار سے سائرن بجاتی ہوئی ٹیلی فون بوتھ کی طرف نہیں دوڑے گی۔''

''میں جانتا ہوں مسٹر کوئین لیکن ہم سادہ کپڑوں میں پولیس کے افراد کی ڈیوٹیاں لگائیں گے جو فون کال کے ذریعے کا پتا لگائیں گے۔''

''کوئی احمقانہ حرکت مت کرنا۔'' کوئین نے کہا۔

''جو کوئی بھی فون بوتھ میں موجود ہوگا وہ بھی انڈر پریشر ہوگا اور ہم دونوں میں سے کوئی نہیں چاہے گا کہ مجرموں سے رابطہ ٹوٹ جائے اگر ایسا ہوا تو وہ گھبرا کر بھاگ سکتے ہیں اور بھاگتے ہوئے وہ اپنے پیچھے ایک لاش چھوڑ جائیں گے۔'' کوئین کی بات پر کرامر نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور رخصت ہو گیا تھا۔

پھر ایک ہی گھنٹے میں کوئین کا مطلوبہ نظام پورے فلیٹ میں لگا دیا گیا تھا رات ساڑھے نو بجے تک کوئین کو اس کی فلیش لائٹ مل گئی تھی۔ اس لائن پر وہ بغیر کسی کی مداخلت کے اغوا کرنے والوں سے بات کر سکتا تھا دوسری لائن امریکی سفارت خانے کے سوئچ بورڈ کے ساتھ رابطے میں تھی اور تیسری لائن باقی کالیں آنے کے لیے چھوڑ دی گئی تھی۔

رات دس بجے کی خبروں میں اغوا کاروں کے لیے ایک اعلان شامل کر دیا گیا تھا اور سائمن کارمک کے اغوا کے واقعے کی تفصیلات کے دوران اسکرین پر چند فون نمبر آتے رہے تھے جن پر حکام سے رابطے کیا جا سکتا تھا۔

⁂ ☆☆ ⁂

لندن سے چالیس میل دور چار خاموش اور پریشان افراد یہ نشریات دیکھ رہے تھے وہ ایک چھوٹے سے گھر میں موجود تھے ان کا لیڈر ان نشریات کی تفصیلات کو بڑی تیزی سے اپنے دو ساتھیوں کے لیے فرانسیسی میں ترجمہ کر رہا تھا ان کا ایک ساتھی بیلجیئن تھا اور انگلش جانتا تھا اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو ان کا لیڈر اکیلا ہی باہر جاتا تھا اور باہر جاتے ہوئے وہ اپنی نقلی مونچھیں داڑھی لگانا نہیں بھولتا تھا اس کی آنکھوں پر سیاہ عینک بھی ہوتی تھی اور اس کے باقی تینوں ساتھیوں کے لیے سخت احکامات تھے کہ وہ کھڑکیوں قریب بھی نظر نہیں آئیں گے اور نہ ہی گھر سے باہر جانے کی کوشش کریں گے۔

خبریں ختم ہونے کے بعد اس کے یورپین ساتھیوں میں سے ایک نے فرانسیسی میں کچھ کہا جس پر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کل صبح دیکھیں گے۔'' اس نے کہا۔

اس رات امریکن سفارت خانے میں دو سو کالیں وصول ہوئی تھیں جنہیں احتیاط سے چیک کرنے کے بعد صرف سات کالیں کوئین کو دی گئیں جنہیں کوئین نے بہت خوشگوار انداز میں ریسیو کیا اور ہر کسی سے ایک سادہ سا سوال کیا جو سائمن کارمک کے بارے میں تھا تاکہ صحیح جواب دینے والے پر نظر رکھ سکے کیونکہ صحیح جواب وہی دے سکتا تھا جس کے پاس سائمن کارمک ہو لیکن کسی کال کرنے والے نے دوبارہ کال نہیں کی کوئین ساری رات جاگتا رہا اور سمر ویل اور سمور اس کے ساتھ موجود رہے۔

⁂ ☆☆ ⁂

سائمن کارمک کو اغوا ہوئے اڑتالیس گھنٹے ہو چکے

تھے اور اس کے کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی سائمن جس کمرے میں بند تھا وہاں روشنی مناسب نہیں تھی جب اسے وہاں لایا گیا اس کے چند گھنٹے کے بعد اس کے کمرے کے دروازے پر تین دستکیں سنائی دی تھیں اور ایک کرخت آواز سنائی دی تھی۔

''اپنے سر پر غلاف پہن لو۔'' اس سے کہا گیا چنانچہ اس نے سر پر غلاف پہن لیا تھا پھر اسے محسوس ہوا تھا کہ کوئی اس کے کمرے میں آیا تھا اس کے جانے کے بعد پھر دروازے پر دو دستک ہوئی تھیں اور کہا گیا تھا کہ غلاف اتار دو اس نے غلاف اتار دیا تھا اس کے سامنے ٹرے میں کھانا رکھا تھا جو اس نے فوراً ہی کھا لیا تھا اس نے اغوا کیے جانے کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا اسے کھانا دیا گیا تھا لیکن اس نے غصے میں واپس کر دیا تھا پھر اسے ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب بھی دروازے پر تین دستکیں ہوں وہ سر پر غلاف پہن لے اور دو دستکیں ہوں تو وہ غلاف اتار دے اسے اغوا کرنے والے بہت احتیاط کر رہے تھے، اس نے ان میں سے کسی کی شکل نہیں دیکھی تھی جب اسے اغوا کیا گیا تھا تب بھی اس کے سر پر کوئی چیز مار کر اسے بے ہوش کر دیا گیا تھا اور وہ ان کے چہرے نہیں دیکھ سکا تھا۔

ان اڑتالیس گھنٹوں میں وہ بند کمرے میں پڑا اپنے والدین کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اب تک اس کے اغوا کی خبر انہیں ہو گئی ہو گی اور وہ بہت پریشان ہوں گے۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کی والدہ اس سے کتنی محبت کرتی ہیں وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ڈھونڈنے کے لیے اب تک کوئی نہ کوئی کارروائی شروع کر دی گئی ہو گی۔

☆☆

صبح کے نو بجے ایک کال کوئین کے لیے موصول ہوئی۔

''مجھے Negotiator سے بات کراؤ۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''میں آپ کی بات کراتی ہوں جناب۔'' آپریٹر نے کہا اور کال کوئین سے ملائی۔

''کوئی ثالث سے بات کرنا چاہتا ہے جناب۔'' اور صرف آدھے سیکنڈ بعد کوئین بات کر رہا تھا۔

''ہیلو دوست تم مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو؟'' کوئین نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں سائمن کا رمک واپس چاہیے تو تمہیں اس کی قیمت ادا کرنا ہو گی بہت زیادہ میری بات سنو۔''

''نہیں دوست تم میری بات سنو۔'' کوئین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اب تک بہت سی جعلی کالیں موصول ہوئی ہیں تم سمجھ سکتے ہو اس دنیا میں احمقوں کی کمی نہیں ہے۔ چنانچہ تم مجھے ایک رعایت دو میرے ایک سادہ سے سوال کا جواب دو۔'' کوئین نے کہا پھر اسے سوال پوچھنے میں چند لمحے لگے اور ان چند لمحوں میں یہ پتا لگا لیا گیا تھا کہ کال اس شہر کے کس پبلک کال بوتھ سے کی جا رہی تھی پھر پولیس کی گاڑیاں بھی روانہ ہو گئی تھیں یہ سب 141 سیکنڈ میں ہوا تھا لیکن جب گاڑیاں مطلوبہ پبلک فون بوتھ تک پہنچی تو وہ خالی تھا انہیں دیر ہو گئی تھی کال کرنے والے نے صرف تین سیکنڈ بات کی تھی اور پھر ریسیور رکھ کر تین سڑک پار چلنے والے ہجوم میں غائب ہو گیا تھا۔

''تم نے اسے جانے دیا۔'' سمرویل نے کہا۔

''مجبوری ہے ہمیں اس کے حساب سے چلنا ہو گا۔'' کوئین نے جواب دیا۔

''اگر تم اسے تھوڑی دیر اور لائن پر مصروف رکھتے تو پولیس اس تک پہنچ جاتی۔'' میکرا نے کہا۔

قرآنی آیات کی عام فہم تفاسیر جنھیں

مشتاق احمد قریشی

نے مستند تفاسیر اور حوالوں سے آراستہ کیا ہے

کتاب کا نام	
تفسیر سورۃ اخلاص	تفسیر آیات ربنا اتنا
تفسیر معاذ اللہ	تفسیر سورۃ النصر
تفسیر سورۃ العصر	تفسیر سورۃ الھب
تفسیر سورۃ الکفرون	تفسیر آیات اللہ ذوالجلال
تفسیر سورۃ الفاتحہ	تفسیر سورۃ الشمس
تفسیر سورۃ کلمہ طیبہ	تفسیر سورۃ القریش
تفسیر سورۃ معوذتین	لقد خلقنا الانسان
تفسیر سورۃ الکوثر	تفسیر سورۃ القدر
تفسیر آیات السلام علیکم	آسمانی صحیفے اور قرآن
تفسیر آیات یایھا الذین امنو	تفسیر سورۃ الماعون
امام اعظم حیات وفقہی کارنامے	

ملنے کا پتا: نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز۔ 7 فرید چیمبر عبداللہ ہارون روڈ کراچی

اسلامی کتب خانہ۔ فضل الٰہی مارکیٹ چوک اردو بازار، لاہور

''تم انہیں کیا احمق سمجھتے ہو کیا وہ یہ بات نہیں جانتے کہ انہیں کال پر مصروف رکھ کر ہم ان تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔'' کوئین نے غصے سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ پر اعتماد کریں میں انہیں خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا۔'' کوئین نے کہا۔

''تم نے اس سے کتاب کے بارے میں کیوں پوچھا۔'' سمرویل نے پوچھا۔

''اس لیے کہ سائمن کارمک ہی جانتا ہے کہ بچپن میں وہ کونسی کتاب شوق سے پڑھتا تھا۔ یہ جواب صحیح صرف سائمن ہی دے سکتا ہے۔ اگر انہوں نے صحیح جواب دے دیا تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ سائمن ان کے پاس ہے پھر ان سے سودا کیا جا سکتا ہے۔'' کوئین نے کہا اور سمرویل نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆

سائمن کارمک کے قید خانے کے دروازے پر تین دستکیں ہوئی تھیں اور اس نے سر پر غلاف پہن لیا تھا اور جب اس نے وہ غلاف اتارا تھا تو کمرے کے دروازے کے قریب ایک کارڈ رکھا تھا اس وقت رات کے سوا دس بجے تھے۔

''جب تم بچے تھے اور چھٹیوں پر فن ٹکٹ کے علاقے میں رہ رہے تھے تو تمہاری آنٹی ایملی تمہیں کون سی کہانی کی کتاب سناتی تھیں۔''

سائمن حیرت سے کارڈ کو دیکھ رہا تھا اور خوشی کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ کسی نے ضرور واشنگٹن میں اس کے والد سے ملاقات کی ہے اور اب اس نے اغوا کاروں سے رابطہ کیا ہے کوئی اسے رہا کرانے کی کوشش کر رہا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے جنہیں اس نے ہاتھ کی ہتھیلی سے ہی صاف کر لیا کیونکہ اس کے پاس کوئی رومال نہیں تھا لیکن آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے اسے احساس ہوا جیسے کوئی دروازے پر ہے۔ پیپ ہول سے جھانک رہا ہے وہ پھر آنٹی ایملی کے بارے میں سوچنے لگا وہ اس کے والد کی بڑی بہن تھیں وہ اکثر اسے ساحل سمندر پر چہل قدمی کے لیے لے جاتی تھیں اور انہیں جانوروں کی ایسی کہانیاں سناتی تھیں جن میں وہ انسانوں کی طرح باتیں کرتے تھے اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور زور سے چیخا۔ اس نے سوال کا جواب دے دیا تھا' پھر دروازے میں تھوڑی سی جھری ہوئی اور سیاہ دستانہ پہنا ایک ہاتھ اندر آیا اور کارڈ باہر لے گیا پھر دروازہ بند ہو گیا تھا۔

☆☆

ٹھیک رات ڈیڑھ بجے پھر کوئین کے لیے کال آئی تھی جسے گیارہ سیکنڈ میں ٹریس کر لیا گیا تھا یہ برمنگھم شائر کے شاپنگ مال ملٹن کے قریب فون بوتھ سے کی گئی تھی اتنے سے وقت میں سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک شخص وہاں پہنچ چکا تھا لیکن بوتھ خالی تھا کیونکہ کال کرنے والے نے صرف ۹ سیکنڈ بات کی تھی اور کال کاٹ کر وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔

''کتاب کا نام windofthewilows ہے۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے دوست میں سمجھ گیا کہ تم ہی صحیح آدمی ہو اور سائمن تمہارے پاس ہے اب یہ نمبر لو اس لائن کو آف کر دو اور مجھ سے کسی اور بوتھ سے بات کرو اس نمبر سے صرف تم مجھے بات کر سکتے ہو میرے ساتھ رابطے میں رہنا۔'' کوئین نے کہا اور لائن کاٹ دی۔ پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بولنے لگا۔

''کرامر، تم واشنگٹن کو بتا سکتے ہو کہ ہمیں مطلوبہ آدمی مل گیا ہے۔ سائمن زندہ ہے اور وہ لوگ بات کرنا چاہتے ہیں۔'' کوئین نے کہا اور اس کی آواز امریکی سفارت خانے میں موجود لوگوں نے سنی۔ اس کی وجہ

کوئین کے کمرے میں لگے حساس آلات تھے جو اس کی سانسوں کی آواز تک وہاں پہنچا رہے تھے۔
کوئین کی بات سننے کے بعد کرامر نے لائن پر امریکا میں اوڈیل سے بات کر کے اسے صورت حال بتائی تھی اور اوڈیل نے صدر کارمک کو آگاہ کر دیا تھا کچھ ہی دیر بعد ایک گونج دار آواز فون پر سنائی دی تھی۔
''ہمارا تعلق لبریشن آرمی سے ہے اور سائمن کارمک ہمارے پاس ہے اور جب تک آزاد نہیں ہوگا جب تک امریکا اپنے تمام نیوکلیئر ہتھیار ضائع نہیں کر دیتا۔''
''اوہ کوئین تم نے کر دکھایا انہوں نے خود کو ظاہر کر دیا۔'' سمرویل نے کہا۔
''لیکن یہ لوگ خطرناک ہیں یہ سائمن کو مار بھی سکتے ہیں یہ پہلے ہی دو سیکرٹ ایجنٹ اور ایک پولیس اہلکار کو مار چکے ہیں۔'' میکرا نے کہا۔
''لیکن میں جو بہتر سمجھتا ہوں وہ کروں گا۔'' کوئین نے کہا۔
''مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ سیاسی دہشت گرد نہیں ہیں اور میری دعا ہے یہ صرف پیشہ ور قاتل ہی ہوں۔'' کوئین نے کہا تو میکرے اور سمرویل اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔
''تم ان کے پیشہ ور قاتل ہونے کی دعا مانگ رہے ہو اس میں ایسی کیا خاص بات ہے۔'' سمرویل نے پوچھا۔
''اس میں خاص بات یہ ہے کہ پیشہ ور قاتل صرف پیسوں کے لیے قتل کرتا ہے اور اسے ابھی پیسے نہیں ملے ہیں اسے ملنے کی امید ہے چنانچہ وہ ابھی قتل بھی نہیں کرے گا۔'' کوئین نے یقین سے کہا۔
پھر اس شام چھ بجے تک اغوا کاروں نے فون نہیں کیا تھا کوئین بہت پرسکون انداز میں اپنے بیڈ پر لیٹا ایک کتاب پڑھ رہا تھا جبکہ برطانوی پولیس نے سارے علاقے کے فون بوتھ چھان مارے تھے تاکہ انہیں وہاں کوئی فنگر پرنٹ یا کوئی اور نشانی مل جائے جس سے مجرموں تک پہنچا جا سکے لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔
چھ بج کر پانچ منٹ پر کوئین کے فون کی گھنٹی بجی تھی لیکن اس نے ریسیور اٹھانے میں کسی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا چوتھی گھنٹی بجنے پر اس نے ریسیور اٹھایا تھا۔
''ہیلو، خوشی ہوئی تم نے کال کی۔'' کوئین نے کہا۔
''تم۔'' وہی گمبھیر گرجدار آواز سنائی دی۔
''ہاں بات کرو۔'' کوئین نے کہا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسری طرف سے بولنے والے نے ماؤتھ پیس پر کئی ٹشو پیپر رکھے ہوئے ہیں تاکہ اس کی آواز بدل جائے اور کوئی شناخت نہ کر سکے۔
''تم مجھ سے بات کر سکتے ہو، میرا نام کوئین ہے کیا تم مجھے کوئی نام بتاؤ گے۔''
''نہیں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔
''اوہ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ تم اپنا اصل نام نہیں بتاؤ گے لیکن صرف بات کرنے کے لیے میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟'' کوئین نے کہا۔
''دیکھو تم چاہتے ہو کہ سائمن کارمک تمہیں زندہ واپس ملے تو اس کے لیے تمہیں قیمت ادا کرنا ہوگی۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔
''ہاں ٹھیک ہے لیکن تم کوئی نام تو بتاؤ میں کس نام سے بات کروں۔'' کوئین نے کہا۔
''تم مجھے zack کہہ سکتے ہو۔''
''ٹھیک ہے زیک سنو تم یہ کالیں بیس سیکنڈ صرف بیس سیکنڈ سے زیادہ نہیں کرتے ہو، میں کوئی جادوگر تو

نہیں جو اتنی سی دیر میں ساری باتیں کرلوں، تم مجھے کچھ گھنٹوں کے بعد کال کرنا ہماری کالیں سنی جارہی ہیں اور ٹریس بھی کی جارہی ہیں، ہم پھر بات کریں گے۔" کوئین نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" زیک نے جواب دیا اور کال کاٹ دی۔ کوئین نے بھی مسکراتے ہوئے ریسیور رکھ دیا تھا اور امریکی سفارت خانے میں یہ کالیں سننے والا کرامر غصے سے پاگل ہوگیا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کوئین کس کی طرف سے کام کررہا ہے وہ اس کے ساتھ دوستوں جیسا سلوک کر رہا ہے۔ لگتا ہے اس کا ساتھ دے رہا ہو۔" کرامر نے غصے سے چیختے ہوئے کہا اور خود کوئین کے فلیٹ میں موجود سمر ویل اور میکرا بھی اس کی اس حرکت کو نہیں سمجھ سکے تھے انہوں نے بھی کوئین پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی تھی لیکن کوئین نے ان کا جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کی تھی اور پھر کتاب پڑھنے لیٹ گیا تھا اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ کسی طرح اغوا کاروں کے ذہن میں پہنچ جائے اور ان پر اپنا اعتماد بحال کرلے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ زیک کوئی احمق نہیں تھا چنانچہ اگر کوئین نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ کالیں مختصر کرے کیونکہ وہ ٹریس ہورہی ہیں تو یہ بات وہ جانتا بھی ہوگا اس کے بتانے سے کوئین کا نقصان نہیں ہوگا بلکہ کوئین پر زیک کا اعتماد بحال ہوگا پھر زیک نے اگلی صبح تک کوئی کال نہیں کی تھی۔

اگلی صبح پونے نو بجے زیک نے چوتھی کال کی تھی اور بہت مختصر بات کی تھی۔

"کوئین بات کو مختصر کرو مجھے پانچ ملین ڈالر چاہیں جو نوٹوں کی شکل میں ہوں۔"

"زیک...... زیک خدا کے لیے عقل کے ناخن لو تمہیں پتا ہے یہ کتنی بڑی رقم ہے اور اس کا کتنا وزن ہوگا؟" کوئین نے کہا اور زیک کو حیرت ہوئی کہ کوئین رقم کے وزن کی بات کیوں کررہا ہے۔

"دیکھو کوئین میرے ساتھ کوئی چال مت چلنا ورنہ میں تمہیں سائمن کی انگلیاں کاٹ کر بھیج دوں گا۔" زیک نے کہا۔ "تمہارے ساتھ کون ہے؟" زیب نے پوچھا۔

"ایک جاسوس تم کیا سمجھتے ہو انہوں نے مجھے اکیلا چھوڑا ہوگا۔" کوئین نے کہا۔

"میں نے جو کہا وہ کر بھی سکتا ہوں۔" زیک نے پھر دھمکی دی۔

"دیکھو زیک تمہاری اور میری ایک ہی حیثیت ہے ہمارا کام ہے کہ جو ہمیں کرنا ہے وہ کریں میرا کام سائمن کو آزاد کرانا ہے اور تمہارا کام رقم حاصل کرنا ہے اب فون بند کرو کال لمبی ہورہی ہے پھر بات کریں گے۔" کوئین نے کہا۔

"رقم فوراً چاہیے کوئین۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"مجھے سائمن کے والد سے بات کرنا ہوگی تم پھر کال کرنا چوبیں گھنٹے کے بعد سائمن کیسا ہے۔" کوئین نے پوچھا۔

"ابھی تک تو صحیح ہے۔" زیک نے کہا اور فون بند کردیا۔

اس شام کوئین کے اپارٹمنٹ میں ایک میٹنگ ہوئی سب کا خیال تھا کہ زیک اب اگلی صبح تک فون نہیں کرے گا اور امریکیوں کو سوچنے کا موقع دے گا کولن اس میٹنگ میں موجود تھا۔

"تم زیک کو بتا سکتے ہو کہ واشنگٹن اس سودے کے لیے راضی ہے۔" کولن نے کہا "یہ اطلاع بیس منٹ پہلے ہی آئی ہے مجھے خود یہ بات پسند نہیں آئی کہ اتنی آسانی سے حکومت مان گئی فائیو ملین ڈالر ایک

بڑی رقم ہے۔"
کوئین کی بات پر کولن نے اسے حیرت سے دیکھا جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔
"تمہیں یہ بات پسند نہیں ہے کوئین، امریکی حکومت اس سودے پر راضی ہے اور تم راضی نہیں، کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ کیوں؟"
"کیونکہ اغوا کاروں کی پہلی ہی ڈیمانڈ پر فوراً مان جانا بہت خطرناک ہوسکتا ہے۔" کوئین نے کہا۔
"اگر ہم نے اتنی آسانی سے یہ بات مان لی تو وہ سوچیں گے کہ انہیں اس سے زیادہ رقم کا مطالبہ کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے غلطی کردی اور ایسے لوگ نفسیاتی ہوتے ہیں اگر انہیں احساس ہوگیا کہ ان سے غلطی ہوئی ہے تو اپنے اوپر غصہ کی حالت میں وہ یرغمالی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"
"تم سمجھتے ہو کہ زیک نفسیاتی ہے۔" سمرویل نے پوچھا۔
"ہو بھی سکتا ہے۔" کوئین نے کہا۔ "یا ان میں سے کوئی اور ہو۔"
"پھر تمہارا کیا مشورہ ہے۔" کولن نے پوچھا۔
"ابھی تو ابتدا ہے سائمن کارمک کا بغیر کسی نقصان کے آزاد ہوجانا دو چیزوں پر منحصر ہے ایک تو یہ کہ اغوا کاروں کو یقین ہوجائے کہ انہوں نے مناسب رقم مانگی ہے جتنی زیادہ کہ سائمن کی فیملی دے سکتی تھی اور دوسری یہ کہ انہیں وہ رقم تب ہی ملے گی جب وہ سائمن کو زندہ سلامت ہمارے حوالے کردیں گے اور اس نتیجے پر وہ چند سیکنڈ میں نہیں پہنچ سکتے اور اگر کچھ وقت زیادہ مل سکا تو پولیس کے لیے بھی ان تک پہنچنا آسان ہوجائے گا۔" کوئین نے وضاحت کی۔
"میں کوئین کی بات سے متفق ہوں۔" کرامر نے کہا۔
"اس کام میں کچھ ہفتے بھی لگ سکتے ہیں اس میں تاخیر تو ہوگی لیکن ہم سائمن کو زندہ سلامت آزاد کرا سکیں گے۔"
"تو پھر واشنگٹن کو کیا بتایا جائے۔" کولن نے پوچھا۔
"انہیں بتاؤ کہ انہوں نے مجھے سائمن کو واپس لانے کی ذمہ داری دی ہے اور میں وہی کررہا ہوں اگر وہ مجھے اس کیس سے باہر نکالنا چاہتے ہیں تو الگ بات ہے وہ یہ بات صدر کارمک کو بتادیں۔" کوئین نے پرسکون انداز میں کہا۔ اس کی اس بات پر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور میٹنگ ختم ہوگئی تھی۔
اگلی بار جب زیک نے فون کیا تو کوئین بہت ہی معذرت آمیز انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔
"دیکھو زیک میں نے صدر کارمک سے ذاتی طور پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہیں وہ بہت ہی غمگین صورت حال سے گزر رہے ہیں میرا مطلب ہے کہ غم کی وجہ سے وہ بات کرنے سے......!"
"بات مختصر کرو۔" دوسری طرف سے سختی سے کہا گیا۔ "مجھے رقم چاہیے اور بس۔"
"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میں کوشش کررہا ہوں پانچ ملین ڈالر بہت بڑی رقم ہے اور ان کے پاس اتنی رقم کیش کی صورت میں موجود نہیں وہ مختلف ٹرسٹ فنڈز میں لگی ہوئی ہے اور اسے جمع کرنے میں وقت لگے گا کئی ہفتے بھی لگ سکتے ہیں۔ میں تمہیں نو سو ہزار ڈالر دے سکتا ہوں اور یہ رقم جلدی مل سکتی ہے۔"
"مجھے نہیں معلوم مجھے مطلوبہ رقم ہی چاہیے چاہے تم کہیں سے بھی اس کا انتظام کرو میں انتظار کروں گا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔
"ٹھیک ہے لیکن اگر تم کچھ کمی کرسکو تو اچھا ہوگا۔

کیا لڑکا ٹھیک ہے۔'' کوئین نے پوچھا۔
''ہاں۔''
''زیک مجھے ایک سوال کا جواب اور چاہیے کیونکہ میرے سر پر جو لوگ مسلط ہیں وہ مطمئن نہیں ہو رہے یہ بتاؤ کہ دس سال کی عمر میں سائمن کا جو پالتو کتا اس کے پاس تھا اس کا نام کیا تھا۔ اس کے صحیح جواب سے ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ سائمن ٹھیک ہے۔ ہم مطمئن ہو جائیں گے اور تمہارا اس میں کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔'' کوئین نے کہا۔
''ٹھیک ہے اور رقم میں چار ملین ڈالر سے کم نہیں لوں گا بس یہ آخری بات ہے۔'' زیک نے کہا اور فون بند کر دیا۔
''تم آخر کیا کر رہے ہو۔'' سمرویل نے اس سے پوچھا۔
''میں اس پر اپنے انداز سے پریشر ڈال رہا ہوں۔'' کوئین نے جواب دیا۔
کوئین نے دو باتیں زیک کے دماغ میں بٹھا دی تھیں ایک تو یہ کہ کوئین ایک اچھا آدمی ہے اور اپنی سی پوری کوشش کر رہا ہے کہ اچھی ڈیل ہو جائے لیکن اس پر اسٹیبلشمنٹ کا دباؤ ہے اس کے بعد کوئین کی کال دوسرے روز رات کے ساڑھے نو بجے آئی تھی اس بار کوئین نے مزید رقم کم کرنے کی درخواست کی تھی اور چند لمحوں کی گفتگو کے بعد زیک کو دو ملین ڈالر لینے پر رضا مند کر لیا تھا زیک سارے فیصلے اس کے ساتھ بغیر کسی سے مشورے کے فون پر کر رہا تھا اس سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہی ٹیم لیڈر ہے اور اسے یہ فیصلے کرنے کا اختیار ہے۔
''تم گدھے سنو میں اب تمہاری کوئی مجبوری نہیں سنوں گا اور دو ملین ڈالر سے کم پر کوئی بات نہیں ہوگی اب اگر تم نے رقم کم کرنے کا مطالبہ کیا تو اس کے جواب میں تمہیں سائمن کے ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلیاں ملیں گی۔'' زیک نے غراتے ہوئے کہا۔
''زیک میں مجبور ہوں یہ مطالبہ خود نہیں کر رہا ہوں مجھ پر بہت دباؤ ہے۔'' کوئین نے کہا میں نے تم سے پوچھا تھا کہ سائمن کا رمک کے کتے کا نام کیا تھا جو اس نے دس سال کی عمر میں پالا تھا۔'' کوئین نے پوچھا۔
''اس کا نام مسٹر اسپوٹ تھا۔'' زیک نے ناگواری سے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے مجھے اطمینان ہو گیا۔'' کوئین نے کہا۔
''اب میری بات غور سے سنو۔'' زیک نے کہا۔
''مجھے رقم کیش کی صورت میں نہیں چاہیے تم احمق رقم سوٹ کیس میں بھر کر لاؤ گے مجھے رقم ڈائمنڈ کی شکل میں چاہیے وہ چھوٹے سے پیکٹ میں بھی آجائیں گے۔'' زیک نے کہا اور فون بند کر دیا۔
زیک نے اب تک جتنی بھی کالیں کی تھیں وہ سب پبلک فون بوتھ سے کی تھیں لیکن وہ اتنی مہارت سے یہ کام کر رہا تھا کہ ابھی تک اسے پکڑا نہیں جا سکا تھا جب بھی پولیس کال بوتھ کا پتا لگا کر وہاں تک پہنچتی تھی۔ زیک غائب ہو چکا ہوتا تھا۔ اس کی کال چند سیکنڈ کی ہوتی تھی۔
دوسرے روز دوپہر کے وقت کولن، کوئین سے ملنے اس کے فلیٹ پر آیا اس نے تکنیکی آلات کے ذریعے کوئین اور زیک کی ساری گفتگو امریکن سفارت خانے کے تہہ خانے میں سن لی تھی۔
''تم نے اپنی ایکسچینج مارکیٹ کا بھاؤ ۲ ملین ڈالر پر روک دیا۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''میں اس پر کوئین کو مبارک باد دیتا ہوں۔'' وہاں موجود کرامر نے کہا۔ یہ اس کی کامیابی ہے جو اس نے صرف تیرہ دن میں حاصل کی ہے۔''

''ابھی چند دن اور لگیں گے۔'' کوئین نے کہا اور کولن نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تم نے سنا ہی ہوگا۔ وہ کیش کے بجائے ڈائمنڈ مانگ رہا ہے اور اس کا انتظام کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ کیا تمہیں مجرموں کا کچھ سراغ ملا؟'' کوئین نے پوچھا۔

''نہیں ہم نے سارا علاقہ چھان مارا ہے لیکن وہ بہت ہوشیار ہیں۔'' کولن نے کہا۔

''ہم بہرحال اپنا کام کررہے ہیں۔''

''تم نے سوچا کہ ڈائمنڈ ان تک کیسے جائیں گے۔'' کولن نے پوچھا۔

''یہ کام میں خود کروں گا۔'' کوئین نے جواب دیا۔

''لیکن یاد رہے ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی آلہ نہ لگا دینا اگر انہیں پتا لگ گیا تو وہ کیا کرسکتے ہیں اس کا اندازہ تمہیں بخوبی ہے۔''

''تم فکر نہ کرو، ہم بھی جانتے ہیں لیکن ہم مجرموں کو پکڑنے کی کوشش ہر حال میں کریں گے۔'' کولن نے کہا۔ کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد کولن واپس چلا گیا تھا اور کوئین نے ہیرے جمع کرنے کی ذمہ داری کولن کو دے دی تھی۔

اس رات چاروں اغوا کاروں میں بہت ہی گرما گرم بحث ہوئی تھی،

''اپنی بھونڈی آوازیں نیچی رکھو۔'' زیک نے غرا کر اپنے ساتھیوں کو ڈانٹا وہ جانتا تھا کہ اس کے ساتھ رہ کر صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے سائمن کو اغوا کرنے کے بعد وہ لوگ ایک گھر کے اندر محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ جہاں انہیں رات دن رہنا تھا۔ وہ پولیس کی نظروں میں نہیں آنا چاہتے تھے ان سب کو اعتراض تھا کہ زیک نے کوئین سے دو ملین ڈالر میں سودا کیوں کیا اور وہ رقم گھٹاتا کیوں جارہا ہے۔

''میں یہ معاملہ جلد از جلد نمٹانا چاہتا ہوں۔ ہمارا زیادہ دیر یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں برطانوی پولیس ہمیں بھوکے کتوں کی طرح ڈھونڈ رہی ہے۔'' زیک نے کہا۔

''لیکن ہماری جانیں خطرے میں ہیں۔'' اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

''مجھے اندازہ ہے لیکن کچھ پانے کے لیے کچھ قربانی دینا ہوتی ہے ہم سب چند دنوں میں امیر ہوجائیں گے پھر آرام سے زندگی گزاریں گے، بس کچھ دن کی ہی بات ہے۔'' زیک نے انہیں سمجھایا اس کی بات پر اس کے ساتھی مطمئن ہوگئے تھے لیکن زیک خود پریشان تھا۔ روز بھیس بدل کر فون کرنے جاتا تھا اور کسی بھی لمحے پکڑا جاسکتا تھا پھر جب اسے نقلی مونچھوں اور داڑھی کے ساتھ پکڑا جاتا تو اس پر کیے جانے والے شک کو کوئی ختم نہیں کرسکتا تھا وہ خود ان معاملات کو جلد از جلد نمٹانا چاہتا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ سڑکوں پر پولیس کی موجودگی میں کس طرح کال کرکے فرار ہوتا تھا اس میں اس کے لیے بہت خطرہ تھا۔

''جاؤ جاکر لڑکے کو کھانا دو۔'' اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

سائمن کو اس تہہ خانے میں پندرہ دن ہوگئے تھے وہ جان گیا تھا کہ اس کے والد اسے آزاد کرانے کی کوشش کررہے ہیں اسے قید تنہائی میں کوئی سہولت حاصل نہیں تھی نہ اخبار، نہ کتاب، نہ ٹی وی، نہ ریڈیو اسے وقت گزارنا مشکل ہوتا تھا وہ پھر بھی اپنے ذہن کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتا تھا وہ باقاعدگی سے ورزش کرتا تھا اس نے ابھی تک اپنا جوگنگ کا لباس اور جوتے پہنے ہوئے تھے جن میں سے اسے اب بوآنے لگی تھی اس کے کمرے کی ہر دوسرے دن صفائی کردی

جاتی تھی کھانا اچھا نہیں ملتا تھا لیکن وقت کٹ رہا تھا اس کی مونچھیں اور داڑھی بڑھ گئی تھی سر کے بال بھی لمبے ہو گئے تھے جنہیں وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے درست کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

مقررہ وقت سے ایک دن اوپر ہو گیا تھا لیکن کوئین کو ڈائمنڈ نہیں ملے تھے جنہیں زیک کو دے کر وہ سائمن کو آزاد کرا سکتا سارا معاملہ کولن نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا وہ چاہتا تھا کہ یہ کام وہ خود کرے اور برطانوی افسران سے داد حاصل کرے آخر کار کوئین نے امریکا کے نائب صدر اوڈیل سے خود بات کی۔

''کوئین تم کیا کر رہے ہو؟'' اوڈیل نے غصے سے پوچھا۔

''میں کیا کر رہا ہوں۔'' کوئین نے حیرت سے دہرایا۔

''یاد رکھیں مسٹر اوڈیل اگر مجھے مقررہ وقت پر ڈائمنڈ نہیں ملے تو سائمن کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے میں اغوا کرنے والوں کو مزید نہیں روک سکتا میں نے ڈائمنڈ فراہم کرنے کے بارے میں کولن کو تمام ہدایات دے دی تھیں۔'' کوئین نے بتایا۔

''اوہ میں خود اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔''

''اوڈیل نے کہا۔''

''ڈائمنڈ مجھے کل صبح سے پہلے پہلے مل جائیں۔'' کوئین نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

پھر امریکی نائب صدر اوڈیل نے اپنے طور پر اس معاملے کو ہینڈل کیا تھا امریکا سے وہ ڈائمنڈ انہوں نے روانہ کر دیے تھے اور برطانیہ میں کوئین کے ساتھ اس کیس پر کام کرتے ہوئے کولن کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ ائر پورٹ سے ڈائمنڈ وصول کر کے کوئین تک صبح ہونے سے پہلے پہنچا دے پھر ایسا ہی ہوا تھا۔

جب کولن کوئین کے فلیٹ پر پہنچا تو وہ سٹنگ روم میں بیٹھا کافی پی رہا تھا کولن نے اٹیچی کیس ٹیبل پر رکھ دیا اور پھر اس نے اٹیچی کیس کھول کر ایک مخملیں ڈبہ نکالا تھا اور کوئین کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''میں نے امانت صبح سے پہلے تمہیں پہنچا دی ہے کوئین۔'' اس نے ڈبا کوئین کو تھما دیا۔

''یہ ایک کلوگرام سے زیادہ ہیں تقریباً تین پاؤنڈ کے قریب۔ کیا تم چاہتے ہو کہ کھول کر دکھاؤں۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں ضرورت نہیں ہے۔'' کوئین نے کہا۔

''اگر یہ سادہ شیشہ ہو یا کوئی اور دھوکا ہوا تو کوئی بھی سائمن کا سر اڑا سکتا ہے۔''

''وہ ایسا نہیں کریں گے، یہ تمام ڈائمنڈ اصلی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا وہ کال کرے گا۔'' کولن نے پوچھا۔

''دعا کرو کہ وہ کال کرے وقت زیادہ ہو گیا ہے۔'' کوئین نے کہا۔

''اور تبادلہ کب ہوگا۔'' کولن نے پوچھا۔

''یہ ہم آج فیصلہ کریں گے۔'' کوئین نے کہا۔

''تم اس معاملے کو کیسے ہینڈل کرو گے کوئین۔'' کولن نے پوچھا۔

''اپنے طریقے سے۔'' کوئین نے جواب دیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پھر دوپہر ایک بج کر بیس منٹ پر زیک نے کال کی تھی۔

''کوئین یہ آخری کال ہے۔'' اس نے کہا۔

''زیک میرے دوست، میرے سامنے ایک پیالے میں چمکدار ڈائمنڈ رکھے ہیں اب بولو کیا کہتے ہو؟'' کوئین نے کہا۔

''ٹھیک ہے اب میری ہدایات سنو۔''

''نہیں زیک۔'' کوئین نے اس کی بات کاٹ

دی۔

"یہ سب میرے طریقے سے ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ میں حماقت کررہا ہوں زیک لیکن اس سارے معاملے میں صرف میں ہی واحد شخص ہوں جس پر تم بھروسہ کرسکتے ہو اور تمہیں ایسا کرنا ہی ہوگا ایک پنسل لے لو میں تمہیں کچھ لکھوانے جارہا ہوں۔" کوئین نے کہا۔

"کوئین میری بات سنو۔" زیک نے کہا۔

"تم سنو دوست، میں چاہتا ہوں کہ تم کسی اور بوتھ سے مجھے چالیس سیکنڈ میں کال کرو اس نمبر پر 3701204 کوئین نے نمبر بولا۔ "اب جاؤ۔"

اس نے چیخ کر کہا پھر فون بند کیا قریب رکھا ہوا اٹیچی کیس اٹھایا جس میں ہیرے تھے اس نے غلط کہا تھا کہ ہیرے ایک پیالے میں رکھے ہیں پھر وہ تیزی سے اٹیچی کیس لیے ہوئے فلیٹ سے نکل گیا تھا۔

"جو جہاں ہے وہیں رہے میرے پیچھے کوئی نہیں آئے گا۔" اس نے چیخ کر کہا تھا اور فلیٹ میں موجود ہر شخص ساکت رہ گیا تھا کہ اچانک یہ کیا ہوا۔

"یہ کیا حماقت کررہا ہے۔" امریکی سفارتخانے میں موجود ٹیم کے ایک ممبر نے کہا جو چوبیس گھنٹے کوئین کے فلیٹ میں ہونے والی ہر گفتگو سن رہے تھے۔

"کوئین فلیٹ سے نکلنے کے بعد سڑک پر تیزی سے بھاگتا جارہا تھا اس نے جو نمبر زیک کو لکھوایا تھا وہ کسی بوتھ کا نہیں تھا بلکہ اس سڑک پر واقع ایک ریسٹورنٹ کا تھا جو کوئین نے ایک موقع پر اپنے پاس لکھ لیا تھا اس نے بھاگتے ہوئے دوسرے ریسٹورنٹ کے شیشے سے اندر دیکھا اس کا مالک کسی کام سے کاؤنٹر سے ہٹ گیا تھا کوئین ریسٹورنٹ میں داخل ہوا ۔اسی وقت ریسٹورنٹ کے فون کی گھنٹی بجی اور کوئین نے ریسٹورنٹ کے مالک کی طرف دیکھا۔

"وہ بچے تمہارے پھل لے کر بھاگ رہے ہیں۔" اور ریسٹورنٹ کا مالک فون کا جواب دینے کے بجائے ریسٹورنٹ کے دروازے کی طرف بھاگا کوئین نے پھرتی سے ریسیور اٹھالیا تھا دوسری طرف زیک تھا۔

"سنو زیک یہ نمبر لکھو۔" کوئین نے کہا۔

"کیا مصیبت ہے آخر ہو کیا رہا ہے۔" زیک نے غصے سے پوچھا۔

"9353215" کوئین نے اس کا جواب دینے کے بجائے نمبر بولا۔

"لکھ لیا؟" اس نے پوچھا۔ "دیکھو زیک اب یہ معاملہ صرف ہم دونوں کے درمیان ہے میں ان سب کو دھوکا دے کر آ گیا ہوں اب بچے کے بدلے ڈائمنڈ کا سودا ہم کرسکتے ہیں کوئی ٹرک نہیں ہے تم مجھ پر بھروسا کرسکتے ہو۔ تم ساٹھ منٹ بعد مجھے اس نمبر پر فون کرو اور اگر نوے منٹ تک تمہیں کوئی جواب نہ ملے تو تم سمجھ لینا کہ یہ نمبر ٹریس نہیں ہورہا ہے۔" کوئین نے کہا اور جواب کا انتظار کیئے بغیر فون بند کردیا۔

دوسری طرف ایکسچینج میں بیٹھے لوگوں نے چند ہی سیکنڈ میں وہ نمبر ٹریس کرلیا تھا جو کوئین نے پہلے زیک کو دیا تھا اور جب انہوں نے کال ریسیو کی تو کوئین جملے کا آخری حصہ بول رہا تھا۔

"اگر نوے منٹ تک جواب نہ ملے تو تم سمجھنا کہ کال ٹریس ہورہی ہے۔"

"اوہ گدھا اس نے اسے کوئی اور نمبر دیا ہے۔" اس نے کہا۔ اس کے ساتھ برطانوی پولیس آفیسر بھی تھے جو دوسرے فون پر صورت حال حکام کو بتارہے تھے۔

کوئین ریسٹورنٹ سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ اس کے فلیٹ کی طرف سے میکرا اور سمرویل بھاگتے ہوئے اس کی طرف آرہے تھے اس نے قریب سے

گزرتے ہوئے ایک موٹر بائیک والے سے اس کی بائیک چھینی اور وہاں سے روانہ ہو گیا میکرا نے آگے بڑھ کر اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا ہاتھ صرف کوئین کی جیکٹ کو چھو سکا تھا۔

کوئین کے وہاں سے روانہ ہونے کے بعد میکرا اور سمر ویل واپس فلیٹ میں آ گئے تھے اور امریکن سفارت خانے میں اطلاع دی تھی۔

''اوہ یہ کوئین مصیبت بنا ہوا ہے پتا نہیں اب اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟'' کولن نے وہاں موجود اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''اور اب اسے کیسے ڈھونڈیں گے؟'' ایک ساتھی نے پوچھا۔

''کوئی مسئلہ نہیں اس اٹیچی کیس میں ایک ڈائریکشن فائنڈر لگا ہوا ہے۔''

''کیا یہ خطرناک ہے اگر مجرموں کو اس کا علم ہو گیا تو سائمن کی جان بھی جا سکتی ہے۔'' ایک ساتھی نے کہا۔

''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ وہ بہت حساس آلہ ہے اس کا کوئی پتا نہیں لگا سکتا۔'' کولن نے کہا۔

''اور اس کا ریسیور۔''

''یہاں ہے ہمارے پاس یہ دو میل تک کی رینج رکھتا ہے چنانچہ ہمیں فوراً ہی اس کے پیچھے روانہ ہونا ہوگا۔'' کولن نے کہا۔

''ہم جیسے ہی اس تک پہنچیں گے یہاں اطلاع کر دیں گے۔'' کولن کے ساتھیوں نے کہا اور پھر وہ ایک برطانوی پولیس کار میں وہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔

وہ کافی دیر تک سگنلز کی مدد سے اس کا پیچھا کرتے رہے تھے لیکن ایک مقام پر وہ سگنلز ملنے ختم ہو گئے تھے کیونکہ احتیاط کے پیش نظر کوئین نے اٹیچی کیس سے ہیروں کا پیکٹ نکال کر اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا اور خالی اٹیچی کیس قریب کھڑی ایک گاڑی میں ڈال دیا تھا جسے کچھ ہی دیر بعد برطانوی پولیس نے پکڑ لیا [illegible] لیکن وہاں انہیں خالی اٹیچی کیس ہی ملا تھا جس کے بارے میں اس کار کا مالک کچھ نہیں جانتا تھا۔

کوئین نے زیک کو دوسری بار جو نمبر لکھوایا تھا وہ ایک مضافاتی علاقے کے چھوٹے سے ہوٹل کا تھا کوئین وہاں پہنچا تھا اور ایک کمرہ کرائے پر حاصل کرنے کے بعد اس نے کچھ دیر آرام کیا پھر کال آنے کے وقت سے چند پہلے وہ ہوٹل کے بار پر پہنچ گیا تھا اور کاؤنٹر کے قریب رکھے فون کے قریب رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا تھا۔

''اس کے دیے ہوئے مقررہ وقت پر گھنٹی بجی تھی اور اس نے تیزی سے ریسیور اٹھا لیا تھا بار مین اپنے کام میں مصروف تھا اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی دوسری طرف سے زیک بول رہا تھا۔

''دیکھو کوئین کوئی چال نہیں چلے گا تم جانتے ہو کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' زیک نے کہا۔

''تم فکر مت کرو دوست ہم اب لڑکے کے تبادلے کی بات کر سکتے ہیں۔'' کوئین نے کہا۔

''کل صبح 10 بجے میں تمہیں اس نمبر پر کال کروں گا۔'' زیک نے کوئین کو ایک فون بوتھ کا نمبر بتایا۔

''ٹھیک ہے کوئین نے کہا۔

''اور کل بھی تمہیں بتاؤں گا کہ ہم کہاں ملیں گے۔'' زیک نے کہا۔

''میرے آدمی پہلے سے اس علاقے میں موجود ہوں گے تم پر نظر رکھیں گے اگر کوئی بھی شک ہوا تو تم سائمن کارمک کو مرا ہوا پاؤ گے تم ہمیں نہیں دیکھ سکو گے لیکن ہم تم پر نظر رکھیں گے۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے اکیلا ہی آؤں گا۔'' کوئین

نے کہا۔
"کوئی ڈائر یکشن، کوئی الیکٹرانک ڈیوائس نہیں کوئی مائیکروفون نہیں ہم تمہیں چیک کرلیں گے۔"
"میں نے کہا نا میں اکیلا آؤں گا۔" کوئی چال نہیں چلی جائے گی صرف میں اور ڈائمنڈ اور بس۔" کوئین نے کہا۔
"ٹھیک ہے تم نو بجے اس فون بوتھ پر آ جانا۔" زیک نے کہا اور فون بند کر دیا۔
دوسرے دن ٹھیک نو بجے کوئین وہاں پہنچ گیا تھا اور ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد بوتھ کی گھنٹی بجی تھی دوسری طرف سے بولنے والا زیک ہی تھا اس نے فون پر اسے ایک جگہ کا پتا بتایا تھا۔
"تمہیں جمیکا روڈ پر ایک اسٹیل ویئر ہاؤس کی عمارت میں آنا ہے اس کے دروازے پر Babbidge لکھا ہوگا۔ ٹیکسی دور ہی چھوڑ دینا اور پیدل آنا پھر گیٹ سے اندر داخل ہوکر درمیانی حصے میں پہنچ کر انتظار کرنا اگر تمہارے ساتھ کوئی ہوا یا کسی نے پیچھا کیا تو ہم سامنے نہیں آئیں گے۔"
زیک نے فون بند کر دیا تھا کوئین بوتھ سے باہر آیا تھا اور اس نے ایک کرائے کی ٹیکسی لی تھی اور بتائے ہوئے پتے کی طرف روانہ ہوگیا تھا اصل عمارت تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ ٹیکسی سے اتر گیا تھا اور باقی راستہ اس نے پیدل ہی طے کیا تھا پھر اسٹیل ویئر ہاؤس کے سامنے وہ رکا تھا جس کے دروازے پر Babbidge لکھا تھا اس دروازے سے وہ اندر داخل ہوا تھا اور چلتا ہوا اس ویئر ہاؤس کے درمیانی حصے میں جا کر رک گیا تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی چھپی ہوئی نظریں اس کا جائزہ لے رہی ہیں۔
اس نے ایک گھنٹے انتظار کیا تھا پھر ٹھیک گیارہ بجے ایک بڑی وین ویئر ہاؤس کے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی اور بہت آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی اس کی طرف بڑھی تھی پھر چالیس قدم کے فاصلے پر آ کر رک گئی تھی اس میں سامنے کی طرف دو افراد بیٹھے تھے جنہوں نے چہروں پر ماسک لگائے ہوئے تھے جن سے ان کی آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ اسی لمحے کوئین کو اپنی پشت پر قدموں کی چاپ سنائی دی اس نے گردن موڑ کر دیکھا ایک تیسرا فرد وہاں کھڑا تھا اس نے کالا لباس پہنا ہوا تھا اس کے منہ پر بھی نیلے رنگ کا ماسک تھا اس کے ہاتھ میں ایک سب مشین گن تھی جسے استعمال کرنے کے لیے بالکل تیار نظر آ رہا تھا۔
سامنے کھڑی وین کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک درمیانے قد اور درمیانے جسم کا شخص باہر آیا۔
"کوئین۔" اس شخص نے کوئین کا نام لیا اور کوئین فوراً پہچان گیا کہ وہ زیک ہے۔
"تم ڈائمنڈ لائے ہو؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں لایا ہوں۔" کوئین نے جواب دیا۔
"مجھے دو۔" زیک نے کہا۔
"تم لڑکے کو لائے ہو زیک۔" کوئین نے اس کے ہی انداز میں پوچھا۔
"احمق مت بنو کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اسے چند پتھروں کے عوض تمہیں دے دیں گے ہم پہلے انہیں چیک کریں گے۔ وقت لگے گا صرف ایک ڈائمنڈ بھی اگر نقلی نکلا تو ہم تمہیں اڑا دیں گے اگر ڈائمنڈ اصلی ہوئے تو ہم لڑکے کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔" زیک نے جواب دیا۔
"نہیں یہ طریقہ نہیں چلے گا۔" کوئین نے کہا۔
"میرے ساتھ کھیل مت کھیلو کوئین۔" زیک نے غصے سے کہا۔
"میں کوئی کھیل نہیں کھیل رہا ہوں زیک میں بھی بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں تم بغیر چیک کیے ڈائمنڈ نہیں لو

گے اور میں بچے کو صحیح سلامت دیکھے بغیر ڈائمنڈ نہیں دوں گا۔ میں اپنا یقین کرنا چاہتا ہوں کہ بچہ ٹھیک ہے اس لیے میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' کوئین نے کہا اور اس پر اس کے سامنے کھڑے دو اشخاص میں سے ایک ہنسا۔

''اپنے پیچھے کھڑے اس شخص کو دیکھ رہے ہو کوئین۔'' زیک نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرے ایک اشارے کی دیر ہے یہ تمہارا سر اڑا دیں گے اور پھر میں ڈائمنڈ اور بچہ دونوں کو لے جاؤں گا۔'' زیک نے کہا۔

''یہ بات ہے تو کوشش کر کے دیکھ لو۔'' کوئین نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ''کیا تم نے یہ دیکھا ہے۔'' اس نے اپنا کوٹ سینے پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ جہاں اس کے سینے پر خودکش جیکٹ بندھی ہوئی تھی۔

''بہت خوب لیکن یہ اصلی نہیں ہے۔'' زیک نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''آؤ چیک کر لو۔'' کوئین نے کہا اور زیک نے تنقیدی انداز میں اس کا جائزہ لیا۔ زیک نے دیکھا کہ کوئین کے سیدھے ہاتھ میں چھوٹا سا ریموٹ بھی تھا جس کا بٹن وہ کسی لمحے بھی دبا سکتا ہے۔

''تم گدھے مجھے پتا تھا تم بہت کمینے ہو تم کچھ بھی کر سکتے ہو اب کیا چاہتے ہو۔'' زیک نے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ چلوں گا اور لڑکے کو دیکھوں گا کوئی ہمارا پیچھا نہیں کرے گا تم نے نقاب پہنا ہوا ہے میں تمہیں کبھی شناخت نہیں کر سکوں گا تم محفوظ ہو جب میں بچے کو دیکھ کر اطمینان کر لوں گا تو میں یہ جیکٹ اتار دوں گا اور ڈائمنڈ تمہیں دے دوں گا تم انہیں چیک کر لینا جب تم مطمئن ہو جاؤ تو تم مجھے اور بچے کو قید ہی میں چھوڑ کر چلے جانا اور پھر پولیس کو فون کر کے ہماری لوکیشن بتا دینا وہ آ کر ہمیں آزاد کرالیں گے تم بے شک یہ کال چوبیس گھنٹے بعد کر دینا جو گمنام ہوگی۔'' کوئین نے اسے اپنا پروگرام سمجھایا زیک شش و پنج میں نظر آ رہا تھا۔

''اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ میں تمہیں چیک کروں گا۔'' زیک نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک آلہ نکالتے ہوئے کہا کوئین نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور زیک نے سرکٹ ڈیٹیکٹر سے اسے چیک کیا اسے یقین ہو گیا کہ وہ خودکش جیکٹ اصلی تھی۔

''ٹھیک ہے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریموٹ جیب میں رکھو اور وین میں سوار ہو جاؤ۔'' زیک نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

پھر کوئین نے وہی کیا تھا جس کی اس کو ہدایت کی گئی تھی اسے وین میں رکھے ٹرنک میں بٹھا کر اس کا ڈھکن بند کر دیا گیا تھا اس ٹرنک میں ہوا جانے کے لیے سوراخ بنے ہوئے تھے یہ وہی ٹرنک تھا جسے تین ہفتے پہلے سائمن کو اغوا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

وین جب وہاں سے روانہ ہوئی تو زیک ہی اسے ڈرائیو کر رہا تھا پھر یہ وین لندن سے چالیس میل دور واقع ایک گھر کے گیراج میں جا کر رکی تھی جب گیراج کا دروازہ بند ہو گیا تو تینوں افراد نے اپنے لباس تبدیل کیے تھے آخر میں زیک نے ٹرنک کا ڈھکن کھول کو کوئین کو نکالا تھا۔

''چلو ہم تمہیں بچے سے ملواتے ہیں۔ لیکن گھر میں جانے سے پہلے تمہیں اپنے سر پر یہ غلاف پہننا ہوگا۔'' زیک نے کوئین سے کہا اور کوئین نے ان کی ہدایت کے مطابق غلاف سر پر چڑھا لیا اسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا پھر کئی راہداریوں سے گزرنے کے بعد اسے ایک کمرے میں دھکیل دیا گیا تھا اور اس نے

اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سی تھی۔
"اب تم سر سے غلاف اتار سکتے ہو۔" اسے زیک کی آواز سنائی دی جو کمرے کے باہر سے بول رہا تھا کوئین نے غلاف اتارا تو خود کو ایک تہہ خانہ میں پایا جس کا فرش اور دیواریں کنکریٹ کی تھیں اور کونے میں ایک لوہے کے پلنگ پر ایک دبلا پتلا لڑکا بیٹھا تھا جس کے سر پر بھی نقاب تھا پھر دروازے پر دو دستکیں سنائی دیں اور لڑکے نے سر سے نقاب اتار دیا وہ اندھیرے میں کھڑے لمبے قد کے شخص کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔
"ہیلو سائمن تم ٹھیک ہو۔" سامنے کھڑے شخص نے پیار سے پوچھا۔
"تم کون ہو۔" سائمن نے اس سے پوچھا۔
"میں ثالثی کروانے والا ہوں ہم سب تمہارے لیے بہت پریشان تھے تم ٹھیک ہو، کوئین نے پوچھا۔
"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" بچے نے جواب دیا اسی وقت دروازے پر تین دستکیں سنائی دیں اور بچے نے پھر سر پر نقاب پہن لیا دروازہ کھلا دروازہ میں زیک نقاب پہنے کھڑا تھا۔
"تم نے دیکھ لیا بچے کو اب ڈائمنڈ دو اس نے گرج کر کہا۔
"ہاں یہ لو۔" کوئین نے کہا تم نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔"
کوئین نے کوٹ اتارا تھا اور ڈائمنڈ کا پیکٹ جو اس کی کمر سے بندھا تھا کھول کر زیک کو دے دیا تھا۔
"یہ جیکٹ بھی مجھے دو۔" زیک نے کہا اور کوئین نے بغیر کسی اعتراض کے خود کش جیکٹ اور ریموٹ اسے دے دیا۔
"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" زیک نے جیکٹ لیتے ہوئے کہا۔

"میں مجبور تھا۔" کوئین نے کہا۔
"جی چاہتا ہے تمہیں اسی وقت اڑا دوں۔" زیک نے کہا۔
"میرا خیال ہے تم ایسا کر سکتے ہو لیکن کرو گے نہیں مجھے یقین ہے تمہیں جو چاہیے تھا تمہیں مل گیا اب تم سکون سے ڈائمنڈ کو چیک کرو اور آرام سے فرار ہو جاؤ مجھے اور بچے کو تم یہیں چھوڑ جانا پھر تم پولیس کو فون کر دینا جو ہمیں یہاں سے رہائی دلائے گی۔" کوئین نے کہا۔ زیک نے خاموشی سے دروازہ بند کر دیا تھا کوئین نے آگے بڑھ کر لڑکے کے سر پر سے نقاب اتار دیا تھا اور پھر پلنگ پر بچے کے قریب بیٹھ گیا تھا۔
"میرا خیال ہے میں تمہیں کچھ اہم اطلاعات دے سکتا ہوں۔" کوئین نے سائمن سے کہا۔
"چند گھنٹوں کے بعد اگر سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا تو ہم یہاں سے آزاد ہو کر امریکا جا رہے ہوں گے اور تمہارے والد اور والدہ نے تمہیں بہت بہت پیار کہا ہے۔" کوئین نے کہا اور سائمن یہ سن کر رونے لگا کوئین نے اپنے ایک ہاتھ سے اس کے کاندھے تھپتھپائے تھے۔
وہ رات کوئین نے تہہ خانے میں سائمن کے ساتھ گزاری تھی سائمن بیڈ پر لیٹا تھا اور کوئین دیوار کا سہارا لے کر فرش پر بیٹھا ہوا تھا سائمن نے اس سے بہت سے سوالات کیے تھے۔
"مسٹر کوئین؟"
"تم مجھے صرف کوئین کہو صرف کوئین۔"
"کیا تم ذاتی طور پر میرے والد سے ملے تھے؟"
"ہاں انہوں نے ہی مجھے آنٹی ایملی کے بارے میں بتایا تھا اور مسٹر اسپوٹ کے بارے میں بھی۔"
"وہ کیسے ہیں۔"
"ٹھیک ہیں پریشان ہیں ظاہر ہے اغوا کا واقعہ ہی

ایسا تھا۔"

"کیا تم میری والدہ سے ملے تھے۔"

"نہیں وہ وائٹ ہاؤس ڈاکٹر کے ساتھ تھیں پریشان تھیں لیکن ٹھیک تھیں۔"

"کیا انہیں نہیں معلوم ہے کہ میں خیریت سے ہوں۔"

"میں نے دو دن پہلے انہیں بتایا تھا کہ تم زندہ ہو، اب سو جاؤ۔"

"اوکے! ہم یہاں سے کب تک آزاد ہوں گے۔"

"یہ تو صبح ہی پتا چلے گا میرا خیال ہے وہ مطمئن ہو جائیں گے تو فرار ہو جائیں گے اور اگر بارہ گھنٹے بعد انہوں نے پولیس کو فون کر دیا تو برطانوی پولیس چند لمحوں میں یہاں پہنچ جائے گی اس کا انحصار زیک پر ہے۔" کوئین نے کہا۔

"زیک کیا وہ ان کا لیڈر ہے۔"

"ہاں۔"

رات کے دو بجے سائمن تھک کر سو گیا تھا لیکن کوئین جاگ رہا تھا اور باہر سے آنے والی آوازوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجرم کیا کر رہے ہیں پھر صبح تین بجے دروازے پر تین دستکیں ہوئی تھیں۔

"نقاب پہن لو۔" سائمن نے سرگوشی میں کہا اور دونوں نے نقاب پہن لیے تو زیک اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ تہہ خانے میں داخل ہوا اور سائمن اور کوئین کے ہاتھ پشت پر لے جا کر انہیں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔

زیک اور اس کے ساتھی ڈائمنڈ چیک کرنے کے بعد مطمئن ہو گئے تھے اس کام سے وہ رات بارہ بجے فارغ ہو گئے تھے لیکن صبح تین بجے تک وہ اس گھر سے اپنی موجودگی کا ایک ایک نشان مٹانے میں مصروف رہے تھے۔

سائمن اور کوئین کو وین میں لے جایا گیا تھا اور سائمن کو ٹرنک میں بند کرنے کے بعد کوئین کو وین کے پچھلے حصے میں بٹھا کر اس پر کمبل ڈال دیا گیا تھا جب سے کوئین نے اندازہ لگایا تھا کہ اغوا کار یہ نہیں چاہتے کہ سائمن اور کوئین کو پولیس اس گھر سے دریافت کرے وہ شاید انہیں کہیں اور لے جا کر چھوڑنا چاہتے ہیں۔ جہاں سے پولیس کی رسائی ان تک نہ ہو سکے۔

اس بار بھی وین زیک ہی چلا رہا تھا۔ اس بار وین روانہ ہونے سے پہلے چاروں افراد نے اپنے سوٹ اور ماسک اتار کر پھینک دیے تھے اور عام لباس میں تھے کسی نے بھی وین کو گھر کے گیراج سے نکلتے نہیں دیکھا تھا ابھی صبح ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا کوئین کو اندازہ نہیں تھا کہ انہیں کدھر لے جایا جا رہا ہے وین میں موجود کوئی شخص بھی بات نہیں کر رہا تھا کچھ دور جانے کے بعد وین رکی تھی اس میں سے دو افراد باہر آئے تھے اور انہوں نے کوئین کو گھسیٹ کر نیچے اتار دیا تھا اس کے پاؤں گھاس سے ٹکرائے تھے اس کے سر پر اب بھی نقاب تھا وہ دونوں افراد پھر وین میں سوار ہو گئے تھے اور وین کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔

"زیک لڑکا کہاں ہے۔" کوئین نے چیخ کر پوچھا۔

"وہ تمہیں اس روڈ پر دس میل آگے جا کر مل جائے گا۔" زیک کی آواز سنائی دی۔

"جیسے تمہیں چھوڑا ہے اسے بھی ایسے ہی چھوڑیں گے۔" زیک نے کہا۔

پھر وین وہاں سے آگے روانہ ہو گئی تھی کوئین کو اپنے جسم میں نومبر کی ٹھنڈی ہوا چبھتی ہوئی محسوس

ہوئی اس نے گھاس پر بیٹھے بیٹھے اپنے ہتھکڑی لگے ہاتھ اپنے کولہوں کے نیچے سے نکال کر اپنے گھٹنوں کی طرف لاتے ہوئے اپنے پیروں سے باہر نکال لیے تھے اس کام میں اسے چند منٹ لگے تھے پھر اس نے ہتھکڑی لگے ہاتھوں ہی سے اپنے سر پر چڑھا نقاب اتارا تھا اور اطراف کا جائزہ لیا تھا۔

دور دور تک سبزہ تھا اور سامنے ایک سیدھی سڑک جا رہی تھی جس پر سے وین آگے گئی تھی۔ کوئین نے اسی سمت دوڑنا شروع کر دیا پھر وہ دو میل تک بھاگتا رہا تھا کہ اچانک اس کے راستے میں ایک ٹوٹا ہوا کیبن آیا جسے آفس کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہوگا وہ اندر گیا تو ایک ٹیبل پر فون رکھا تھا یہاں اس نے بندھے ہوئے ہاتھوں ہی کی مدد سے اپنے اپارٹمنٹ کا نمبر ملایا تھا۔

''ہاں۔'' اسے سمرویل کی آواز سنائی دی۔

''سم۔'' کوئین نے پوچھا اور سمرویل اس کی آواز پہچان گئی۔

''اوہ کوئین کیا تم ٹھیک ہو اور سائمن کیسا ہے۔''

''ٹھیک ہوں مجھے ان لوگوں نے چھوڑ دیا ہے اور اب تک سائمن کو بھی چھوڑ دیا ہوگا لیکن اسے آگے کہیں روڈ پر چھوڑا ہوگا۔'' کوئین نے کہا۔

''کوئین تم کہاں ہو؟'' سمرویل نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا ایک لمبے سیدھے روڈ پر میں ایک اجڑے ہوئے گیراج کے چھوٹے سے دفتر میں موجود ہوں اور اس فون پر لکھے ہوئے نمبر پڑھے نہیں جا رہے ہیں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں، تم جہاں سے کال کر رہے ہو ایکسچینج نے وہ نمبر لے لیا ہے۔ جلد ہی تمہیں مدد پہنچ جائے گی۔'' سمرویل نے کہا اسی لمحے کوئین کی نظر میز پر پڑے ایک رائٹنگ پیڈ پر پڑی جس پر گیراج کا پتا لکھا ہوا تھا کوئین نے وہ پتا سمرویل کو لکھوا دیا چند لمحوں میں ٹیلی فون لائن ڈیڈ ہوگئی تھی اور سمرویل اور میکرا فلیٹ سے باہر آ گئے تھے یہی کال امریکی سفارت خانے کے ایکسچینج میں بھی سنی گئی تھی اور وہاں سے بھی پولیس اور سیکورٹی فورس کے افراد کولن کی سربراہی میں روانہ ہو گئے تھے۔

کوئین فون کرنے کے بعد پھر روڈ پر اس سمت بھاگنے لگا تھا جس سمت وین گئی تھی صبح کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی کچھ دور بھاگنے کے بعد صبح کے جھٹپٹے میں اسے ایک کمزور سا جسم اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس ہوا وہ اس سے تین سو گز کے فاصلے پر تھا اور اس کے عقب میں اسے برطانوی پولیس کی کار کے انجن اور سائرن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کار کے پیچھے بھی پولیس کی مزید کاریں تھیں۔

سائمن لڑکھڑاتا ہوا بھاگ رہا تھا پولیس کی پہلی کار کوئین کے قریب پہنچی۔

''لڑکا کہاں ہے۔'' کولن نے پوچھا۔

اس وقت کرامر کی کار بھی آ گئی اس نے بھی وہی سوال کیا کوئین بھاگتے بھاگتے رک گیا۔

''وہ......وہاں......!'' کوئین نے بہ مشکل سانس لیتے ہوئے سائمن کی طرف اشارہ کیا اور انہوں نے مڑ کر سائمن کی طرف دیکھا۔ صبح کی دھند میں اس کا ہیولا ڈگمگاتا ہوا اپنی طرف آتا دکھائی دیا اس کے ساتھ ہی کولن کرامر اور کئی امریکی اور برطانوی پولیس والے اس کی طرف بھاگے سائمن کا ہیولا ان سے دو سو گز کے فاصلے پر تھا کوئین اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

سمرویل نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا وہ لڑکھڑا رہا تھا پھر سمرویل نے اس سے کچھ کہا تھا جسے کوئین سن کر

بھی سمجھ نہیں پایا تھا اچانک ان سب کی آنکھوں کے سامنے چند لمحوں کے لیے تیز چندھیا دینے والی روشنی ہوئی تھی اور ایک دھماکہ سنائی دیا تھا سائمن کا جسم تیزی سے ہوا میں اچھلا تھا اور کئی حصوں میں زمین پر واپس آ گیا تھا ان سب نے دھماکے سے ہونے والی لہر کو محسوس کیا تھا۔

''اوہ خدایا۔'' اچانک کرامر کے منہ سے نکلا تھا اس کے ساتھ ہی ایف بی آئی کا ایک آفیسر بھی روڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا تھا اور رو رہا تھا سمرویل کی بھی چیخیں نکل گئی تھیں اور کوئین نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا تھا چند لمحوں کے لیے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا اس کے بعد کولن تیزی سے سائمن کے جسم کی طرف لپکا تھا اور اس کے ساتھ ہی باقی پولیس والے بھی بڑھے تھے۔

''نہیں سب ہٹ جاؤ۔'' کولن نے تیزی سے کہا تھا اور ہر کوئی جہاں تھا وہیں رک گیا تھا۔

''تم احمق۔'' کولن کوئین پر برس پڑا ہے سب تمہارا قصور ہے یہ تمہاری وجہ سے ہوا ہے اور تمہیں اس کے نتائج کو بھگتنا ہوگا۔'' کولن نے غصے سے کہا اس کے ساتھ ہی اس نے کوئین کے منہ پر ایک زوردار مکا مارا تھا اور کوئین نے اس سے بچنے کی کوشش نہیں کی تھی چہرے پر مکا کھانے کے بعد وہ لڑکھڑایا تھا اور گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

''اسے کار میں ڈالو۔'' کولن نے غراتے ہوئے کہا پھر کرامر اور سمرویل، کوئین کو لے کر واپس لندن میں اپنے فلیٹ کی طرف چلے گئے تھے کولن نے انہیں ہدایت کر دی تھی کہ کوئین کو کسی وقت بھی پوچھ گچھ کے لیے بلایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد جائے حادثے پر کئی تحقیقاتی ٹیمیں پہنچ گئی تھیں ان میں پولیس کا محکمہ، سی آئی اے، ایف بی آئی کے افراد کے ساتھ ساتھ بم ڈسپوزل اسکواڈ کے لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا سائمن کی لاش کو اٹھا کر لیبارٹری پہنچا دیا گیا تھا اور کولن نے سب سے پہلے سرہیری میرٹ کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔

''کولن کیا کسی بھی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس حادثے میں برطانوی عہدیداروں کی کوتاہی ہے۔'' سرہیری میرٹ نے پوچھا۔

''نہیں جناب دراصل کوئین اپنے اپارٹمنٹ سے نکل بھاگا تھا یہ سب اس کا ہی کیا دھرا ہے اس کا خیال تھا کہ برطانوی ذمہ داران اس معاملے سے اچھی طرح نہیں نمٹ سکیں گے چنانچہ اس نے اکیلے ہی اس معرکے کو سر کرنا چاہا تھا اس نے جیسے چاہا اس معاملے کو ہینڈل کیا ہے اور وہ اس کام میں ناکام ہو گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے مجھے فوراً ہی وزیراعظم کو بتانا ہوگا تم ہر قیمت پر میڈیا کو اس معاملے سے دور رکھنے کی کوشش کرنا اگر زیادہ صورت حال خراب ہوئی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائمن کارمک ہمیں مردہ حالت میں ہی ملا تھا لیکن ابھی نہیں اور مجھے لحہ بہ لحہ نئی صوصورت حال رتحال بتاتے رہنا چاہیے کتنی بھی چھوٹی سی بات کیوں نہ ہو میں جاننا چاہوں گا۔'' ہیری میرٹ نے کہا۔

''اوکے جناب۔'' کولن نے جواب دیا اور فون بند کر دیا اس وقت تک سائمن کارمک کے قتل کی اطلاع واشنگٹن پہنچ چکی تھی اور فلیٹ پہنچ کر سمرویل نے بھی نائب صدر اوڈیل کو فون کیا تھا۔

''کیا...... یہ کیسے ہوا...... اوہ خدا کے لیے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟'' اوڈیل کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا صبح کے پانچ بجے آنے والی کال کے لیے اس نے سوچا تھا کہ یہ سائمن کی رہائی کے بارے میں ہوگی لیکن ایسا

نہیں تھا شدت جذبات سے اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔
"ابھی کچھ پتا نہیں جناب سائمن بالکل ٹھیک تھا جب اسے رہا کیا گیا وہ بھاگ کر ہماری طرف آ رہا تھا ہم سے صرف نوے گز کے فاصلے پر تھا جب یہ حادثہ ہوا ہمیں اندازہ نہیں ہے کہ وہ کیا تھا لیکن وہ مر گیا جناب۔" سمرویل نے بتایا اور فون رکھ دیا۔
نائب صدر اوڈیل نے اس وقت کمیٹی کے ارکان کو جمع کر کے میٹنگ کی اور انہیں اس حادثے کے بارے میں بتایا وہ پریشان تھا کہ صدر کارمک کو کیسے اطلاع دے اسے یاد تھا کہ صدر نے اسے ذمہ داری دی تھی کہ وہ سائمن کارمک کو ان تک ڈھونڈ کر لائے وہ بوجھل قدموں سے صدر سے ملنے گیا وہ اس وقت جاگ ہی رہے تھے۔
"ہاں مائیکل اوڈیل کیا بات ہے؟" انہوں نے اداسی سے پوچھا۔
"وہ سائمن مل گیا لیکن مجھے افسوس ہے کہ وہ مردہ حالت میں ملا ہے۔" اوڈیل نے رک رک کر کہا۔
صدر کارمک بے حس و حرکت اپنی جگہ پر بیٹھے رہے تھے کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھا کر اوڈیل کی طرف دیکھا۔
"مجھے تنہا چھوڑ دو پلیز۔" ان کی آواز بالکل سپاٹ تھی اس میں کسی قسم کا تاثر نہیں تھا اوڈیل نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور ان کے کمرے سے نکل گیا تھا اپنے پیچھے اسے صدر کارمک کے رونے کی آواز سنائی دی تھی جب وہ اپنے آفس میں پہنچا تو اسے برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر کی کال موصول وہ صدر کارمک سے بات کرنا چاہتی تھیں۔
"سوری میڈم وہ اس وقت بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔" اوڈیل نے کہا۔
"تمہیں پتا تو ہو گیا ہو گا یہ واقعہ کس طرح ہوا؟" مارگریٹ تھیچر نے پوچھا۔
"ہاں کچھ اطلاعات یہاں پہنچی ہیں میں چاہتا ہوں کہ کوئین سمرویل اور کرامر کو واپس امریکا بھجوا دیں انہیں سائمن کی باڈی کے ساتھ ہی بھیج دیں اور سائمن کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی۔" اوڈیل نے کہا۔
"ہاں لیکن ہمارے تحقیقاتی ادارے کارروائی کر رہے ہیں یہ ہماری بھی ذمہ داری میں شامل ہے اور جب تک مجرموں کا سراغ نہیں ملتا کارروائی بند نہیں ہوگی۔" مسز تھیچر نے یقین دلایا۔
لیکن اوڈیل کے کہنے کے مطابق کوئین امریکن نہیں پہنچا تھا وہ برطانیہ میں ہی غائب ہو گیا تھا اور سمرویل جس کی ذمہ داری تھی کہ وہ ہر وقت سائے کی طرح کوئین کے ساتھ رہے وہ باقی ٹیم کے ساتھ امریکا پہنچی تھی اور اس نے نائب صدر اوڈیل سے ملاقات کی تھی۔
"میں کوئین ہی کو سائمن کی موت کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔" اوڈیل نے کہا۔
"لیکن ایسا نہیں ہے میں سائے کی طرح اس کے ساتھ رہی وہ اپنا کام نیک نیتی سے کر رہا تھا۔" سمرویل نے کہا۔
"انسان ہے اس کے دل میں لالچ بھی آ سکتا ہے۔ دو ملین ڈالر کے اصلی ہیرے معمولی دولت نہیں ہے۔" اوڈیل نے کہا۔
"اگر اسے دولت ہی کا لالچ ہوتا تو وہ ہیرے خود رکھ سکتا تھا اس نے ہیرے مجرموں تک پہنچائے ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے سائمن کو چھوڑ دیا تھا خود کوئین ہمیں روڈ پر بھاگتا ہوا ملا تھا اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں لگی تھیں۔"
"اگر انہوں نے سائمن کو آزاد کر دیا تھا اور ان کے ساتھ کوئین کی ڈیل کامیاب تھی تو سائمن کا قتل؟"

''یہی بات کوئین کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے اس نے مجھے آپ سے ملنے کی ہدایت کی ہے اور کہا ہے کہ وہ اصل مجرموں کو بے نقاب کر کے رہے گا تا کہ سائمن کے قتل کا بدلہ بھی لیا جا سکے اور کوئین خود کو بھی بے قصور ثابت کر سکے۔'' سمرویل نے کہا۔

وہ کچھ دیر بعد اوڈیل سے مل کر رخصت ہوگئی تھی لیکن اس پر پابندی لگا دی گئی تھی کہ وہ واشنگٹن سے باہر نہیں جائے گی۔

سائمن کارمک کی لاش پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے ساتھ امریکا بھیج دی گئی تھی اور اسے خاموشی سے دفن کر دیا گیا تھا میڈیا کے لوگوں کو اجازت نہیں تھی کہ اس موقع پر آخری رسومات میں موجود ہوں صدر کارمک پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ چکا تھا وہ اور ان کی بیوی صدمے سے نڈھال تھے اور ان کی جگہ ان کی ذمہ داریاں نائب صدر اوڈیل ادا کر رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ کارمک کی موت کے سلسلے میں ہونے والی تحقیقات کی نگرانی کر رہا تھا۔

سائمن کارمک کی آخری رسومات کی ادائیگی کے تین ہفتے بعد صدر کارمک کو اوڈیل نے خاص کمرے میں منعقد کی جانے والی میٹنگ کی خبر دی جو صدر کے کہنے پر ہی کی گئی تھی۔ صدر کارمک میٹنگ روم میں اپنی مخصوص کرسی پر جا کر بیٹھے اور تمام ذمہ دار افراد نے اپنی اپنی رپورٹ ان کے سامنے پیش کی جو انہوں نے سائمن کارمک کے کیس کے سلسلے میں تیار کی تھی تمام صورت حال سے باخبر ہونے کے بعد صدر کارمک اپنے کمرے میں واپس آ گئے تھے انہوں نے میز پر رکھی ہوئی سائمن کارمک کی تصویر اٹھائی تھی اسے بوسہ دیا اور الٹا کر کے واپس میز پر رکھ دیا تھا۔

''خدا حافظ میرے بیٹے۔'' انہوں نے افسردگی سے کہا اور ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اس کے بعد اس نے اپنے پرائیوٹ سیکرٹری کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔

''آج میں تمام بڑے ٹی وی چینلز پر قوم سے خطاب کرنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''جی جناب۔'' سیکرٹری نے جواب دیا اور پھر اسی شام صدر کارمک نے قوم سے خطاب کیا۔

''لیڈیز اینڈ جینٹل مین امریکا کے صدر آپ سے خطاب کر رہے ہیں۔'' اناؤنسر نے کہا زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ صدر اپنے عہدے سے دستبردار ہونے کا اعلان کریں گے کیونکہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی موت سے بہت دل برداشتہ ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

اس شام صدر کارمک کو اپنے ذاتی ٹیلی فون پر ایک کال ریسیو ہوئی۔

''ہیلو۔'' انہوں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

''مسٹر پریزیڈنٹ؟''

''ہاں......کون۔''

''میں کوئین بول رہا ہوں، ثالث جسے آپ نے سائمن کو لانے کی ذمہ داری دی تھی۔''

''ہاں، یس میں سن رہا ہوں۔''

''میں نہیں جانتا کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں اس کی اب کوئی اہمیت نہیں ہے میں آپ کے بیٹے کو آپ کے پاس واپس لانے میں ناکام ہوگیا ہوں لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور قسم کھائی تھی کہ میں جب تک مجرموں تک نہیں پہنچ جاؤں گا اپنے آپ کو ظاہر نہیں کروں گا اب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہوں مجھے پتا لگ گیا ہے کہ اسے کس نے مارا اور کیوں مارا آپ اب غور سے میری بات سنیں میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''میں سن رہا ہوں۔'' صدر کارمک نے کہا۔

''کل صبح پانچ بجے وہائٹ ہاؤس کے سیکرٹ

سروس پوسٹ والے پبلک گیٹ پر ایک موٹر سائیکل سوار آئے گا وہ ایک چھوٹا لکڑی کا بکس دے گا اس میں سائمن کارمک کے کیس کی میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی ساری رپورٹ ہے یہ صرف اور صرف آپ کے لیے ہے اس کی کوئی کاپیاں نہیں ہیں آپ خاص احکامات دیں کہ وہ فوراً احتیاط کے ساتھ آپ تک پہنچا دی جائے جب آپ اسے پڑھ لیں گے تو آپ پر پوری حقیقت واضح ہوجائے گی مجھ پر بھروسہ کریں جناب صدر...... یہ آخری بار ہے گڈ نائٹ۔'' کوئین نے بات ختم کرکے ریسور رکھ دیا لیکن صدر کارمک چند لمحوں تک فون کو گھورتے رہے تھے پھر انہوں نے ریسیور رکھ دیا تھا اور انٹر کام پر اپنے سیکرٹ سروس ڈیوٹی آفیسر کو حکم دیا تھا۔

اگلے روز صدر کارمک کو علی الصبح کوئین کی تیار کردہ رپورٹ مل گئی تھی جسے انہوں نے کئی گھنٹے لگا کر پڑھا تھا اور ان پر سائمن کارمک کے قتل کی حقیقت واضح ہوگئی تھی اسے قتل کرنے والی طاقتیں بہت خطرناک تھیں ان کے کچھ عزائم تھے جو صدر کارمک جانتے تھے لیکن وہ ان کے مطالبات پورے نہیں کرسکتے تھے یہ ان کے ملک کے مفاد میں نہیں تھا اور ایسا نہ کرنے پر ان کے بیٹے کو ان کی جگہ نشانہ بنایا گیا تھا۔ کوئین نے مجرموں کے بارے میں ساری معلومات بہم پہنچائی تھیں انہوں نے یہ بتائے بغیر کہ انہیں کس ذریعے سے معلومات ملی ہیں نائب صدر اوڈیل کو بلا کر اہم احکامات دیے تھے اور چند ہی روز میں اصل مجرم گرفتار ہوگئے تھے۔

چند روز بعد صدر کارمک خود کو اس صدمے سے نکالنے میں کسی حد تک کامیاب ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ہدایت کی کہ وہ قوم سے خطاب کرنا چاہتے ہیں اور پھر اسی شام انہوں نے قوم سے خطاب کیا تھا۔

''لیڈیز اینڈ جینٹل مین امریکا کے صدر آپ سے خطاب کررہے ہیں۔'' اناؤنسر نے اعلان کیا زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ صدر کارمک اپنے عہدے سے دستبردار ہونے کا اعلان کریں گے کیونکہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے غم سے نڈھال ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

''میرے امریکی ساتھیوں۔'' انہوں نے بولنا شروع کیا ان کی آواز میں غم کا تاثر تھا لیکن ناامیدی نہیں تھی۔ انہیں ساری دنیا میں دیکھا جارہا تھا۔

''جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں میرا بیٹا سائمن ایک حادثے میں مارا گیا ہے۔ دراصل ان مجرموں کا نشانہ میں تھا اس کی کچھ سیاسی وجوہات ہیں جن میں، میں جانا نہیں چاہتا لیکن انہوں نے میرے بیٹے کو میری جگہ نشانہ بنایا لیکن میں بتانا چاہتا ہوں کہ میں اپنی جگہ سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا اور اپنے ملک کی سلامتی کا کبھی سودا نہیں کروں گا میرا بیٹا مجھ سے چھن گیا، میں غمزدہ ضرور ہوں لیکن میں ٹوٹا ہوا نہیں ہوں میرا عزم زندہ ہے آپ کا صدر زندہ ہے۔''

صدر کارمک کے خطاب کے بعد لوگوں کو اصل حقیقت معلوم ہوگئی تھی اور ان کی ہمدردیاں اپنے صدر کے ساتھ تھیں۔

کلید

شاہدہ صدیقی

شاہدہ صدیقی کا شمار ملک کی معروف خاتون صحافیوں اور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے وہ ایک نیم سیاسی پرچے کی مدیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مترجم بھی رہ چکی ہیں۔ ڈائجسٹوں خاص طور پر ابن صفی میگزین، نئے افق اور نیا رخ کے قارئین کے لیے انہوں نے انگریزی ادب کی کئی شاہکار کہانیاں اردو کے قالب میں ڈھالیں، ان کے تراجم کا انداز دیگر سے بہت مختلف ہے، وہ اتنا ڈوب کر لکھتی ہیں کہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی کہانی نہیں بلکہ کوئی سچ بیانی پڑھ رہا ہے، اس ماہ ہمارے بے حد اصرار پر انہوں نے نئے افق کیلئے دو مختصر کہانیاں ارسال کی ہیں ہمیں امید ہے کہ وہ اب قارئین کا ساتھ نہیں چھوڑیں گی اور ہر ماہ آپ کو اپنی خوب صورت تحریروں سے محظوظ کرتی رہیں گی۔

سلویا کونرز اپنے شوہر کی لاش کو گھور رہی تھی، جو کچھ اس نے اب تک پڑھا تھا اس کے برعکس اسے قتل کرنا بڑا آسان لگا۔ جب جھگڑے کے دوران جان کونرز نے اسے تھپڑ مارا تو فطری ردعمل کے تحت اس نے آتشدان سے سلاخ اٹھا کر اس پر وار کردیا تھا۔

ہاں! اسے مار ڈالنا آسان تھا لیکن سلویا کو معلوم تھا کہ اب اسے لاش ٹھکانے لگانا ہے اور یہ بہت آسان کام نہیں تھا۔

صوفے پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ اطمینان سے سوچو۔ ہنگامی صورت حال میں کامیابی کی کنجی پرسکون رہنا اور تفصیل سے غور کرنا ہے۔“

سلویا نے جرائم، جاسوسی پر اور پراسرار کہانیاں بہت پڑھی تھیں اور اسے خوب معلوم تھا کہ ناولوں میں قاتل کس طرح اپنے شکار کو ٹھکانے لگاتے تھے۔

”میں اسے عقبی احاطے میں دفن کرسکتی ہوں۔“ اس نے سوچا۔ پھر فوراً ہی خیال آیا۔ ”ناممکن، میں اتنی ساری کھدائی اور پھر جان کی لاش کو چھپانے کے لیے بھرائی نہیں کرسکتی اور پھر بلانش بھی تو مشکوک ہوجائے گی کہ جان اچانک کہاں غائب ہوگیا اور عین اسی دوران عقبی احاطے میں کھدائی بھی ہوئی۔

بلانش کا پورا نام بلانش ویبسٹر تھا اور وہ سلویا کونرز کی پڑوسن تھی سب کی ٹوہ میں لگی رہتی تھی۔ اس کے علم میں آئے بغیر کوئی کام کرپانا جان جوکھم میں ڈالنا تھا۔

”بلانش نے شام کو جان کو گھر سے جاتے دیکھا تھا۔“ سلویا نے سوچا۔ ”میں نے دیکھا تھا کہ اس نے جان کو ہاتھ ہلایا تھا لیکن جب وہ واپس آیا تو بلانش گھر پر نہیں تھی۔ کیوں نہ میں اس سے فائدہ اٹھاؤں۔“

سلویا اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے اس کی نظر شام کے اخبار پر پڑی جس میں کسی تھیٹر کا اشتہار چھپا ہوا تھا۔

”زبردست۔“ اس کے منہ سے نکلا۔ ”میں یہاں سے کار لے کر جاؤں اور جان کی لاش بالغوں والے سینما کی گلی میں ڈال کر کار بھی وہیں چھوڑ دوں۔ اس



سے لگے گا کہ شہر کے اس مشکوک علاقے میں اس پر حملہ ہوا اور وہ ہلاک ہوگیا۔" سلویا کو اپنی ذہانت پر خود ہی رشک آنے لگا۔ "بس پھر مجھے کسی کی نظروں میں آئے بغیر گھر واپس آنا ہے لیکن کیسے؟" اس سوال کا جواب بھی ایک جھماکے سے اس کے ذہن میں آگیا۔ وہ کسی طوائف کے بھیس میں وہاں جائے گی۔ سلویا کو یاد آیا کہ گزشتہ ہیلووین کی رات اس نے ایک فینسی ڈریس میں طوائف بن کر ہی حصہ لیا تھا اور اس کے پاس وہ بلاؤز، منی اسکرٹ، جالی دار اسٹاکنگز اور وگ کہیں الماری میں اب بھی رکھی تھی۔ ذرا سا میک اپ اور پھر بہروپ مکمل۔

"تو اب کام شروع کردیا جائے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

سب سے پہلے اس نے جان کے سر پر ایک پلاسٹک کا تھیلا چڑھایا تا کہ لاش کو حرکت دیتے ہوئے خون ادھر ادھر نہ لگے۔ اس کے بعد جان کا بٹوا جیب سے نکال کر اسے خالی کیا، پیسے اپنے پاس رکھ لیے اور انگوٹھی اتار کر رکھ لی کہ راستے میں کہیں پھینک دے گی۔

جان کی لاش اس کے اندازے سے زیادہ بھاری نکلی۔ یہاں بھی پڑھی ہوئی جاسوسی کہانیاں اس کے کام آئیں اور اس نے گیرج سے برف گاڑی نکال کر اس سے مدد لی۔ اس میں رکھ کر لاش کو سیڑھیوں سے اتارنا اور کار تک پہنچانا قدرے آسان تھا۔

جان کی لاش کو کار کی اگلی نشست پر بٹھانا البتہ پھر ایک دشوار مرحلہ تھا۔ بمشکل تمام اس نے لاش کو پہلو کے بل نشست پر ڈالا اور اس پر وہ برساتی ڈال دی جو اسے پہننا تھی۔

آہستہ آہستہ اور بغیر لائٹس جلائے اس نے کار گیرج سے نکالی تا کہ ہر وقت ٹوہ میں رہنے والی بلانش کو کچھ نظر نہ آسکے۔

اگلے پندرہ منٹ تک سلویا بڑی احتیاط سے گاڑی چلاتی رہی تا کہ کسی بھی غلطی کے سبب وہ پولیس کی نظر میں نہ آجائے۔

آخرکار وہ شہر کے اس علاقے میں جا پہنچی جہاں جنسی کتابوں اور فلموں وغیرہ کی دکانیں اور بالغوں کے لیے مخصوص تھیٹر تھے۔ خوش قسمتی سے ایک پتلی سی گلی اسے نظر آگئی جو ایک تھیٹر اور کتابوں کی دکان کے درمیان واقع تھی۔

سلویا نے گاڑی سڑک کے کنارے پارک کردی۔ کافی دیر وہ اپنی نشست پر بیٹھی چاروں طرف کا جائزہ لیتی رہی اور جب اطمینان ہوگیا کہ دور دور

تک اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تو وہ کار سے نکلی اور جان کی لاش نکال کر جلدی جلدی اسے گھسیٹتے ہوئے نصف گلی عبور کرلی۔لاش نیچے ڈال کے اس نے جان کی جیبیں باہر نکال دیں اور خالی بٹوہ وہیں پھینک دیا تا کہ وہ فوراً نظر میں آ جائے۔

اس کے سر سے تھیلی اتار کے وہ کار کی طرف پلٹی، دروازے مقفل کیے اور تیزی سے گلی سے نکل آئی۔وہاں سے تین بلاک دور آ کے اس نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو شہر کے سب سے بڑے مال کی طرف چلنے کے لیے کہا۔

ٹیکسی کی عقبی نشست پر بیٹھ کر وہ دھیرے سے مسکرادی۔اب اس کا اعتماد اور سکون واپس آ گیا تھا۔

''کامیابی کی کنجی نارمل رہنا ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

مال پہنچ کر اس نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور اس وقت تک وہیں رکی رہی جب تک کہ ٹیکسی اوجھل نہیں ہوگئی۔اب اس کا رخ مال کے عقبی حصے کی طرف تھا جہاں عملہ اپنی کاریں پارک کرتا تھا۔اس سنسان جگہ اس نے تیزی سے اپنی وگ، شوخ بلاؤز، منی اسکرٹ اور اونچی ایڑی والی سینڈل اتاری۔جلدی جلدی جینز، سوئیٹر اور جوتے پہن کر برساتی اوڑھی اور طوائفوں والا لباس بیگ میں ڈال لیا۔

مال کے سامنے والے حصے کی طرف آ کے اس نے بس پکڑلی اور گھر روانہ ہوگئی۔

اسے اندازہ تھا کہ لاش ٹھکانے لگانا کتنا دشوار ہوگا۔وہ کافی تھک گئی تھی۔

سلویا اپنے اسٹاپ سے کئی بلاک پہلے ہی بس سے اتر گئی اور باقی راستہ اس نے پیدل طے کیا۔گھر قریب آتے ہی وہ خاموشی سے گیرج کے ذریعے اندر آ گئی۔وہ باورچی خانے سے گزرتی ہوئی اندھیرے میں ہی بیڈروم میں پہنچی۔کپڑے تبدیل کیے اور اندھیرے میں ہی بستر پر دراز ہوگئی۔بلانش کو پتا چلنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔

❁❁❁

''میں تمہیں بتاؤں بلانش۔'' سلویا اگلی صبح کافی پیتے ہوئے بولی۔''جان گھر آئے تو سہی میں اس سے اچھی طرح نمٹ لوں گی۔کل شام یہ کہہ کر نکلا تھا کہ اسے ایک میٹنگ میں جانا ہے اور پھر پلٹ کر آیا ہی نہیں۔''

''میں نے کل شام اسے جاتے دیکھا تھا۔'' بلانش بولی۔''چھ بجے تھے شاید ہے نا؟''

''ہاں، یہی وقت رہا ہوگا۔نشے میں دھت کسی دوست کے گھر پڑا ہوگا۔یا ساری رات پوکر کھیلتا رہا ہوگا۔آنے تو دو اسے، پھر تم دیکھنا۔''

دروازے پر ہونے والی دستک نے ان کی باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

سلویا نے دروازہ کھولا تو ایک پولیس والا وردی میں ملبوس کھڑا تھا۔

''مسز کونرز؟'' اس نے پوچھا۔''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ خبر آپ کو کیسے دوں لیکن آپ کے شوہر کی لاش آج صبح ایک گلی میں پائی گئی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ انہیں لوٹا گیا ہے۔'' سلویا نے اپنے ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔اس کے خیال میں اس حرکت سے حیرت اور صدمے کا اظہار ہونا چاہیے تھا۔وہ صوفے پر گر بھی پڑی تھی۔مزید تاثر کے لیے اس نے کانپنا اور لرزنا بھی شروع کر دیا تھا۔

پولیس والا اندر آ گیا تھا اور چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔اس کی نظریں دروازے کے دائیں طرف لگی چابیاں لٹکانے کی تختی پر ٹک گئی تھیں۔یہ دروازہ گیرج کی طرف جاتا تھا۔وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔''عجیب بات ہے، ہمیں آپ کے شوہر کی لاش

دعا

اے اللہ ہم عاجز بندے ہیں تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیرے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اے اللہ ہمارے صغیرہ کبیرہ چھوٹے بڑے ظاہر باطن اگلے پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرمادے ہماری خطاؤں کو درگزر فرما' ہم سچے دل سے توبہ کرتے ہیں ہماری خطاؤں کو معاف فرما۔ اے اللہ جو جان کے گناہ کیے ہیں اور جو انجانے میں ہوئے ہیں سب کو اپنے حبیب پاک ﷺ اور قرآن پاک کے صدقے میں معاف فرما۔ اے اللہ ہمیں نجات عطا فرما تیری معافی بڑی چیز ہے۔ اے اللہ اگر تو نے معاف نہ کیا تو ہم کس کے در پر جائیں گے۔ اے اللہ تیرا در اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک ہمیں معافی نہ مل جائے اے اللہ اگر تو نے معاف نہ کیا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اے اللہ بے روزگار کو روزگار عطا فرما۔ اے اللہ ہمارے نگہبان ہمارے جان و مال عزت و آبرو مکان دکان سب چھوٹے بڑوں کی پوری طرح حفاظت فرما۔ اے اللہ ہمیں ہر قسم کی بلاؤں سے ناگہانی آفتوں اور مصیبتوں سے بچا اور اچانک موت سے بچا۔ ہمارے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرما۔ اے اللہ ہماری گھریلو مشکلات کو حل فرما ہمارے گھروں میں خیر و برکت عطا کر اے اللہ ہم سب کے گھر والوں میں سچی محبت اور پیار عطا فرما۔ اے اللہ! ماں باپ' بہن بھائیوں خاوندوں بیویوں میں سچی محبت دے اے اللہ بچھڑے ہوؤں کو ملا دے روٹھے ہوئے کو منا دے۔ اے اللہ ہماری دلی تمنائیں پوری فرما۔ اے اللہ ہمارے لڑکے لڑکیوں کو پاک دامنی نصیب فرما نیک ازواج نصیب فرما۔ ہم سب کا نصیب اچھا کر دے۔ اے قدرت والے ہماری ساری الجھنوں کو دور کر دے اور ہماری نیک مرادیں پوری کر دے اے اللہ ہم سب مسلمانوں کو دیس اور پردیس میں چین امن و سلامتی عطا کر۔ اے اللہ تنگ دستوں کی تنگدستی دور فرما۔ اے اللہ بے اولاد کو نیک اور صالح اولاد عطا فرما۔ اے اللہ حضرت آدمؑ جیسی توبہ نصیب فرما۔ اے اللہ ہمیں حضرت یعقوبؑ جیسی گریہ وزاری عطا فرما۔ اے اللہ حسن یوسفؑ جیسا حسن عطا فرما۔ اے اللہ حضرت ابراہیمؑ جیسی دوستی نصیب فرما۔ اے اللہ حضرت ایوبؑ جیسا صبر عطا فرما۔ اے اللہ حضرت داؤدؑ جیسا سجدہ شکر نصیب فرما۔ اے اللہ حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسا سچا بنا۔ اے اللہ حضرت عمرؓ جیسی خدمت اسلام رعب و دبدبہ شان و شوکت عطا فرما۔ اے اللہ حضرت عثمانؓ جیسی شرم و حیا اور خزانہ عطا کر۔ اے اللہ حضرت علیؓ جیسی شجاعت بہادری و سخاوت عطا فرما۔ اے اللہ حضرت محمد ﷺ جیسے تمام عمل نصیب فرما۔

اقبال بھٹی...... کراچی

ان کا بٹوا اور ان کی کار تو گلی میں ملی لیکن کار کی چابیاں نہیں ملیں۔"

اس نے چابی کے ایک چھلے کو اتار لیا تھا جس پر جے سی کے انگریزی حروف کندہ تھے۔ "میں حیران تھا کہ وہ بغیر چابی کے کار چلاتے ہوئے وہاں کیسے پہنچے ہوں گے؟"

سلویا پرانی عادت کے تحت کار کے دروازے مقفل کر کے چابیاں پرس میں ڈالنا اور آتے ہی چابیاں تختی پر لٹکانا نہیں بھولی تھی۔

ناتمام عشق

محمد یاسین صدیق

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔
وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا
اب اس کا حال سنائیں کیا
مگر وہ عاشق ہی کیا جو اپنا حال دل نہ سنائے۔
ایک نا تمام عشق کی روداد' وہ مل کر بھی نہ مل سکے۔

وہ بائیس برس بعد میرے سامنے تھا۔ میں نے اسے ایک ہی نگاہ میں پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے وہ راتیں یاد آ گئیں جنہیں میں اپنی زندگی سے چاہتے ہوئے بھی نہیں کھرچ سکتا تھا۔ اس نے ابھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ شادی کا ہنگامہ تھا۔ میں چپ چاپ وہاں سے پلٹ کر اپنے گھر آ گیا۔

یادوں نے مجھے آکٹوپس کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہوا تھا۔ شبیر کا چہرہ اور اس کی ضائع شدہ آنکھ مجھے بھول نہیں رہی تھی اور اس کی اوٹ سے وہ مہ رخ، جو میرا پہلا پیار تھا، اس کا چہرہ مجھے بائیس برس بعد کے ان دنوں میں لے گیا، جب ہم ایک کھیت میں باتیں کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ سنا تھا اس کی تھوڑی دھلائی کی گئی تھی۔ پھر اسے شہر اس کے تایا کے ہاں بھیجنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ جب ناہید کو یقین ہو گیا کہ اب اس کا گاؤں میں رہنا مشکل ہو جائے گا تو اس نے میرے نام ایک محبت نامہ لکھا۔ جو اس کے جانے کے دو دن بعد مجھے ملا۔ جس سے مجھے اس کے تایا شاہد اور اس کے بیٹے غفور کا علم ہوا جو پولیس میں سپاہی تھا۔ ناہید نے لکھا تھا۔

''اب مجھے امی ابو شہر تایا شاہد کے پاس بھیج دیں گے۔ تم میرے پیچھے آنے کی کوشش نہ کرنا۔ تایا کا ایک بیٹا غفور پولیس میں ملازم ہے۔ وہ تمہیں تھانے بند کر دے گا اور کوئی کیس ڈال دے گا۔'' اس نے خط میں جدائی اور ہجر کے نوحے لکھنے کے ساتھ چند شعر بھی لکھ مارے تھے۔

اپنی طرف سے ناہید کے والدین نے بڑی عقل مندی کی تھی کہ اسے گاؤں سے شہر بھیج دیا تھا۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ اس طرح وہ اس بدنامی سے بچ جائیں گے جو میرے اور ناہید کے عشق سے ہو رہی تھی۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں شہر بھی پہنچ جاؤں گا۔ چار دن پہلے ناہید کو اس کے والدین نے شہر رانا شاہد کے ہاں بھیج دیا تھا۔ میں نے بھی شہر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک صبح میں شہر پہنچ گیا۔ غفور کی وجہ سے میں نے اس کا گھر تلاش کر لیا۔ تھانے سے مجھے غفور کے ایک ساتھی پولیس والے نے بتایا تھا کہ وہ برکت کالونی میں رہتا ہے۔ برکت کالونی میں سارا دن چکر لگا کر میں نے ان کا گھر ڈھونڈ لیا۔ یہ میری محنت کا ہی نتیجہ ہی تھا کہ مجھے شام کو اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر بنی ایک چھوٹی سی دکان پر کھڑا دیکھ کر ناہید نے پہچان لیا۔ وہ اپنے کزن غفور کو ہیلمٹ دینے باہر نکلی تھی جو موٹر سائیکل لیے گھر سے برآمد ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ



نظروں سے اوجھل ہوا، میں ان کے گھر کی طرف لپکا۔ ناہید کا تو رنگ اُڑ گیا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''آج رات بارہ بجے آؤں گا۔ دروازہ کھلا رکھنا۔''

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے۔ اس نے کیا کہا مجھے سنائی نہیں دیا۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تھا تو وہ گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ کالونی شہر کی بالکل ابتدا میں تھی۔ اسے شہر کے اختتام پر بھی کہا جا سکتا تھا۔ یہ تو اس پر منحصر تھا کہ آپ شہر کے کس طرف کھڑے ہیں۔

باقی وقت شہر میں گھوم کر گزارنے کے بعد میں رات بارہ بجے دوبارہ وہاں جا پہنچا۔ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی کالونی میں ہو کا عالم تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر دروازے پر دباؤ ڈالا۔ یہ کیا وہ تو اندر سے بند تھا۔ کیا ناہید کو جو میں نے کہا تھا اُسے سنائی نہیں دیا تھا یا پھر اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ مجھے یہ امید نہیں تھی۔ تھوڑا اور زور لگایا لیکن وہ بند تھا۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ اس ٹوٹے دل کے ٹکڑے ہی چن رہا تھا بقول شاعر جو کوئی یہاں گرا تھا کوئی وہاں گرا تھا کہ ایسے لگا جیسے کسی نے اندر سے کنڈی کھولی ہو۔ میں دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ اس طرح میں گلی کی دونوں طرف نظر رکھ سکتا تھا۔ کنڈی کھلی تو میرے دباؤ سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔

''ہائے اللہ!'' کی سریلی چیخ نے ماحول کے سکوت کو توڑ دیا۔ یہ چیخ ناہید ہی کی تھی۔ پھر اسے خود ہی احساس ہوا کہ اس سے غلطی ہو چکی ہے۔ میں گھر میں داخل ہوا۔ میری پیاسی نظریں اندھیرے میں اس کے لب و رخسار کا طواف کر رہی تھیں کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے ناہید کو اپنے ساتھ ہی دیوار سے لگا لیا۔ ہمارے سامنے صحن تھا۔ اس کے بعد برآمدے تھے جو کہ کمروں کے آگے بنے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلا۔ ناہید نے تیز سرگوشی کی۔

''بھائی شبیر!''

میں نے سامنے دیکھا اس کے تایا زاد بھائی شبیر نے لائٹ جلا دی۔ ہم روشنی میں نہا گئے۔ پھر سب کچھ بڑی تیزی سے ہوا۔ وہ تیزی سے ہماری طرف، میں باہر دروازے کی طرف۔ ناہید اندر کمرے کی طرف ایک ساتھ بھاگے۔

''رک خبیث......'' شبیر دھاڑتے ہوئے میری جانب بڑھا۔ وہ مجھ سے دوگنا عمر، دوگنا جسامت میں ہونے کے باوجود دوگنا رفتار سے بڑھا تھا۔

''بھاگ جاؤ سکندر۔''

ناہید نے یہ دوسری غلطی کی کہ میرا نام لیا۔ میں دروازے کے پاس پہنچ چکا تھا کہ اس سانڈ نے پیچھے سے میری قمیص پکڑ کر کھینچ لی۔ اگر میں پکڑا جاتا تو تھانہ حوالات میرا مقدر ہوتی۔ یہ تو ناہید نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ حوالات کا تصور کر کے مجھے جھرجھری آ گئی۔ جیسے ہی شبیر نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ میں اس کی جانب گھوما۔ پوری طاقت سے اس کے پیٹ میں مکا مارا اور ایک قدم پیچھے ہٹا۔ وہ پیٹ پکڑے آگے جھکا پھر میری ٹانگ اٹھی، جوتے کی ٹو سیدھی اس کی پیشانی سے ذرا نیچے ٹکرائی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ یہ چوٹ اس کے لیے غیر متوقع ہونے کے ساتھ شدید بھی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں پر حملہ نہیں کیا تھا۔ اندازے کی غلطی ہو گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے اور اسپرنگ کی طرح اوپر کو اچھلا۔ میں نے اس کے سینے میں ٹکر جڑ دی۔ یہ تین ٹھوکریں اس کے لیے کافی تھیں۔ وہ زمین بوس ہو گیا۔

''ہائے اللہ۔ یہ کیا کیا تم نے۔ اب بھاگ جاؤ

یہاں سے۔" ناہید کی آواز میں خوف کے ساتھ حیرانی بھی تھی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اس کی رنگت گلابی ہو گئی تھی۔ صحن میں جلتے بلب کی روشنی میں جلتے ہونٹ ملے۔ یہ موقع نہیں تھا کہ میں اس کے عارض کے مزید رنگ چراتا۔ صرف ٹھنڈی سانس لے کر اس کا بازو چھوڑ دیا۔ ناہید نے مجھے دھکا دیا اور تیز سرگوشی کی۔ "اب بھاگ جاؤ۔"

اس دوران شبیر اٹھ بیٹھا تھا اور مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ میرا وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ بعد میں جو ہوتا سو ہوتا، اس وقت تو مجھے غائب ہو جانا چاہیے تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اس مکان سے دور ہوتا چلا گیا۔

ایک گلی مڑا پھر دوسری۔ نہ جانے کہاں ایک کتا بیٹھا تھا، میرے پیچھے لپکا۔ میں ایک دم رکا۔ اس کے حملے سے بچنے کے لیے خبیث نے مجھ پر چھلانگ لگا دی تھی۔ میں دو قدم پیچھے ہٹا اور زور سے ٹانگ گھمائی جو اس کی پسلی میں لگی۔ وہ چیاؤں کرتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ میں تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ اس دوران میں نے اپنی جیب سے چاقو نکال لیا تھا۔ میں نے فلموں سے متاثر ہو کر جیب میں چاقو رکھنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے ان دنوں نوجوان فلموں سے متاثر ہو کر ہیر اسٹائل ہیرو جیسا بنا لیتے تھے۔ ان دنوں میرے پاس جو چاقو تھا وہ چھوٹا سا تھا۔ چائینا کا بنا ہوا' جس کے دستے پر خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ چاقو پاس رکھنے کی یہ عادت اب تک میرے ساتھ ہے۔ زندگی میں چاقو بدلتے رہے لیکن یہ عادت نہیں بدلی۔

مجھے اس کالونی سے جلد باہر نکل جانا تھا۔ مین سڑک کالونی کی دوسری طرف تھی۔ میں دوسری طرف جا رہا تھا یہ آخری گلی تھی۔ اس وقت بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک مصیبت سے نکلا تھا یہ دوسری مصیبت گلے پڑ رہی تھی۔ کتے میرے نزدیک پہنچ رہے تھے۔ میرے سامنے کھیت تھے۔ اب بھاگنا بے وقوفی ہوتا۔ قریبی گھر کے دروازے پر میں نے دباؤ ڈالا۔ میں حیران ہوا وہ کھلا ہوا تھا۔ دبے قدموں اندر داخل ہو گیا۔ آہستگی سے دروازے کو بند کر دیا لیکن کنڈی نہیں لگائی۔ کتنے بے پروا تھے یہ مکین جیسے چوری کا کوئی ڈر ہی نہ ہو۔ رات کا ایک بج رہا ہوگا، کافی سردی تھی۔ میں ایک دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیرے میں گھر کا جائزہ لیا۔ صرف تین کمرے تھے جو بند تھے۔ چاقو میری مٹھی میں تھا۔ باہر کتوں کے بھونکنے کی آواز بند ہو گئی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر مزید کھڑا رہنے کا سوچا۔ پھر نکل جانے کا ارداہ کیا۔ ناہید کے ایک تایا زاد بھائی کو تو میں لمبا لٹا آیا تھا۔ اب اس کے دوسرے تایا زاد بھائی بھی بیدار ہو گئے ہوں گے اور کیا خبر مجھے تلاش کر رہے ہوں۔ ان میں ایک تو پولیس میں ملازم بھی تھا۔

یہی سوچتے ہوئے اس گھر کی دیوار سے لگ کر کھڑے آدھا گھنٹا ہو گیا تھا۔ باہر جانے کے لیے جیسے ہی میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے وہ اس سے پہلے کھل گیا۔ میں دوبارہ دیوار سے جا لگا۔ ایک سایہ سا اندر داخل ہوا۔ میں نے اپنی سانس روک لی۔ وہ سایہ دوسری طرف دیوار سے لگا آگے بڑھنے لگا۔ میں چونک گیا۔ سایہ کسی عورت کا تھا اور وہ چوروں کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔ بائیں طرف کے سب سے پہلے کمرے پر اس نے دستک دی تو دروازہ کھل گیا۔ اندر مدھم روشنی تھی جس میں ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا کھڑا دکھائی دیا تھا۔ وہ عورت اندر داخل ہوئی لیکن لڑکا باہر نکل آیا۔ لڑکا دیگر

دروازوں کی طرف بڑھا۔وہ ایک ایک دروازے کے سامنے جاتا۔تھوڑی دیر وہاں رکتا پھر دوسرے دروازے کے سامنے جا پہنچتا۔کھڑے کھڑے میری ٹانگیں جواب دے گئی تھیں میں بیٹھ گیا۔لیکن میرے سامنے کا منظر مجھے تجسس میں ڈال رہا تھا،جس سے مجھے اپنی تھکن کا ہوش نہ رہا۔اندھیرا تھا بہت غور کرنے پر مجھے سمجھ آئی کہ وہ ان دروازوں کی کنڈی لگا رہا تھا۔یہ تو کوئی اور ہی چکر محسوس ہو رہا تھا۔

لڑکا سب دروازوں کی باہر سے کنڈی لگا کر اسی کمرے کی طرف بڑھ گیا مجھے اپنے اور ناہید کے اناڑی پن پر غصہ آیا،اب سمجھا محبوبہ کو رات کے وقت اگر اس کے گھر ملنے جاؤ تو اس کے کیا آداب ہوتے ہیں۔مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا سردی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ویسے تو میں نے کوٹ اور مفلر پہنا ہوا تھا۔پھر بھی سردی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن اب مجھے اس کمرے سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی جس میں وہ عورت اور لڑکا تھے۔میں اٹھ کھڑا ہوا لڑکے نے سب دروازے بند کر دیئے تھے اس لیے اپنے کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔میں نے دروازہ بڑی احتیاط سے کھولا اتنی احتیاط سے کہ ذرا بھی آواز پیدا نہ ہو۔میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔میں دبے قدموں آگے بڑھنے کی بجائے وہیں دروازے کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔کمرے میں یوں تو دو چارپائیاں تھیں لیکن ایک خالی تھی اور دوسری پر دو وجود ایک رضائی کے نیچے متحرک تھے۔میرے وجود میں سنسناہٹ بکھرتی چلی گئی۔میں نے رضائی کا ایک کونا پکڑ کر کھینچا تو دونوں کی چیخ نکل گئی۔چیخ اتنی بلند نہیں تھی کہ دوسرے کمروں تک پہنچ پاتی۔چار آنکھیں حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ان کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔انہوں نے خود کو ملبوس کرنے میں دیر نہیں لگائی۔اس وقت تک میں نے بورڈ تلاش کر کے بلب روشن کر دیا۔اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔عورت کی عمر کسی طرح بھی چالیس سے کم نہیں تھی بے شک وہ خوش بدن تھی۔اس وقت لڑکا میری منت کر رہا تھا۔

"مجھ سے غلطی ہو گئی میں مجبور تھا مجھے معاف کر دیں۔"

عورت کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔

"اچھا رشید میں چلتی ہوں۔" کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے باہر نکل گئی۔مجھے کیا کرنا چاہیے،میں سوچتا ہی رہ گیا۔میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور رشید سے مخاطب ہوا۔

"جاؤ۔پہلے کمروں کے دروازوں کی کنڈی کھول آؤ اور باہر والے دروازے کی کنڈی لگا آنا،ٹینشن نہ لو،میں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" وہ بکھرا بکھرا سا باہر نکل گیا۔اس کے واپس آنے تک میں چارپائی پر سیدھا ہو کر لیٹ چکا تھا،سردی سے برا حال تھا،میں نے رشید کے چارپائی پر بیٹھ جانے کے بعد کہا۔" میں صبح سے پہلے چلا جاؤں گا۔"

"آپ کون ہیں یہاں کیسے؟" اس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں وہ سوال کر دیا جو اسے پریشان کر رہا تھا

"مجھے چھوڑو۔یہ بتاؤ یہ عورت کون ہے اور تم مجبور کیوں ہو اس کے سامنے؟" میں نے اسے مزید تسلی دی۔

"میرے لیے پریشان نہ ہو میں مسافر ہوں ایک کام سے آیا تھا،جو نہیں ہوا،بعد میں بتاتا ہوں کہ کون سے کام آیا تھا اور ہاں اگر گھر والوں کی طرف

سے کوئی آجائے تو کہہ دینا میرا دوست ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر پوچھا۔''آپ کا نام۔''اس کی آواز میں ابھی تک بے یقینی تھی

''سکندر۔''اپنا نام بتا کر میں نے پھر اپنا سوال دہرایا اور مزید کہا۔''ہاں اب میرے سوال کا جواب بھی دے دو۔''

اس نے جو کچھ بتایا مختصر یہ تھا کہ عورت کا نام صفیہ ہے۔اس کی محلے دار ہے۔اس کا خاوند فوت ہو چکا ہے۔بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ایک بیٹا ہے لیکن وہ لاہور میں کام کرتا ہے۔اکیلی رہتی ہے۔رشید کے گھر آنا جانا ہے۔گزشتہ دو ماہ سے رشید کے ساتھ وہ یہ کھیل کھیل رہی ہے۔پہلی مرتبہ رشید اس کے شکنجے میں پھنسا اس وقت رشید کے سر پر بھی شیطان سوار تھا۔اس کے بعد اب اس نے جس رات آنا ہو وہ اسے دن کو کسی وقت بتا دیتی ہے۔ایسے ہی وہ ملتے ہیں۔جب وہ خاموش ہوا تو میں مسکرا دیا۔

''اچھی جوڑی ہے۔''وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔میں نے اسے مزید شرمندہ نہیں کیا اور اپنے بارے میں بتانے لگا۔شہر سے بیس کلو میٹر دور جی ٹی روڈ پر چک اکیس میرا گاؤں ہے۔ایف اے تعلیم ہے۔گاؤں کی لڑکی ناہید جو چوہدری عابد کی بیٹی ہے سے محبت کر بیٹھا۔ہم بھی رانا فیملی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن رشتہ دار نہیں ہیں۔ہم غریب ہیں اور وہ امیر۔میرے والد کی پرچون کی دکان ہے گاؤں میں۔ناہید کے والد زمین دار۔ناہید اپنے والدین کی اکلوتی اولاد۔میرے دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔میں بے روزگار ہوں۔اب سوچا ہے شہر میں کام تلاش کر لوں۔میری بات روک کر رشید نے کہا۔

''کام کی آپ فکر نہ کریں میرے والد ایک کاٹن فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔وہاں آپ کو کام مل

جائے گا۔'' وہ رکا پھر جلدی سے بولا ''ہمارے گھر آدھی رات کیسے؟'' اب رشید کے لہجے میں اعتماد لوٹ آیا تھا۔

''اسی طرف تو آرہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کے بعد وہ واقعہ بتایا جس وجہ سے میں اب اس کا بن بلایا مہمان تھا۔ ساری بات سن کر اس نے کہا۔

''اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔'' میں اب گاؤں چلا جاؤں گا۔ تم میرا پیغام کسی طرح ناہید تک پہنچا دینا میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس کے چہرے پر ایک چمک پیدا ہوئی۔

''یہ کام سمجھو ہو گیا۔''

''کیسے ہو گیا......؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا اس نے بتایا کہ وہ صفیہ سے کہے گا۔

''صفیہ کر دے گی اور کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔''

''ویری گڈ۔'' میں خوش ہو گیا۔ رشید بجھ گیا اور کہنے لگا ''لیکن اس کی شرط ماننا پڑے گی۔''

''پہلے بھی تو مان رہے تھے ایک گناہ اور سہی۔''

ہم دونوں مسکرا دیئے۔ اس کے بعد ہم باتیں کرتے رہے۔ بہت ہی کم وقت میں رشید میرا دوست بنا۔ میں نے جانے سے پہلے اسے پھر یاد دلایا کہ ''میں ناہید سے ملنا چاہتا ہوں اور ہاں میرے کام کے متعلق بھی اپنے والد سے بات کر لینا۔''

''کل کر لوں گا۔''

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' پھر میں نے حساب کر کے بتایا۔'' میں دس دن بعد جمعہ کی شام کو آؤں گا'' وہ مجھے چھوڑنے کے لیے باہر تک آیا۔ صبح ہو گئی تھی میں جلد ہی اڈے پر پہنچ گیا۔ دس بجے میں اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ شہر میں چوبیس گھنٹے گزار کر۔ تھکاوٹ سے میرا برا حال تھا۔ بس میں بیٹھتے ہی نیند آگئی۔ اپنے گاؤں سے اگلے سٹاپ پر آنکھ کھلی وہاں سے پھر واپس اپنے گاؤں آنا پڑا تھا۔

میں اپنے والد کو شہر کام کی تلاش کا کہہ کر گیا تھا۔ واپس آ کر میں نے سب گھر والوں کو کام ملنے کی خوشخبری سنائی۔ امی سب سے زیادہ خوش ہوئیں۔ مائیں معمولی بات پر خوش ہو جاتی ہیں۔ مجھے تیس جنوری کو شہر جانا تھا۔ یکم فروری کو پہلا دن ڈیوٹی کا تھا۔ ابو کا خیال تھا حسب سابق میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں نے ان سے بحث نہیں کی۔ دوسرے دن سے میں نے گھر کے کام کرنے شروع کر دیئے۔ صبح دکان کی صفائی بھی کر دیتا۔ بھینس کو پانی پلانا، چارہ لانا، وغیرہ ایسے سب کام گھر والے مطمئن ہوتے چلے گئے۔ شام کو میں دوستوں سے ملنے نکل جاتا۔ مجھے بڑی شدت سے انتظار تھا کہ شہر سے کوئی بری خبر آئے گی، میرے خیال میں شبیر کو اچھی خاصی چوٹ لگ گئی تھی۔ اس لیے ان کی طرف سے ردعمل آنا چاہیے تھا، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اب گاؤں میں میرے لیے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے گاؤں آئے ہوئے چھ دن گزر گئے تھے کہ ناہید کی سہیلی نازی مجھ سے ملنے آئی۔ میں دکان پر بیٹھا تھا۔ ابو کی طبیعت خراب تھی۔ وہ کچھ پریشان تھی۔ اس کی بات سن کر میری پریشانی کتنی بڑھی میں یہ نہیں کہوں گا کہ اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، میں اپنی پریشانی کو بیان کر سکتا ہوں۔ پہلے نازی کی خبر سن لیں جو مجھے وہ اس دن بتانے آئی تھی

''بھائی آپ کو بتانا تھا کہ ناہید کی منگنی ہو چکی ہے۔''

''کیا بکواس کرتی ہو۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا، اس نے فوراً مزید کہا

''کل منگنی ہوئی ہے۔''

"کہاں...... کس سے...... تم کو کس نے بتایا؟"

میں نے ایک ساتھ پوچھا تو اس نے بتایا۔

"کل ناہید اور اس کے تایا جان آئے تھے۔ گاؤں میں اور ناہید کی منگنی اس کے خالہ زاد سے ہوئی ہے جو لاہور میں رہتے ہیں۔ چند مہمان آئے تھے۔ میں نے سنا ہے اس کی جلد شادی بھی کر دی جائے گی۔ لڑکے نے باہر جانا ہے۔ منگنی کے بعد شام کو ناہید اپنے تایا کے ساتھ ہی واپس شہر چلی گئی۔ مجھے بھی وہ سرسری سی ملی جیسے اس پر دباؤ ہو اور وہ مجبور ہو اس نے مجھے کہا کہ سکندر سے کہہ دینا، مجھے بھول جائے اور ملنے کی بالکل کوشش نہ کرے۔ ناہید نے نازی کو یہ بھی بتایا کہ سکندر مجھے شہر میں ملنے آیا تھا اس کی لڑائی شبیر سے ہوگئی تھی شبیر کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی ہے۔ انہوں نے ناہید کے والدین سے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ ناہید کی شادی جلد اور خاموشی سے کر دی جائے۔ نازی سے مجھے احتیاط سے رہنے کی نصیحت کی اور بتایا کہ ناہید کے کزن تو آپ سے بدلہ لینا چاہتے تھے خالہ رقیہ (ناہید کی والدہ) نے ان کی منت کی کہ اس سے ان کی بدنامی ہوگی اور اگر لڑکے والوں تک یہ بات پہنچ گئی تو لڑکی کی شادی میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اس لیے آپ سے بدلہ انہوں نے وقتی طور پر کینسل کر دیا ہے جب ناہید کی شادی ہو جائے گی تو آپ سے پوچھا جائے گا۔"

نازی تو یہ سب مجھے بتا کر چلی گئی۔ میرے لیے یہ سب ایک بم دھماکے سے کم نہیں تھا۔ مجھے اپنے خواب و خواہشات بکھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ کافی دیر تک تو میں بے خیالی میں بیٹھا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جسم بے جان ہو گیا ہے۔ جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اس کا سبب میری بے بسی تھی۔

باقی چار دن بڑی بے چینی سے گزارے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ناہید کو بھگا لے جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں تیاری میں لگ گیا اور وعدے کے مطابق شہر آ گیا۔ سب سے پہلے میں رشید کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنے والد سے بات کر لی تھی اور اس کے والد نے کہا تھا کہ جیسے ہی سکندر آئے اسے فیکٹری بھیج دینا۔ شہر سے تین کلومیٹر دور فیکٹری تھی۔ صفیہ نے ابھی تک رشید کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے رشید کو بتایا کہ ناہید کی منگنی ہو چکی ہے اور جلد ہی شادی کر دی جائے گی میں نے اسے مزید کہا۔

''یار تم صفیہ سے مجھے ملوا دو میں اس کی منت کر لیتا ہوں۔'' میں نے التجا آمیز لہجے سے کہا۔ میرے لہجے میں جانے کیا تھا کہ رشید نے فورا کہا۔

''نہیں نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں آج صفیہ سے مل لیتا ہوں اسے بتا دیتا ہوں۔'' میں نے کچھ کہنے کے لب کھولے اور پھر خود ہی بند کر لیے وہ کہہ رہا تھا اب یہ یاد نہیں کہ کتنے لب کھولے تھے بند اس لیے کیے کہ رشید کہہ رہا تھا ''تم فیکٹری جاؤ وہاں ابو سے ملو اور کام پر لگ جاؤ۔ میں خود تم سے وہاں آ کر ملوں گا۔'' اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کھانا ان کے گھر سے کھایا اور اس کے بتائے اڈریس پر شام کو جا پہنچا۔ دوسرا دن میری ڈیوٹی کا پہلا دن تھا۔ مجھے شدت سے رشید کا انتظار تھا لیکن وہ اس سے اگلے دن آیا۔ میں نے جب اسے دیکھا تو بے چینی سے اس کی جانب لپکا۔ اس کے چہرے پر تفکرات کے سائے تھے۔ جب ہم کو تنہائی ملی تو اس نے بتایا کہ اسے صفیہ نے بتایا ہے۔

''ناہید کی شادی پندرہ فروری کو ہے، دس فروری کو وہ گاؤں چلی جائے گی اس کے ساتھ تایا کی ساری فیملی جائے گی۔'' ناہید نے میرے نام ایک مختصر خط لکھا تھا جو رشید نے مجھے تھمایا تو میں نے فورا کھول لیا۔ اس میں وہی سب باتیں تھیں جو ایسے موقع پر لکھی جاتی ہیں۔ ''میں مجبور ہوں ہم مل نہیں سکتے تم مجھے بھول جانا، تیری یاد اب ساری زندگی میرے ساتھ رہے گی، میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں، ہمارا ملنا نصیب میں نہیں تھا۔ اس خط میں نئی بات یہ تھی کہ ''آنٹی صفیہ سے بات ہوئی ہے میں ان کے گھر آپ سے ملنے آؤں گی۔'' میرے ساتھ ساتھ رشید بھی خط کو پڑھ رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رشید نے کہا۔

''مکمل پڑھ لو پھر بات کرتے ہیں۔'' میں نے باقی خط پڑھا لکھا تھا ہماری ملاقات کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ میں صرف ایک بار تم سے ملوں گی اس کے بعد مجھے بالکل بھول جانا وغیرہ وغیرہ خط تہہ کر کے میں نے جیب میں رکھا اور رشید کی طرف دیکھا۔

میری آنکھوں میں سوال ہو گا جو اس نے پڑھ لیا اور جواب میں کہا۔

''صفیہ کے گھر آپ نے اکیلے جانا ہے وہاں صرف صفیہ ہو گی دن کے کسی وقت ناہید وہاں آپ سے ملنے آ جائے گی۔'' میں نے جوش سے رشید کا ہاتھ دبایا۔

''اس آخری ملاقات کو میں یادگار بنا لوں گا۔'' اس کے خط سے لگتا ہے یا تو وہ بہت مجبور ہو گئی ہے یا سب ڈرامہ کر رہی ہے۔ اگر اسے اس شادی سے خوشی نہیں ہے تو بغاوت کیوں نہیں کرتی، وہ کہتی ہے ماں باپ کی عزت کا خیال ہے تو محبت کیوں کی تھی؟ اب تک مجھ سے ملتی رہی تب عزت کا خیال کیوں نہیں آیا۔ میرے چہرے پر نہ جانے کیا لکھا ہو گا۔ رشید نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہنے لگا

"پتا ہے آپ کی اس ملاقات کے لیے مجھے کتنی قربانی دینی پڑے گی۔" ہم دونوں مسکراتے چلے گئے۔

اس رات مجھے اپنا بچپن یاد آیا جو ناہید کے ساتھ ساتھ جوانی میں بدل گیا تھا۔ مجھے گورنمنٹ اسکول یاد آیا جہاں میں جماعت پنجم میں تھا۔ جب ناہید دوم میں تھی، اسکول تو بوائز کے لیے تھا وہاں بچیاں بھی پڑھتی تھیں۔ لڑکیوں کے لیے ان دنوں الگ اسکول نہیں بنا تھا۔ اس کے علاوہ میری ملاقات مسجد میں ناہید سے ہوتی جہاں ہم دنوں نے قرآن پڑھا۔ کتنے اچھے تھے وہ دن ایک دوسرے کے گھر آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی، نازی کا بھائی ندیم میرا کلاس فیلو تھا، جماعت ششم میں ہم ایک ساتھ دوسرے گاؤں پڑھنے جانے لگے، دوسرے گاؤں میں لڑکیاں بھی جایا کرتیں۔ اس گاؤں میں گرلز ہائی اسکول تھا اور بوائز کا بھی ہائی اسکول تھا۔ ہر روز صبح صبح میں ندیم کو لینے اس کے گھر جاتا تو ناہید سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ دو سال بعد ناہید، نازی، میری بہن صغرا بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ دوسرے گاؤں جانے لگی۔ انہی دنوں ہماری محبت بڑھی، ایک دوسرے کو درجنوں محبت نامے لکھے۔ سیکڑوں چھوٹی چھوٹی ملاقاتوں نے محبت کو عشق میں بدلا۔ عمریں بڑھیں تو پابندیاں لگنا شروع ہو گئیں۔ گاؤں میں ہماری محبت کے چرچے ہوئے تو ناہید پر پابندیاں سخت کر دی گئیں۔ ایسے ہی میں نے ایف اے اور ناہید نے میٹرک کر لیا۔ اب ہمارا آپس میں ملنا مشکل تر کر دیا گیا، کئی بار ناہید نے اپنی امی سے مار کھائی اور میں نے اپنے ابا جان سے مرمت کروائی۔ پابندیاں بڑھیں تو ردعمل میں محبت بھی بڑھی۔ وہ منحوس دن آیا جب ہم دونوں ناہید کے گھر کے پیچھے بیٹھے مستقبل کے حسین ورنگیں سپنے دیکھ رہے تھے تو ظالم سماج نے ان کو توڑ دیا۔ یعنی پکڑ لیا۔ ظالم سماج کی وضاحت کرنے کی کیا ضرورت ہے ہر صاحب عشق اسے سمجھتا ہے۔ اس کے دو ماہ بعد ایک بار ہم کھیتوں میں پکڑے گئے تو ناہید کو اس کے والدین نے شہر بھیج دیا۔

اب وہ صرف چند دن بعد پرائی ہونے جا رہی تھی اور میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میرے ساتھ بھاگنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ اس نے آخری خط میں لکھا تھا میں تم سے آخری بار ملنے آ رہی ہوں۔ آخر وہ دن بھی آیا جب میں آخری بار ناہید سے ملنے صفیہ کے گھر جا پہنچا۔ دن کا ایک بج رہا ہو گا۔ میں صفیہ کے گھر ایک اندرونی کمرے میں بیٹھا دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ محبت میری ہے تو اس سے سہاگ رات نہیں منا سکا تو سہاگ دن ضرور مناؤں گا۔ میں نے دبے لفظوں سے صفیہ سے بھی کہہ دیا۔ اس بے پروائی سے کہا۔

"مجھے کیا! میں تو تم کو یہاں چھوڑ کر باہر چلی جاؤں گی لیکن جو بھی کرنا ہو جلد ہی کر لینا۔" آخر تھا جس کا انتظار وہ شہکار آ گیا۔ وہ شاہ کار صفیہ کی موجودگی میں ہی روتا ہوا میرے گلے آ لگا۔ وہی باتیں، وہ ہی آہیں، سسکیاں، آنسو، مجبوریاں جو جدائی سے پہلے آخری ملاقات میں ہو سکتی تھیں، اس دن ناہید کے ساتھ میں بھی جی بھر کے رویا۔ میری پہلی محبت تھی، ایسے کافی وقت گزر گیا آخر صفیہ نے ہم کو ڈسٹرب کیا۔

"چھوڑو ان باتوں کو اور رونے دھونے کو۔" صفیہ نے مزید کہا۔ "اب کوئی فائدہ نہیں ایسی باتوں کا یا تو بھاگ جاؤ۔ اتنی ہمت نہیں تو ان لمحات کو یادگار

بناؤ، پھولوں کی باتیں کرو پیار کی باتیں کرو، بلکہ پیار کرو۔" میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا اسی وقت صفیہ کمرے سے باہر نکل گئی اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کسمسائی تو میں نے اسے مزید زور سے خود سے لگا لیا۔ "ایک منٹ چھوڑو مجھے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھ سے خود کو الگ کیا۔ میں نے بازوؤں کا حصار ختم کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں لیٹا ہوا تھا کہ وہ مجھ پر آ گری۔

"سکندر۔" وہ ہولے سے پکاری۔

"ناہید میری جان۔" میں نے کپکپاتی آواز میں کہا

"مجھے بازوؤں میں لے کر ماردو۔" اس نے تیز ہوتی سانسوں میں کہا۔

ہم نے خود کو شعلوں کے حوالے کر دیا۔ پہلے سانسیں ناہموار ہوئی۔ اس کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں میرا حال بھی ایسا ہی تھا۔ طوفان اترا تو ہم کو ہوش آیا۔ اس کی آنکھوں میں خمار تھا۔ چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ۔ اس نے کرسی سے لباس اٹھا کر پہنا۔ وہ ایک بار پھر گلے آ لگی۔ میرے دل میں سکون اترتا چلا گیا۔ اس ملاقات کا نشہ میری رگ رگ میں اتر گیا۔ وقت گزرتا گیا، ہم باتیں کرتے رہے۔

ہم اس وقت چونکے جب باہر سے صفیہ کی کسی سے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ آواز بلند ہونے لگی۔ وہ کسی کو اندر آنے سے روک رہی تھی۔

"ہٹ کتیا تم سے تو میں بعد میں پوچھ لوں گا۔" ایسے لگا جیسے صفیہ کو دھکا دیا گیا ہو۔ ناہید کا رنگ اڑ گیا۔

"بھائی غفور۔" بس وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ وہ وقت تک میرے بازوؤں میں تھی۔ وہ ایک طرف لڑھک گی۔ میں اس کا وزن سنبھال نہ سکا۔ دھڑکتے دل سے میں نے اس کے جسم کو چارپائی پر منتقل کیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی اسی وقت ایک دھماکے سے دروازہ کھلا۔ اندر آنے والوں میں سے ایک تو غفور تھا دو اس کے ساتھی اور تھے میں ان کو پہچان نہ سکا۔

"ماردو اس کتے کو......" غفور دھاڑا اور وہ دونوں مجھ پر پل پڑے۔ اب آپ سے کیا پردہ پہلے تو میں نے مزاحمت کی اور ان دونوں کو دو تین ٹھوکریں لگانے میں کامیاب بھی ہوا ایک کو میں نے ٹکر ماری وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں اس کے پیچھے ہی تھا۔ اس کے بال پکڑ کر میں نے اس کا سر دوبارہ دیوار پر مارا۔ اس وقت تک دوسرے نے میری ٹانگ کھینچ لی۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ میں نیچے گرا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ ایک میرے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ وہ میرے منہ کو نشانہ بنا رہا تھا۔ میں دونوں ہاتھوں سے اس کے حملے روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ناکام کوشش سے آپ سمجھ تو گئے ہوں گے۔ دوسرے نے کسی ڈنڈے سے میری ٹانگوں پر ضرب لگائی۔ درد سے میں بلبلا اٹھا۔ میں نے پوری طاقت صرف کی اور اس وحشی کے نیچے سے نکل گیا۔ میں نے کوشش کی لیکن کھڑا نہ ہو سکا۔ اصل میں انہوں نے کھڑا ہونے ہی نہیں دیا۔ پھر وہ مارتے چلے گئے۔ انہوں نے جی بھر کر میری پٹائی کی۔ میں نے دیکھا کہ غفور اس دوران ناہید کو ہوش میں لے آیا تھا۔ اور اس کا بازو پکڑے باہر لے گیا تھا۔ صفیہ مجھے نظر ہی نہیں آئی۔ جب وہ دونوں مجھے مار مار کر تھک گئے تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ مجھے سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔

انہوں نے میرے دونوں ہاتھوں کو میری پشت پر

نائلون کی رسی سے باندھا۔ جو انہوں نے ایک چارپائی سے نکالی تھی، میرے سر میں بے پناہ درد ہو رہا تھا، بلکہ کہنا چاہیے درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میرے دل چاہتا تھا کہ بے ہوش ہو جاؤں۔ اتنی مار کھانے کے بعد جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور درد سے نجات بے ہوشی میں ہی ممکن تھی، موت کے خوف نے مجھے بے ہوشی سے بچایا ہوا تھا، جیسے کوئی اپنی آنکھوں کے سامنے خود کو مرتا ہوا دیکھنا چاہتا ہو۔ مجھے اس کی امید تو نہیں تھی کہ وہ مجھے زندہ چھوڑ دیں گے۔ انہوں نے میرے پاؤں بھی باندھ دیئے۔ اب تک جو امید تھی کہ شاید میں بچ جاؤں یا فرار ہو جاؤں، وہ دم توڑ گئی اس کے ساتھ ہی میرے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔

یہ بے ہوشی کا وقفہ کتنا طویل تھا، مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ لیکن مجھے ہوش ایک اسپتال میں آیا۔ گزرا ہوا حادثہ مجھے یاد آیا۔ میں نے سارے جسم کو ہلا جلا کر دیکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ کہ میں زندہ تھا۔ کیا وہ مجھے مارنا نہیں چاہتے تھے؟ صرف دہشت زدہ کرنا ان کا مقصد تھا۔ میں نے سوچا، وہ اگر مجھے جان سے مار کر پھینک دیتے تو...... اس کے آگے میں سوچ نہ سکا۔

یہ اسپتال کا جنرل وارڈ تھا۔ میں نے دونوں طرف سر گھما کر دیکھا۔ سر میں درد کی ایک لہر اٹھی۔ زبان خشک ہو رہی تھی۔ میرے دونوں طرف مریضوں کے بستر تھے۔ پاس سے گزرتی ایک نرس میرے پاس آئی۔

”کیسے ہیں۔ آپ؟“

”ٹھیک ہوں مجھے پیاس لگی ہے۔“

”اچھا۔“ کہہ کر اس نے دوسرا مریض جو کہ ایک بوڑھا آدمی تھا کے پاس پڑے ہوئے جگ سے پانی

یادیں

✦ یہی بس مشکل ہے بھول جانا انسان کے بس میں نہیں جو حادثہ ایک دفعہ گزر جائے وہ یاد بن کے بار بار گزرتا ہے۔ بھولنے کی کوشش ہی اسے زندہ رکھتی ہے' انسان ظالم کو معاف کر سکتا ہے لیکن اس کے ظلم کو نہیں بھول سکتا' بھول جانا انسان کے اختیار میں نہیں۔

✦ موسم گزر جاتا ہے مگر یاد نہیں گزرتی' مرحوم زمانوں کی یاد مرحوم نہیں ہوتی۔ پرانے چہرے نئے چہروں میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پرانے غم نئے غم میں شامل نظر آتے ہیں۔

✦ پرانی یاد نئی زندگی کے ساتھ چلتی ہے تہہ در تہہ یاد انسان کے اندر ہمیشہ محفوظ رہتی ہے' یاد سے نجات کی کوشش دلدل سے نجات کی کوشش کی طرح رائیگاں جاتی ہے۔

(واصف علی واصف کی کتاب ”دل دریا سمندر“ سے اقتباس)

نورالدین...... کراچی

کا گلاس بھرا، اس وقت تک میں اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کر چکا تھا تکیہ سے ٹیک لگا کر میں نے پانی پیا میرے سر میں بدستور دھماکے ہو رہے تھے۔ نرس کے جانے کے آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر آیا۔ میرے پوچھنے پر ڈاکٹر نے بتایا۔

”تم اسپتال کے باہر رات کو دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے تھے۔ ایک مریض کا تیماردار کسی ضرورت سے ادھر گیا تو علم ہوا تم بے ہوش تھے۔ سارے جسم پر ایسی چوٹیں ہیں جیسے تم کو مارا پیٹا گیا ہو۔ ہم نے پولیس کو اطلاع کر دی ہے وہ آنے ہی والی ہو گی۔“ ڈاکٹر نے پولیس کا نام لیا تو میری روح فنا ہو گئی۔ مجھے غفور یاد آیا لیکن میں چپ

رہا۔ تھوڑی دیر وہ مزید باتیں کرتا رہا جو میں بے توجہی سے سنتا رہا۔ مجھے انجکشن لگایا گیا اور چند گولیاں دی گئیں جو میں نے پھانک لیں۔ اس کے بعد وہ مجھ سے آگے والے مریض کے پاس جا پہنچا۔ میں صبر سے لیٹا اسے دیکھتا رہا اور ناہید سے ہونے والی آخری ملاقات کے رنگین و سنگین لمحات کے بارے میں سوچتا رہا۔ غفور کمپنی نے اچھی خاصی میری ٹھکائی کی تھی لیکن میرے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا، ویسے جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ بڑی دیر تک میں وہاں لیٹا ٹھنڈی سانسیں لیتا رہا۔ نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ میں اسپتال کے بستر پر لیٹا ہوا تھا کہ پولیس آ گئی اور مجھے اٹھا کر لے گئی، انہوں نے مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ میں وہاں بھوکا پیاسا قید رہا، دن گزرا، رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی جب غفور آیا، اس کے ساتھ دو سپاہی اور تھے۔ انہوں نے مجھے حوالات سے نکال کر ایک جیپ میں زبردستی بٹھایا اور شہر سے باہر لے گئے۔ اس دوران میں نے بہت مزاحمت کی لیکن انہوں نے میری ایک نہ چلنے دی، شہر سے باہر ہمارے ہی گاؤں کی طرف جانے والی سڑک پر کافی آگے لے جا کر ایک جگہ انہوں نے مجھے جیپ سے کھینچ کر نکالا اور کھیتوں کی طرف لے چلے۔ غفور ان کے آگے آگے چل رہا تھا اور باقی اس کے پیچھے پیچھے جنہوں نے مجھے اٹھایا ہوا تھا۔ ایک نے میری ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں دوسرے نے بازوؤں سے۔ جس جگہ جا کر انہوں نے مجھے زمین پر پھینکا میں اس جگہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ تو وہ جگہ تھی جہاں سے تھوڑی دور ناہید کا گھر تھا۔ اس جگہ پر اب تک میں اور ناہید درجنوں مرتبہ راتوں کو، صبحوں کو ملے تھے۔ اس وقت دونوں سپاہیوں نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور میرے سامنے غفور پستول نکالے کھڑا تھا۔ مجھے اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ میں غفور کی منتیں کرنے لگا۔ وہ کہنے لگا۔

''تم میری بہن سے عشق کرتے ہو اب موت تمہارا مقدر ہے۔ تم تو کہا کرتے تھے ناہید کو کہ ساری دنیا سے ٹکرا جاؤ گے اس کے لیے۔ موت کو گلے لگا لو گے۔'' میرے جسم پر پسینہ بہنے لگا، میرا دماغ گھوم رہا تھا، میرے اگر دونوں سپاہیوں نے ہاتھ نہ پکڑے ہوتے تو میں غفور کے پاؤں پڑ جاتا۔ اسی وقت غفور نے گولی چلا دی جو میرے سینے پر لگی۔ میری چیخ نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں اسپتال میں لیٹا ہوا تھا اور میرے اوپر رشید جھکا ہوا تھا۔ میرا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اپنے حواس میں واپس آنے میں مجھے چند منٹ لگے۔

''تم کب آئے۔'' میں نے رشید سے پوچھا

''ابھی تھوڑی دیر پہلے اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔'' میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔

''مجھے اسپتال سے لے چلو۔''

''کہاں لے چلوں۔''

''فیکٹری مناسب رہے گی۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' اس کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا اور رشید میرا بازو پکڑے اسپتال سے نکل آیا۔ میری سانس پھول رہی تھی۔ گلی کی نکڑ سے تانگہ مل گیا۔ رشید نے اسے سہیل کاٹن فیکٹری جانے کا کہا۔ اس نے بیس روپے مانگے جو عام حالت میں بہت زیادہ تھے مگر رشید نے سر ہلا دیا۔ میرے سارے جسم میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ کوئی ایک جگہ نہیں تھی۔ ہم سڑک پر ہی اترے اور سیدھے اپنے کوارٹر جا پہنچے۔ ساتھ کام کرنے والے لڑکوں کی باتوں کو نظر انداز کر کے لیٹ گیا۔ رشید چائے، بسکٹ اور دوا کھلا کر صبح آنے

کا کہہ کر چلا گیا۔ میں اپنے جسم پر زخم کے نشان دیکھنا چاہتا تھا۔ جو ناہید سے آخری ملاقات کی یادگار تھے۔ سارا جسم ہی سوجا ہوا تھا۔

دوسرے دن صبح میں نے نہا کر دوسرے کپڑے پہنے اور لیٹ گیا۔ اب کچھ دماغ کام کرنے لگا۔ ناہید کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ صفیہ کی بھی مجھے فکر ہوئی۔ سوال یہ بھی تھا کہ وہ مجھے حوالات میں بھی بند کر سکتے تھے اور جان سے بھی مار سکتے تھے۔ نہیں وہ جان سے نہیں مار سکتے تھے کیونکہ رشید، صفیہ کو میرے بارے میں علم تھا اور پھر ناہید کو بھی۔ ہونہہ۔ میں نے سوچا۔ مجھے وہ اسپتال کے سامنے پھینک کر چلے گئے تھے اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ سب سے اہم سوال تھا جب کوئی جواب نہ ملا اور سوچ سوچ کر سر کا درد بڑھ گیا تو میں نے خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

شام کو آنکھ کھلی اب جسم میں درد کم ہو گیا تھا۔ سارا دن رشید نہیں آیا لیکن شام کو آ گیا۔ میں اس کے ساتھ کلینک گیا۔ دوا لی، کھانا کھایا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بیس فروری کو ناہید کی شادی تھی۔ صرف پانچ دن بعد۔ اگر زندگی فلم ہوتی اور میں فلمی ہیرو ہوتا تو یہ شادی روکنا کوئی مشکل نہ ہوتی۔ حقیقی زندگی میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ اپنی بے بسی پر سوائے رونے کے کیا ہو سکتا تھا۔ سو اس رات میں جی بھر کر رویا۔ رونے سے مقدر کہاں بدلتے ہیں۔ مجھے مایوسی نے گھیر لیا۔ اب کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ ایسے ہی دو دن گزر گئے میں نے کام سے چھٹی کر لی تھی اور رشید کے والد اقبال احمد سے حساب لے کر دینے کا کہہ دیا۔ اس شام مجھے میری تنخواہ مل گئی۔ یہ رات میں نے اسی فیکٹری میں گزاری دوسری صبح گاؤں واپس آ گیا۔

آخر وہ دن بھی آن پہنچا جس دن ناہید کی بارات آئی میں کمرے میں لیٹا اپنی بے بسی پر ماتم کرتا رہا۔ شام تک بخار نے آن گھیرا یہ بھی اچھا ہوا۔ اب امی، ابو، بہن صغرا، بھائی میری خبر گیری کرنے لگے۔ تنہا نہیں رہا تو اس کا غم کم رہا۔ وقت ہر زخم کا مرہم ہے وقت گزرتا چلا گیا۔ ایک ہفتے بعد رشید مجھ سے ملنے آیا میں نے اس سے سب سے پہلے صفیہ کا پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہے، اس کو وارننگ دے کر چھوڑ دیا گیا تھا۔'' وہ بڑی دیر تک میری ناکام محبت پر افسوس کرتا رہا۔ شام کو واپس چلا گیا۔

شادی کے بعد ناہید سے درجنوں بار ملاقات ہوئی لیکن یہ ملاقاتیں کسی خاندان کی شادی پر یا وفات پر ہوئیں۔ اس کا رویہ ایسا تھا جیسے وہ میری محبت کو بھول چکی ہے اس کا چہرہ بھی سپاٹ رہتا۔ میں نے بھی کبھی اس سے ایسی کوئی بات نہ کی۔ میں روزگار کے سلسلے میں کوئٹہ چلا گیا۔

آج اس بات کو بائیس برس گزر گئے جب میں نے ایک شادی کی تقریب میں شبیر کو دیکھا جس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ اس کہانی کے بہت سے کردار اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ صرف چند ایک ہی زندہ ہیں۔ ان میں سے ایک تو رشید ہے سال چھ ماہ بعد ہماری ملاقات ہوتی رہی ہے۔ کبھی کبھی ہم بھولی محبت کو یاد کر کے ہنس لیتے ہیں کبھی اداس ہو لیتے ہیں۔

آخری قسط

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔





میں نے کھڑے ہو کر اپنے ارد گرد دیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے سوائے اندھیرے کے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس حقیقت کا مجھے علم تھا کہ انسانی جسم سے نکلنے والی شعاعیں نہ صرف اپنا اثر رکھتی ہیں، بلکہ وہ عمل اور ردعمل کا بھی احساس دیتی ہیں۔ ایک بار مجھے اروند سنگھ یونہی معلومات کے لیے بتا رہا تھا کہ یورپ اور امریکا میں غیر مرئی مخلوق پر باقاعدہ تحقیق ہو رہی ہے۔ کسی ایسی مخلوق کے بارے میں شواہد اور حقائق جمع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو مخلوق دکھائی تو نہیں دیتی لیکن اس کے بارے میں شواہد موجود ہیں۔ جنوبی ایشاء میں بھوت پریت، ارواح، کے بارے میں بڑی کہانیاں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ دیو مالائی کہانیوں اور بعض مذاہب میں اس کا پورا وجود تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جوگی ہو یا یوگی، ان کا نظریہ جو بھی ہو، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان صوفیاء نے مشاہدات کئے ہیں۔ وہ ان مشاہدات میں کیا دیکھتے ہیں، انہیں کون سا اور کیسا جہان دکھائی دیتا ہے، وہ کہاں کا مشاہدہ کرتے ہیں؟

ان سب باتوں سے قطع نظر، یہ حقیقت ہے کہ یہ مشاہدہ دو طرح کا ہوتا ہے، ایک وہ جو دکھایا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ دیکھنے والا یہ خواہش کرتا ہے کہ اس نے مشاہدہ کرنا ہے، اب اسے کیا دکھایا جائے، یہ دیکھنے والے کی حیثیت اور مقام کے مطابق اسے دکھایا جاتا ہے۔ اسے کس جہان کی سیر ہوتی ہے، یہ مالک کی مرضی۔ دوسرا یہ کہ اچانک رب تعالیٰ کی طرف سے کوئی منظر یا کوئی حقیقت بندے پر کھول دی جاتی ہے۔ شاہد، مشاہدہ کرتا ہے اور شہادت دیتا ہے کہ انسان ہی ہے جو یہ سب دیکھ رہا ہے اور یہ انسانوں پر ہی راز کھل رہے ہیں۔

مشاہدات کی اس ساری حقیقت میں ایک بات بالکل واضح ہے کہ انسان کا تعلق اس زمین ہی سے نہیں بلکہ اس پوری کائنات سے جڑا ہوا ہے۔ جیسے معمولی سی مثال کہ چاندنی انسان پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سورج کی روشنی کے ساتھ انسان کا پورا پورا تعلق ہے۔ پوری کائنات ایک قوت کی مانند ہے، جس سے انسان جب چاہے، مرئی اور غیر مرئی دونوں سے فائدہ اٹھائے۔ یہ انسان پر منحصر ہے۔

ایک بات اور، جیسے انسان دھوپ میں رہے یا چھاؤں میں آ جائے یہ اس کا اختیار ہے۔ دھوپ سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، یہ انسان کے اختیار میں ہے۔ اسی طرح کوئی مرئی یا غیر مرئی قوتوں کے ساتھ جڑ جائے انہیں تسخیر کرے یا انہیں تسخیر کرنے کی صلاحیت پیدا کر لے یا دلچسپی ہی نہ لے، یہ انسان پر منحصر ہے۔ لیکن ربط اور تعلق ہونا، یہ حقیقت ہے۔

میں جس وقت ٹِلہ جوگیاں پر موجود تھا، اس وقت میرے اندر کی ہلچل نے مجھے اپنے اندر کسی قوت کا احساس دلا دیا تھا۔ میرے دماغ میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ القا ہو گئی کہ یہاں کچھ ہے۔ وہ قوت کیا ہے؟ اس کا مجھے ادراک نہیں تھا، لیکن کسی قوت کا پورا یقین مجھے ہو چکا تھا۔ میں اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں کسی حد تک اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کسی اونچی جگہ پر کھڑا ہوں۔ دور کہیں وادی میں بڑی محدود سی روشنیاں جگمگا رہی ہیں۔ بلاشبہ وہاں زندگی کے آثار تھے۔ تبھی فرخ نے کہا۔

''وہ کدھر ہو سکتا ہے؟''

''میں تو وہی جانتا ہوں نا جو تم جانتے ہو؟ یہاں کے بارے میں تمہیں ہی پتہ ہے۔'' میں نے جواب میں کہا تو وہ بولا۔

''یہاں قریب ہی ایک ریسٹ ہاؤس ہے وہاں

چلتے ہیں، لیکن انتہائی احتیاط کے ساتھ، ممکن ہے ان کے ساتھ کوئی سیکورٹی......"

"بس تم چلے آؤ۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

ہمارا رُخ اُسی ریسٹ ہاؤس کی جانب تھا، جس کے بارے میں فرخ نے بتایا تھا۔ ہم محتاط قدموں سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ فرخ میرے آگے تھا اور ہم چڑھائی چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ کھردری سی زمین والی پہاڑی پر آ گئے۔ فرخ نے ٹارچ کی روشنی سامنے کی جانب لہرائی تو سامنے ریسٹ ہاؤس تھا۔ تکونی چھت اور کم اونچائی کی یہ ہال نما عمارت تھی۔ ہم اس کے دروازے پر آن پہنچے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے ایک دم سے اندر چلے گئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہاں روشنی کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں سارے کمرے کو دیکھا۔ پھر اگلے کمرے میں گئے تو بیڈ کے پاس ایک نیا لیپ ٹاپ دکھائی دیا۔ وہ بند تھا۔ اس کے پاس ایک بیگ پڑا ہوا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی فرخ نے سرسراتے ہوئے کہا۔

"یہ پوری طرح یقین ہو گیا ہے کہ کوئی یہاں پر ہے یا کچھ دیر پہلے تک تھا۔"

"ایسا ہی ہے۔" میں نے جواب دیا اور پوری طرح چوکنا ہو کر کسی بھی متوقع آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ہو کا عالم تھا۔ کوئی ایسی آواز سنائی نہیں دی جس سے کسی کے ہونے کا اندازہ ہو سکے۔ فرخ نے کمرے میں ہر جگہ یہاں تک کہ بیڈ کے نیچے بھی دیکھ لیا۔ وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا۔

"باہر؟" فرخ نے آہستہ آواز میں کہا۔

"آؤ۔" یہ کہہ کر میں نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے ہی آ گیا۔ میں لیپ ٹاپ بیگ میں ڈال رہا تھا کہ اس نے پوچھا۔

"باہر کیوں آ گئے؟"

"یہاں کوئی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے، کوئی ہماری آمد کا احساس کر کے چھپ گیا ہو۔" اس نے رائے دی تو میں نے پوچھا۔

"لیپ ٹاپ کو ہاتھ لگا کر دیکھا تم نے؟"

"نہیں تو......" اس نے تیزی سے جواب دیا۔

"وہ بالکل ٹھنڈا ہے۔ اگر کوئی وہاں ہوتا اور ہمیں دیکھ کر یہاں سے جاتا تو یہ ضرور ساتھ لے کر جاتا۔ اتنی دیر بھی نہیں ہوئی کہ ہم اس کی سرسراہٹ بھی نہ سن سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ کوئی یہاں پر ہے اور وہ اس وقت ریسٹ ہاؤس میں نہیں ہے۔"

"تو پھر ہمیں محتاط ہو جانا چاہئے۔" اس نے تیزی سے کہا اور ارد گرد دیکھنے لگا۔ تب میں نے خود میں بے چینی محسوس کی۔ میں بھی ارد گرد دیکھنے لگا۔ مجھے لگا کہ بے چینی کی یہ لہر ایک طرف سے آ رہی ہے۔ میں نے اس طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"اس طرف کیا ہے؟"

"ادھر وہی ہندوؤں کے پرانے مندر، جواب کھنڈر بن چکے ہیں۔" فرخ نے بتایا۔

"اس طرف چلو۔" میں نے کہا اور قدم بڑھا دیئے۔ مجھے نہیں پتہ اندھیرے میں فرخ کے چہرے کے تاثرات کیا ہوں گے۔

ٹِلّہ جوگیاں پر یہ مندر کہاں سے کہاں تک پھیلے ہوں گے۔ ان کا احاطہ کتنا ہو گا، میں نہیں جانتا تھا لیکن ٹارچ کی محدود روشنی میں ہمارے سامنے چھوٹے چھوٹے سے مینار تھے، جن کے درمیان میں سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ جیسے ہی میں نے اس سیڑھی پر قدم رکھا۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے جھٹکا سا لگا، جیسے کوئی دھکا دے۔ میں ٹھٹک گیا۔ بلاشبہ وہاں ان دیکھا حصار

تھا۔ یہ کیوں تھا اور کس نے لگایا تھا، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں فرخ کو اپنی کیفیت بتا کر خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے خاموش رہا۔ میں سمجھنے لگا کہ یہاں کس طرح کے معاملات سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ میں نے اپنے حواس جمع کئے اور سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ میرے سامنے ایک تالاب تھا جو اس وقت خشک ہو چکا تھا۔ اس میں سیڑھیاں تھیں جو اب بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ اس تالاب کے پار ایک مندر تھا۔ وہاں اور بھی برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں جو دکھائی دیا ہم اسی منظر میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ وہ مندر فرش سے ذرا اوپر تھا۔ چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میں انتہائی محتاط انداز میں اندر چلا گیا۔ اس بوسیدہ، ویران اور ٹوٹے ہوئے مندر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک خاص قسم کی بساند وہاں سے آ رہی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ مگر میری بے چینی کم ہونے کی بجائے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں اس مندر کے اردگرد چکر لگا کر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں دائیں جانب مڑا تو اسی کی سیدھ میں تھوڑا آگے مجھے یوں لگا جیسے کسی کمرے میں آگ جل رہی ہو۔ مجھے نارنجی روشنی کی ایک لکیر دکھائی دی۔ میں اس جانب بڑھ گیا۔

وہ بھی ایک مندر نما جگہ تھی۔ شاید کسی جوگی کا استھان تھا۔ میں اندھیرے میں ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ لیکن مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ جگہ کون سی تھی مجھے تو اس سے دلچسپی تھی جو اس کے اندر تھا۔ کون ہے جو اس کمرے میں آگ جلائے بیٹھا ہے؟ میں نے ٹوٹے ہوئے کواڑوں میں سے اندر جھانکا، اندر کا منظر میرے لیے کافی دلچسپ تھا۔ میری بے چینی کو سکون آ گیا، جیسے لاشعوری طور پر میں ایسا ہی کوئی منظر دیکھنا چاہتا تھا، یا ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ کمرے کے بالکل درمیان میں ایک مٹی کے برتن میں آگ روشن تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر ایک سفید اور سرخی مائل رنگت والا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سارا بدن ننگا تھا۔ صرف ایک نارنجی رنگ کی لنگوٹ اس نے باندھی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں ایک سیاہ رنگ کی مالا تھی۔ وہ کلین شو تھا۔ لیکن اس کے سر کے بال دراز تھے۔ اس کی کلائیوں پر سرخ دھاگا باندھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بڑ بڑانے والے انداز میں کچھ پڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی یوگا کا آسن جما کر بیٹھا ہو۔ وہ پوری طرح منہمک تھا۔ اس کے سوا وہاں پر کوئی نہیں تھا۔

''یہ جوگی......'' فرخ نے کہنا چاہا تو میں نے مڑ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ جوگی کرتا کیا ہے۔ چند منٹ یونہی گزر گئے تب مجھے خیال آیا کہ میں یہاں تفریح کے لیے نہیں آیا ہوا ہوں۔ وقت بہت کم ہے۔

''تم باہر کا خیال رکھنا، ممکن ہے کوئی اس کا ساتھی ہو یا یہ سب ڈھونگ دکھاوا ہو، کچھ بھی ممکن ہے، میں اندر جا رہا ہوں۔'' میں نے سرسراتے ہوئے کہا اور ٹوٹے ہوئے کواڑ کو دھکیلا۔ اس کی چرچراہٹ ہوئی تو اس جوگی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ یوں میری طرف دیکھنے لگا جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا، پھر نہایت غصے میں بولا۔

''وہیں رک جا، کون ہو تم؟''

''یہی سوال میں نے تم سے کرنا ہے، کون ہو تم؟'' میں نے کہا اور اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''پلٹ جاؤ، اور میری تپسیا بھنگ مت کرو، ورنہ تمہارے لیے برا ہوگا۔'' اس نے غضب ناک لہجے میں کہا تو میں نے سکون سے کہا۔

''بتا دو کہ کون ہو، ورنہ اس سے بھی بدتر حال تیرا

ہو جائے گا۔"

"تو اس طرح نہیں مانے گا؟" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

"نہیں، میں نہیں......" لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ اس نے آگ والا برتن مجھ پر اُچھال دیا۔ میں چونکہ ذہنی طور پر ہر طرح کے حالات کے لیے تیار تھا، اس لیے جھکائی دے گیا۔ اسی دوران اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی اور مجھے لیتا ہوا فرش پر آن گرا۔ میرے سنبھلنے تک اس نے میرے سر اور گردن کے درمیان جو گھونسہ مارا، اس سے میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اسی لمحے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس بندے کو زیادہ آسان لینے کی ضرورت نہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزید ضرب لگاتا، میں نے اس کی گردن پکڑی اور خود سے الگ کر دیا۔ میں فرش سے اٹھا تو اس نے مجھے کمر سے پکڑ کر اوپر اچھالا، میں واپس فرش پر گرنے سے پہلے ہی سنبھل گیا اور پوری قوت سے لات اس کے منہ پر ماری۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اب وہ میرے سامنے تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ حد درجہ سنجیدہ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھ کر اس پر حملہ کرتا، وہ گھوما اور باہر نکل گیا۔

فرخ نے اس کے آگے ٹانگ اڑائی تو ہوا میں اچھلتا ہوا چند فٹ کے فاصلے پر جا گرا۔ مجھے لگا کہ وہ دوبارہ نہیں اٹھ پائے گا مگر میں اگلے ہی لمحے حیران رہ گیا، جب وہ کسی کھلونے کی مانند اچھلا اور تن کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں اس کی جانب بڑھنے ہی والا کہ وہ زور زور سے بڑبڑاتے ہوئے ہوا میں ہاتھ لہرانے لگا۔ اسی وقت میرے اور اس کے درمیان آگ کی دیوار بن گئی۔ وہ دوسری طرف کھڑا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کیا ہے، وہ فائیٹر تو تھا، اس کے ساتھ جادوگر بھی تھا۔ میں نے اس آگ کی دیوار کی بالکل بھی پروا نہیں کی اور اس کی جانب بڑھا۔ وہ کھڑا رہا۔ میں نے ایک ہی جست میں دیوار پار کی اور اس تک جا پہنچا۔ وہ پلٹ کر بھاگا اور چند قدم کے فاصلے پر جا کر پلٹا۔ اس نے پھر ہوا میں ہاتھ لہرایا اور آگ مجھ پر پھینکی۔ میں نے اس آگ کی بالکل پروا نہیں کی اور اسے جا لیا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑا تھا۔ لیکن اس نے ایک ہی جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا۔ وہ میرے سامنے تن گیا۔ میں آگے بڑھ کر اسے پکڑنا چاہتا تھا کہ اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ مجھے ایک جھٹکا دیا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں اس داؤ کو سمجھتا تھا، اس سے پہلے کہ وہ داؤ آزماتا، میں پوری قوت سے گھٹنا اس کی ٹانگوں کے درمیان میں دے مارا۔ وہ ڈکارتا ہوا مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹا۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب میں اس پر قابو پا سکتا تھا، میں نے پھر اس کی گردن پکڑنا چاہی، اس نے پھر کلائی پکڑنے کی کوشش کی لیکن یہ جھکائی تھی، میں نے پھر پوری قوت سے پاؤں کی ٹھوکر وہیں لگائی۔ وہ دہرا ہو گیا۔ میں نے گھٹنا اس کے منہ پر مارا۔ وہ زمیں بوس ہو گیا۔ میں نے تین چار ٹھوکریں اس کی پسلیوں میں ماریں۔ تب وہ ساکت ہو گیا۔

"فرخ رسی لاؤ۔" میں نے کہا تو وہ رسی پہلے ہی بیگ سے نکال رہا تھا۔ وہ تیزی سے اسے باندھنے لگا۔ جب وہ باندھ چکا تو میں نے پانی کی بوتل اس کے منہ پر انڈیل دی۔ وہ ہوش میں آ گیا۔ وہ دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ میں نے اس کا منہ اپنے ہاتھ میں لے کر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو"

"میں...... جوگی ہوں...... اور یہاں...... ایک خاص...... تپسیا کر رہا ہوں...... بالناتھ ہوں۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''کہاں کے ہو؟''

''نواب شاہ سے......'' اس نے بہ مشکل کہا تو مجھے اس کے کراہنے کا انداز مصنوعی لگا۔ میں نے یونہی اس کے ہاتھ دیکھے، وہ رسیوں سے آزاد ہو چکے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیوں میرے سوالوں کے جواب سکون سے دے رہا ہے۔ وہ کوئی اپنا منتر چلا چکا تھا۔ میں ہوشیار ہو گیا۔ جیسے ہی میں نے پوچھا۔

''یہاں کب سے ہو؟''

اس نے جواب دینے کی بجائے، پوری قوت سے اپنی کلائی میرے منہ پر مارنا چاہی، جسے میں نے پکڑ لیا، اور اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر کھینچا، میں اس کا بازو نکال دینا چاہتا تھا لیکن وہ انتہائی سخت جان تھا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی۔ میں یہی سمجھا کہ اس کا بازو نکل چکا ہے۔ میں نے دوسری ٹھوکر اس کی کنپٹی پر ماری۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

''مر گیا یہ؟'' فرخ نے پوچھا۔

''نہیں صرف بے ہوش ہوا ہے۔ لگتا ہے کافی سخت جان ہے۔''

''ہیلی کاپٹر بلاؤں۔'' اس نے کہا۔

''بلاؤ اور یہاں سرچ آپریشن ہونا چاہئے۔'' میں نے کہا اور اس جوگی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے وہ کافی پراسرار لگا تھا۔

☆......☆......☆

ڈنر پر انتہائی پر تکلف اہتمام تھا۔ بھوپندر سنگھ برار اور اپنے خاندان کے ساتھ ایک طرف بیٹھا ہوا تھا، جس میں اس کی پتنی، بیٹا اور بیٹی تھی۔ یہی بیٹی سمرن کور کے ساتھ انوجیت سنگھ کی بات چل رہی تھی۔ وہ کافی حد تک پر اعتماد تھی۔ اس کے بالکل سامنے ہرپریت کور بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ بانیتا کور اور جسپال سنگھ۔ ڈنر کے دوران انہی دو خاندانوں کے بارے میں باتیں چلتی رہیں۔ مختلف سوال جواب ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ڈنر خوشگوار ماحول میں ہو گیا۔ نوجوان بھی باہر لان میں جا بیٹھے۔ کلجیت کور کے پاس جسپال سنگھ، بھوپندر سنگھ برار اور اس کی بیوی رہ گئے۔ چائے پیتے ہوئے بھوپندر سنگھ برار نے کہا۔

''لو جی بہن کلجیت کور! ہمیں تو لڑکا پہلے بھی پسند تھا اور اب بھی ہے۔ اب آپ بتا دیں کہ کب آپ ہمارے پاس آ رہے ہیں اور آپ کی کیا رائے ہے۔''

''مجھے بھی سب پسند ہے۔ بس لڑکا اور لڑکی آپس میں جو طے کرنا ہو کر لیں۔'' کلجیت کور نے کہا۔

''چلیں جی، انہیں ملنے کا موقعہ دے دیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، زندگی انہوں نے گزارنی ہے۔'' بھوپندر سنگھ برار نے کہا اور پیالی رکھ کر بولا۔

''لو بہن جی ہم چلتے ہیں، ہمیں فون کر دیں آپ کب آ رہے ہیں۔''

کچھ دیر بعد وہ لان میں ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ وہ چلے گئے تو کچھ دیر کے لیے وہ لاؤنج میں آ بیٹھے۔ یونہی تبصرہ ہوتا رہا۔ پھر جسپال سنگھ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے جاتے ہی اروند سنگھ سے بات کی تو اسے معلوم ہوا کہ میجر راٹھور تک بات پہنچ گئی ہے۔ اس کا رد عمل ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ اس نے ردعمل معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ اس وقت وہ جمال کے ساتھ مصروف تھے۔ جسپال نے فون بند کیا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ بانیتا کور کے ساتھ ہرپریت کور بھی آ گئی۔ وہ دونوں اس کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گئیں۔

''اب بتاؤ، کس طرح کی لگی تمہیں وہ لڑکی؟'' ہرپریت کور نے بڑے پیار سے پوچھا تو جسپال اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”بہت اچھی اور بہت پیاری ہے۔ مجھے تو پسند ہے لیکن بات انوجیت کی ہے، اسے اگر پسند......“

”اُسے تو پسند ہے، یہ اظہار کر دیا۔“ ہرپریت بولی تو بانیتا کور نے کہا۔

”لڑکی تو پہلے ہی انوجیت کو چاہتی ہے۔“

”پھر تو معاملہ سیٹ ہے جی، اتنے تکلفات کی کیا ضرورت تھی، آج بات پکی کر دیتے۔“ جسپال نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”اسی ہفتے میں ہو جانی ہے بات پکی۔“ ہرپریت کور نے کہا اور ہنس دی۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر وہ دونوں اٹھ کر چلی گئیں۔ جسپال سنگھ بھی سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

ہم اسی عمارت میں واپس آ چکے تھے جہاں ہم نے پلان کیا تھا۔ اس جوگی کو ہم اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے۔ میں نے آتے ہی وہ لیپ ٹاپ سرمد کو دے دیا تھا۔ اس وقت وہ جوگی ایک کمرے میں بندھا ہوا بے ہوش پڑا تھا اور میں ایک اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا، جہاں پر ہوٹل میں ہونے والے آپریشن کو دکھایا جا رہا تھا۔ اس آپریشن کا انچارج آفتاب کرمانی لائین پر تھا۔ اس نے مجھے وہاں کی صورت حال بتاتے ہوئے کہا۔

”ہوٹل کی اوپری منزل کو پوری طرح سیل کر دیا گیا ہے۔ جو لوگ اب تک ان کے رابطے میں تھے وہ سبھی آ گئے ہوئے ہیں، ان میں سے صرف ایک رہتا ہے، اس کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”ان سے کچھ معلومات ملیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت زیادہ، لیکن ابھی یہ سب ابتدائی ہے، یہ کینسر کہاں کہاں تک پھیلا ہوا ہے، اسے جاننے کیلیے تو ابھی وقت لگے گا۔“ اس نے بتایا۔

”ٹھیک ہے، میرا کام ختم ہوا، آپ کا شروع ہو گیا، اب یہ سب آپ دیکھیں۔“ میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ سب سنبھال لیں گے۔ میں اسی وقت سرمد کے پاس گیا۔ وہ اس جوگی کا لیپ ٹاپ کھول چکا تھا۔ اس کے ساتھ وہاں کے ماہرین بھی تھے۔ اس وقت وہ اسے کھنگال رہے تھے۔ جیسے ہی میں ان کے قریب گیا تو سرمد نے کہا۔

”یہ شک بالکل درست تھا کہ معلومات کہاں جا رہی ہیں، یہ سب یہاں ہیں، اس بندے کے پاس آ رہی تھیں۔ اس نے آگے ٹرانسفر ابھی کیوں نہیں کیں ابھی، شاید وہاں اسے کھولنے کا موقعہ نہیں ملا، یا پھر ابھی......؟“ اس نے مزید کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”تم نے دیکھ لیا، ہمارا کام ختم ہوا، یہ سب یہاں پر ہیں، اسے دیکھ لیں گے، ہمیں اب چلنا ہے۔“

”بس دو منٹ، ابھی چلتے ہیں۔“ اس نے کہا اور اسکرین کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی تیزی سے میری طرف آیا اور تیزی سے بولا۔

”سر! آپ فوراً آئیں میرے ساتھ۔“

”چلو۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”اُوہ! خیر تو ہے نا؟“

”وہ جوگی، وہ بندھا ہوا تھا، جیسے ہی اسے ہوش آیا، اس کی رسیاں خود بخود ٹوٹ گئی ہیں۔ اس نے سر فرش پر مار کر بری طرح زخمی کر دیا ہے۔“ وہ میرے ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے بولا تو میں مزید تیز رفتاری سے اس کمرے تک پہنچا جہاں کا منظر بڑا وحشت ناک تھا۔ وہ جوگی ایک جانب بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر صرف لنگوٹ تھا۔ روشنی میں اس کے بھی خدوخال نظر آ رہے

تھے، یہاں تک کہ اس کے چہرے کا وحشی پن بھی لیکن اس کے ساتھ جو وہاں وحشی پن دکھائی دے رہا تھا، دو سیکورٹی گارڈ زفرش پر بے حس وحرکت پڑے تھے۔ ان کے بدن سے لہو نکل کر پھیل رہا تھا۔ فرخ ایک دیوار کے ساتھ لگا ہوا بے ہوش تھا۔ ایک گارڈ کی آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں لیکن وہ ساکت تھا۔ میں نے اس جوگی کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں نے اشارے سے سب کو وہاں سے لے جانے کے لیے کہا۔ کئی سیکورٹی گارڈ آگے بڑھے اور انہوں نے سب کو اٹھا لیا۔ کمرے میں صرف میں اور وہ جوگی رہ گئے۔ میں نے اس جوگی کی طرف دیکھ کر درشت لہجے میں کہا۔

"اوئے اٹھ کر کھڑا ہو جا اور بتا کون ہے تو؟"

میرے یوں کہنے پر اس نے آنکھیں کھول دیں، پھر زیر لب مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"ہمت ہے تو پوچھ لے؟"

"سن، میں نے تیرے جیسے کئی بندروں، کتوں اور ریچھوں کو اپنی انگلی پر نچایا ہے، میری ہمت مت دیکھ، ورنہ میں تمہارا نام نہیں پوچھوں گا اور تو اپنے بارے بتانے کو ترسے گا۔" میں نے کہا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ اٹھایا، جیسے ہی اس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا، آگ کا ایک گولا میری طرف آیا، یہ ایک ثانیے سے بھی کم وقت میں ہوا، میں نے اپنی ہتھیلی کھڑی کر دی۔ وہ آگ کا گولا میری ہتھیلی سے ٹکرایا اور ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر وہ ایک لمحے کو گھبرا گیا، پھر اضطراری انداز میں اٹھ بیٹھا۔ میں اس کی نگاہوں میں دیکھ رہا تھا، جہاں حیرت سمٹ آئی تھی۔ وہ جادو جانتا تھا اور اپنے عمل کو بے اثر جاتا دیکھ کر اسے حیرت ہونا ہی تھی۔ میں اس بات کو سمجھتا تھا۔

دراصل شیطانی قوتیں ایسے بندے کی مدد کو آ جاتی ہیں۔ لفظ جادو ہی میں جادو ہے، ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ ایک دھوکے کا نام ہے، جو اس سے ڈر گیا، وہ فنا ہو گیا، کیونکہ وہ شیطانی عمل کی لپیٹ میں آ گیا اور وہ جو اسے محض دھوکا سمجھتا ہے، اور ہے بھی ایسا ہی تو اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کے لیے یہ ماورائی عمل ہوتا ہے لیکن یہ اُن لوگوں کے لیے ماورائی ہے جو اس کی حقیقت نہیں جانتے۔ جن لوگوں کو ربّ تعالیٰ پر بھروسہ اور کامل یقین ہوتا ہے، وہ اس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ بس بندے کو بھروسہ اور یقین بارے پتہ ہونا چاہئے۔

میرے ذہن میں تھا کہ اس کا بازو نکل چکا ہے، مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑا خود پر قابو پا چکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو اپنی ساری شعبدہ بازیاں دکھا لے، میں اس کے بعد ہی تم سے پوچھتا ہوں۔"

"ابھی تو نے کیا دیکھا۔ لے اب دیکھ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پھر سے ہاتھ لہرایا تو ایک سانپ اس کے ہاتھ میں تھا، جو اس نے لہرا کر میری جانب پھینک دیا۔ میں نے اسے دبوچا اور ایک ہی جھٹکے میں دو ٹکڑے کر دیئے۔ جیسے ہی وہ سانپ دو ٹکڑے ہوا، میرے ہاتھوں میں وہ راکھ بن گیا، میں نے اسے پھینکا اور آگے بڑھا۔ وہ لاشعوری طور پر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ میں اس کے بالکل قریب چلا گیا اور اسے گردن سے پکڑ لیا۔ اس نے کچھ دیر پہلے والا حربہ مجھ پر آزمانا چاہا، اس نے اپنا گھٹنا میری ٹانگوں کے درمیان مارنا چاہا، لیکن اس کا یہ وار خالی گیا۔ میں نے اسے گردن سے دبوچ کر اسے سامنے والی دیوار میں دے مارا لیکن وہ بالکل دیوار کے پاس پہنچ کر رکا اور انتہائی سرعت کے ساتھ اس نے اپنی ٹانگ گھمائی۔ میں ذرا سا پیچھے نہ ہٹتا تو اس کی ٹھوکر میرے منہ پر لگنی تھی۔ میں

نے اس کی اٹھی ہوئی ٹانگ کو پکڑا اور اپنی طرف کھینچا۔ وہ لڑکھڑایا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ فرش پر گرا۔ میں نے پوری قوت سے ٹھوکر اس کے منہ پر ماری۔ پھر اسے گردن سے دبوچ لیا۔ میں نے اس کا سر دیوار میں دے مارا تو وہ بے ہوش ہوتا چلا گیا۔ میں نے پانی کی بوتل پھر اس کے منہ پر انڈیلی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں مانتا ہوں کہ اس میں بلا کی برداشت تھی۔ اب میں اسے کوئی وقت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ خون سے لت پت تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اپنی ران پر رکھا اور پوری قوت سے کھڑی ہتھیلی اس کی کلائی پر ماری۔ ایک چیخ اس کے حلق سے بلند ہوئی۔ اس کی کلائی ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے اس کا دوسرا بازو پکڑا، اب اس میں اتنی مزاحمت نہیں تھی۔ میں نے اس کی دوسری کلائی بھی توڑ دی۔ وہ بے جان سا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا، جیسے سانپ کو مارا جائے تو ایک دم سکڑ سا جاتا ہے۔

میں ایک اسٹول پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی پڑا رہا، پھر اس نے ہولے سے میری طرف دیکھا، وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس کی آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ میں اٹھا اور جا کر اس کی گردن پھر سے دبوچ لی۔

"بول، دکھا چمتکار۔" میں نے انتہائی غصے میں کہا۔

"تو...... پہلا ہے...... جس نے مم...... میری بیس سال...... کی تپ...... تپسیا...... کا سامنا...... کیا ...... کک ...... کوئی نہیں...... ٹھہر سکا...... آج تک۔" وہ بہ مشکل ہولے ہولے کہہ رہا تھا

"تجھے کہا نا تیرے جیسے بندر، کتے اور ریچھ نچانا مجھے آتا ہے۔ چل اب بک دے کیا کر رہا تھا تو وہاں؟" میں نے اس کے ماتھے پر دباؤ بڑھا کر پوچھا۔

"آج رات ...... تو نہ آتا تو...... میں تیرا ...... ایٹمی راز...... لے جاتا...... میں مہان شکتی لینے ...... مندر چلا گیا۔ آج کی صبح ...... میں نے سب لے کر ...... نکل جانا تھا۔ میں برج ناتھ ...... ایک چور ہوں ...... تیرے ایٹمی راز کا ...... سب لے جاتا ...... سب ......" یہ کہہ کر اس نے گردن ایک جانب ڈال دی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

میں اٹھا اور باہر چل دیا۔ اب وہ بے کار ہو چکا تھا۔ میں باہر آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سب اس کمرے میں ہونے والی ایک ایک حرکت دیکھ چکے تھے۔ تبھی ایک آفیسر میرے قریب آیا اور اس نے پوچھا۔

"آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں اور اب جانا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ انہیں سنبھال لیں گے۔"

"ہاں، سب ٹھیک ہے۔ وہ ہوٹل اور اس میں سب کچھ چلا دیا ہے۔ تاکہ سب ایک راز بن کر دفن ہو جائیں۔"

"اوہ! میرے منہ سے نکلا اور میں اٹھ گیا۔

میں اس عمارت کے لاؤنج میں آیا تو وہیں مجھے سرمد اور جنید مل گئے۔ ہم باہر نکلے تو پورچ میں فور وہیل کھڑی تھی۔ ہم اس میں بیٹھ کر چل دیئے۔

❋ ❋ ❋

صبح کی روشن کرنیں اوگی پنڈ کو روشن کرنے کو بے تاب تھیں۔ جسپال سنگھ چھت پر کھڑا دور پھیلے ہوئے گاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منظر واضح تھے لیکن وہ اپنی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ یہ جو سردار سرجیت سنگھ بندیال نے اس پر ذمہ داری ڈالی تھی، اسے وہ کب تک نبھا پائے گا۔ وہ خالصتان کے دشمنوں کو ختم کرتا ہوا خود بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن پتہ نہیں وہ اپنی آنکھوں سے خالصتان کا خواب پورا ہوتا ہوا دیکھ بھی پائے گا کہ نہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ مرنا ہر

انسان نے ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے لیکن مرنے مرنے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس فلسفہ کو بخوبی جانتا تھا۔ لیکن انسان بڑا بے صبرا ہے، وہ اپنے خواب اپنی آنکھوں سے پورا ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ ان خوابوں کو بھی جنہوں نے صدیوں بعد پورا ہونا ہوتا ہے۔ وہ یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اسے اپنے کاندھے پر جانا پہچانا لمس محسوس ہوا۔ اس نے مڑے بغیر کہا۔

"ہرپریت! تمہیں احساس ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے خالصتان بنتا ہوا دیکھ لو گی؟"

اس کے یوں پوچھنے پر ہرپریت کور نے اس کا بازو پکڑا اور انتہائی نرمی سے اپنی جانب موڑتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

"بات یہ نہیں ہے کہ خواب پورا ہو جائے، بات یہ ہے کہ میری آنکھوں میں ایک خواب تو ہے، قسم ہے واہ گرو کی، میں اس خواب کو حقیقت بنتا دیکھ چکی ہوں، ایک بار نہیں کئی بار۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو پریتو، خواب ہی نہیں آئے گا تو تعبیر کہاں سے آئے گی۔" جسپال سنگھ نے سوچتے ہوئے کہا، پھر تیزی سے پرجوش لہجے میں بولا۔

"تو نے میری ایک بہت بڑی مشکل حل کر دی ہے پریتو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہرپریت کو اپنے ساتھ لگانا چاہا تو اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا مگ اچھل گیا۔ اصل میں ہرپریت بھی ایک دم سے نشے میں آ گئی تھی۔ بہت عرصے بعد اس کے منہ سے پریتو نکلا تھا

"اوئے ہچ۔" ہرپریت تیزی سے بولی۔ چائے فرش پر گر گئی تھی۔ مگ میں تھوڑی سے بچی۔ جسپال نے وہ مگ پکڑتے ہوئے کہا۔

"بہت بڑی بات کہہ دی ہے یار تو نے۔"

"ایسی کیا بات کہہ دی میں نے؟" اس نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں نا کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ کیا سردار سرجیت سنگھ بندیال نے جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے، اسے کیسے پورا کر سکوں گا۔ میں کچھ اور بھی چاہتا تھا۔ وہ کیا ہو؟ یہ مجھے سمجھ میں آ رہا تھا۔ ابھی سمجھ میں آ گیا۔" یہ کہتے ہوئے جسپال نے چائے کا سپ لیا تو وہ بولی۔

"وہ کیا؟"

"وہ یہ ہے پریتو کہ جس طرح تیری آنکھوں میں خواب ہیں، اسی طرح یہ خواب ہر سکھ کی آنکھ میں ہونا چاہئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک جو بھی سنگھ خالصتان کے لیے نبرد آزما ہے، وہ انتقام کے جذبے میں ہے۔ وہ ہندو سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ وہ اکال تخت کے لیے نہیں اپنے بڑوں کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے انتقام کی پٹی اتاری جائے اور اس کی آنکھوں میں اکال تخت کا خواب بھر دیا جائے۔" اس نے گہرے ہوتے ہوئے لہجے کے ساتھ کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، ہمیں اس پر بھی محنت کرنا ہو گی، ہمیں وہ پڑھے لکھے لوگ تلاش کرنا ہوں گے جو اس خواب کو حقیقت بنا کر دکھائیں۔" ہرپریت کور نے بھی پورے جوش سے کہا، پھر ایک دم سے یوں جیسے بجھ گئی ہو۔ تب جسپال نے کہا۔

"میں نے سوچا ہے کہ خالصتان کے لیے ساری زندگی بھی لڑتے رہے تو ہندو کی سازش کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے پہلے اگر سو لوگ خالصتان کی حمایت میں تھے تو اب پچاس ہیں۔ لوگ شدت پسند تحریکوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ یہ زمانہ دلیل کا زمانہ ہے۔ ہندو یہ چاہتا ہے ہم لڑتے رہیں اور اس تحریک کے ساتھ لوگ کم ہوتے چلے جائیں لوگوں میں مایوسی بڑھ جائے۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ سنگھ اور کور دونوں کو شعور دوں، اپنے

خالصتان کی تحریک کو دلائل کے ساتھ اقوام متحدہ میں رکھوں۔ برطانیہ میں اپنے حق کے لیے الیکشن ہو سکتا ہے تو بھارت میں کیوں نہیں۔ اسی کو بنیاد بنا کر میں پوری دنیا میں سکھوں کو اکٹھا کروں گا۔'' وہ جوش میں کہتا چلا جا رہا تھا۔ جبکہ ہرپریت سنتی چلی جا رہی تھی۔ جسپال یہ سن کر یوں جیسے خوابوں میں کھو گیا وہ چند لمحے یونہی کھڑی رہی پھر پلٹ کر تیز قدموں سے چلتی گئی۔ جسپال نے اسے سیڑھیاں اترتے دیکھا مگر اسے روکا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دُکھ کیا ہے۔ وہ بھی ہولے ہولے نیچے چلا گیا۔

ناشتے کے بعد کلجیت کور ان سب کو لے کر لاؤنج ہی میں بیٹھ گئی۔ اس نے سب سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''اب بتاؤ' برار صاحب کے ساتھ کیا بات کرنی ہے۔ تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟''

اس پر بھی خاموش رہے۔ تبھی جسپال ہی بولا۔

''پھوپھو! آپ کا کیا خیال ہے؟''

''دیکھو بیٹا، میں نے تو بہت دیکھ بھال کے، ادھر ادھر سے سن سنا کر یہ رشتہ طے کرنے کی بابت سوچا ہے۔ دوسرا ہمارے خاندان کا ان کے ساتھ پرانا تعلق بھی ہے۔ انہیں ہمارے بارے میں بھی سب پتہ ہے۔ یہ پرانا تعلق ہی تو ہے جو وہ ہمارے ساتھ رشتہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ کہاں وہ زمین جائیداد والے، جن کا باہر بزنس ہے۔ وہ تو یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ ساری زمین جائیداد، ہماری نہیں جسپال کی ہے اور ہم اس پر......؟'' کلجیت کور نے کہنا چاہا تو جسپال نے ٹوک دیا۔

''نہیں پھوپھو، یہ ایسا نہیں ہے، زمین اور جائیداد میں نے سب انوجیت کو دے دی ہے، اس کے نام ہو گئی ہے، دوسرا ہمارا انوجیت سنگھ لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں ایک ہے۔ ایسی کئی لڑکیاں ......'' اس نے کہنا چاہا تو کلجیت کور نے کہا۔

''مجھے نہیں پتہ تو نے کیا کیا ہے اور کیا نہیں لیکن، وہ تو تب سے میرے ساتھ بات کر رہے ہیں، جب یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ انوجیت ممبر بنے گا۔ خیر جو بھی ہے، میں تم لوگوں کی رائے کے بغیر کچھ نہیں کرنے والی۔'' کلجیت کور نے صاف لفظوں میں کہا۔

''پھر تو یہ انوجیت ہی بتائے نا؟'' ہرپریت کور نے کہا تو وہ کسمسا کر رہ گیا پھر دھیرے سے بولا۔

''ٹھیک ہے بے بے، جیسا آپ کہیں، میری بھی مرضی ہے۔''

''او کے ڈن ہو گیا۔'' جسپال نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اب بتاؤ، شادی کب کریں، مجھے برار صاحب نے کہا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ باہر چلے جانا چاہتے ہیں۔''

''میری طرف سے تو صبح ہی رکھ لیں۔'' جسپال نے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔ اس پر بانیتا کور بولی۔

''تیری کون سی ہو رہی ہے، توایویں ای۔''

''اس سے پوچھ، جس کی ہونی ہے، اس کے دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں نا، وہ تو آج ہی چاہ رہا ہوگا۔ کیوں انوجیت ویرے؟''

''بھائی جی آپ بھی نا، بس جو کرنا ہے وہ کر دیں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چل دیا۔ باقی ہنسنے لگے۔

''ٹھیک ہے پتر! اب تم لوگ پلان کر کے دے دو، آج شام ہی برار صاحب کی طرف ہو آتے ہیں۔ میرے خیال میں بھی یہ شادی جلدی ہو جائے تو اچھا ہی ہے۔'' کلجیت کور نے اٹھتے ہوئے کہا، پھر ایک دم رک کر بولی۔

''ہاں پتر بانیتا، اب تو نے کہیں نہیں جانا، اس وقت تک تم نے یہیں رہنا ہے، جب تک یہ شادی نہیں ہو جاتی۔ سارا انتظام تم نے کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی جانب چل دی۔

''بس پھر ہوگئی شادی۔'' جسپال نے آہستہ سے کہا تو بانیتا تنک کر بولی۔

''کیا مطلب، کیا میں شادی کا انتظام نہیں کر سکتی؟''

''کر سکتی ہو، پٹاخوں کی جگہ گولیاں چلیں گی۔ اصلی بم پھوڑے جائیں گے۔'' وہ کہنے لگا تو بانیتا کور ایک دم سے اس پر جا پڑی۔ اسے صوفے ہی میں دبوچ لیا۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''اب بتا، کیا ہوگا؟''

''اُو، معافی، میں نے کس کو چھیڑ دیا۔'' جسپال نے کہا تو وہ ایک طرف ہو کر بولی۔

''ہر پریت، ہم دونوں اس شادی کا انتظام کریں گے، دکھا دیتے ہیں انہیں۔'' بانیتا کور نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بھی ہنس دی۔ پھر بولی۔

''میں ابھی کاغذ پنسل لے کر آتی ہوں، پہلے پیپر ورک کر لیں، آخر ہم نے کرنا کیا ہے۔''

''ہاں بلڈنگ کھڑی کرنی ہے نا۔'' جسپال نے کہا تو بانیتا کور نے گھور کر دیکھا تو وہ اٹھ کر باہر کی جانب چل دیا۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگیں۔

❁ .... ❁ .... ❁

اس وقت رات کا دوسرا پہر تھا، جب وہ لاہور پہنچ گئے۔ وہ ماڈل ٹاؤن والے گھر نہیں گئے، بلکہ سیدھا طارق نذیر کے سیف ہاؤس جا پہنچے، جہاں پر وہ بندہ لا کر رکھا گیا تھا، جس کے بارے میں اس نے ہدایت دی ہوئی تھیں۔

وہ شخص بظاہر ایک عام سا بزنس مین تھا، اس کا اخبار اور ساتھ ایک چینل بھی تھا۔ کچھ پراپرٹی کا کام بھی کرتا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں میں ایک شریف النفس اور بے ضرر دکھائی دیتا تھا۔ بڑا خدا ترس مشہور تھا۔ لیکن اندر سے وہ بہت ظالم انسان تھا۔ اس کی پہلی اور آخری ترجیح فقط دولت تھی۔ اس کے لیے وہ کیا کچھ کرتا تھا، اس کی ذرا سی جھلک یہی بتائی جا سکتی ہے کہ وہ لوگوں کی ڈیل کراتا تھا۔ سامنے خدا ترس دکھائی دینے والا جرائم کی دنیا میں ڈیل کروانے والا تھا۔ کون کیا کر رہا ہے، کس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے، کسے کیا چاہئے، اسے سب پتہ ہوتا تھا۔ اصل میں وہ پولیس کا سب سے بڑا انفارمر بھی تھا۔ اس نے اپنا کھیل کچھ اس طرح جمایا ہوا تھا کہ کسی کو خبر نہیں ہوتی تھی کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ یہاں تک رہتا تو معاملہ دوسرا تھا۔ یہی ڈیل اب وہ ایسے لوگوں سے بھی کرنے لگا جو ملک دشمن عناصر تھے۔

وہ تقریباً ڈیڑھ برس پہلے لندن گیا تھا، جہاں اس کی ملاقات ایک انگریز نے ایک بھارتی سے کروائی۔ یہ انگریز پہلے بھی اس سے کام لیتا رہا تھا۔ بھارتی نے اسے ایک بڑی ڈیل کی آفر کی۔ کرنا اسے یہ تھا کہ جنوبی افریقہ اور ایسے ہی ممالک سے آنے والے لوگوں کو ایسے لوگوں سے ملوانا تھا جو انہیں اپنے پاس رکھ سکیں اور انہیں یہاں جو بھی کرنا ہو اس پر پورا پورا تحفظ فراہم کریں۔ بظاہر یہ ڈیل بڑی آسان تھی لیکن اس کے مقابلے میں دولت کی آفر بہت زیادہ تھی۔ اس لیے یہ سب مان گیا۔ اس کے واپس پاکستان آتے ہی ایک ایک کر کے لوگ آنا شروع ہو گئے۔

روہن، بنگا ٹکر اور اویناش اسی کے پاس آ رہے تھے۔ اس نے ہی آگے ان لوگوں کا بندوبست کیا تھا، جن کے ذریعے انہوں نے یہاں بم دھماکے کروانا تھے۔ یہ انسانیت پر ظلم کی انتہا تھی۔

وہ ٹھگنے قد کا گول مٹول سا سفید رنگ کا تھا۔ اس کی داڑھی خشخشی ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی مونچھیں اور سر سے کافی حد تک گنجا تھا۔ وہ فرش پر پڑا تھا۔ میں جس وقت کمرے میں گیا تو اس نے میری طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے مجھے دوبارہ دیکھا تو میں نے پوری قوت سے پاؤں کی ٹھوکر اس کے ماتھے پر ماری۔ وہ اُلٹ کر پیچھے گرا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے دوسری ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماری تو وہ فرش پر دوہرا تہرا ہونے لگا، جیسے یہ ابھی مر جانے والا ہے۔ میں نے پھر اس کے سینے پر لات رسید کی تو وہ تڑپنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور لائیٹر جیب سے نکالا، جو میں اسی مقصد کے لیے باہر ہی سے لایا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ میں کیا کرنے لگا ہوں، جیسے ہی میں نے لائیٹر روشن کیا، وہ سمجھ گیا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے زور زور سے چیخنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور آگ کی لَو سے اس کی ہتھیلی جلانے لگا۔ وہ تڑپتے ہوئے ڈکارنے لگا۔ میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں بولا۔ تب وہ چیختے ہوئے کہنے لگا

''خدا کے لیے بتاؤ کیا چاہتے ہو؟''

''ان سب لوگوں کا پتہ، جنہیں یہاں پناہ دی ہوئی ہے۔'' میں نے سکون سے کہا وہ تڑپتے ہوئے زور سے بولا۔

''میرے پاس کوئی نہیں ہے، سب مر گئے ہیں، کچھ دیر پہلے میں نے سنا۔''

''ایک ایک کا حساب دو۔''

''بتاتا ہوں، سب بتاتا ہوں۔'' اس نے تیزی سے ہاتھ چھڑانے کی خاطر کہا، لیکن میں نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا، لائیٹر سے ویسے ہی جلاتا رہا۔

''اگر ذرا سا بھی جھوٹ بولا تو سیدھے پہلے تیری آنکھیں جلاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے لائیٹر کی لو اس کی آنکھوں کے پاس کی تو ایک دم سے پیچھے ہٹ کر خوفزدہ انداز میں دیکھنے لگا۔ میں نے لائیٹر بند کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ سامنے ہی طارق نذیر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''ڈر گیا ہے۔ لیکن جھوٹ پھر بھی بولے گا۔ ایک دو دن اسے دیکھو، پھر میں آ کر اسے دیکھتا ہوں۔ اس کے پیچھے بہت سارے لوگ ہیں۔''

''جی بالکل، اس وقت یہ جرم بغیر چین کے ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس میں بہت سارے لوگ ملے ہوئے ہیں۔ یہ تو اس کا حصہ ہی لگتا ہے۔''

''اب انہی کا صفایا کرنے کی ضرورت ہے۔ جو سیاسی لبادے میں، مذہبی چولا پہن کر یا این جی او کے بھیس میں ملک دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اب ان کا خاتمہ میں نے ہی کرنا ہے۔ اب بات اسی سے شروع کریں گے، دیکھیں کہاں جا کر ختم ہوتی ہے یا پھر ہم ختم ہو جاتے ہیں۔'' میں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ میرا رُخ نور نگر کی طرف تھا۔

نور نگر پہنچنے تک دن نکل آیا تھا۔ سرمد لاہور ہی میں رہ گیا اور جنید میرے ساتھ تھا۔ پورچ میں فور وہیل رکی تو میں اتر کر اندر جانے لگا۔ تبھی مہوش تیزی سے دروازے تک آ گئی۔

''رُکو، رُکو، جمال بھائی وہیں رُکو۔''

''خیر ہے، کیا ہو گیا۔'' میں نے ایک دم سے گھبرا کر پوچھا، میرا دل ایک دم سے دھڑک اٹھا تھا۔

''خیر ہے، رُکو آپ، جب تک میں نہ کہوں، آپ نے اندر نہیں آنا۔'' مہوش نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے تیزی سے کہا۔ میں وہیں پورچ میں داخلی دروازے کے باہر رک گیا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی سرپرائز ہی ہو سکتا ہے۔ میں رک گیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ مہوش کے ساتھ رونیت کور آتی ہوئی دکھائی دی۔ ان کے ہاتھوں میں پیتل کی کٹوریاں تھیں۔ پہلے مہوش نے دروازے کے دائیں بائیں فرش کے کونوں پر تیل ڈالا، اسی طرح رونیت کور نے

بھی کیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ میں اندر لاؤنج میں جا بیٹھا تو وہ دونوں میرے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھیں۔

''یہ کیا تھا بھئی؟''

''پانی پی لیں، پھر یہ بھی پینا یاد نہیں رہے گا۔'' مہوش نے خوشی سے نہال ہوتے ہوئے کہا۔ میں ان کے چہرے پر پھوٹتی ہوئی خوشیاں دیکھ کر مطمئن ہو گیا تھا، اس لیے کاندھے اچکا کر کہا۔

''چلو، ایسا کر لیتے ہیں۔''

اتنے میں ایک لڑکی پانی لے کر آ گئی۔ اس دوران جنید بھی میرے ساتھ آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب ہم پانی پی چکے تو مہوش بولی۔

''مجھے پہلے یہ بتائیں کہ میرا اور آپ کا تعلق کیا ہے، بھائی کا یا بہن کا؟''

''آف کورس بہن کا، تم میری اتنی ہی پیاری بہن ہو جتنی یہ رونیت کور، اب بتاؤ بات کیا ہے۔'' میں نے کہا تو مہوش ایک لمحے کے لیے جذباتی ہو گئی، ایسا ہی کچھ حال رونیت کور کا بھی تھا۔ ان کے چہرے پر پل پل بدلتے رنگ اور میرے لیے عقیدت مجھے خود سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ تب ہی مہوش نے خود پر قابو پاتے ہوئے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

''بھائی! میں پھوپھی بننے والی ہوں۔''

''اور میں بھی۔'' رونیت کور کہتے ہوئے رو دی۔ یہ خبر خود مجھے سر سے پاؤں تک خوشی سے بھر دینے والی تھی۔ میں اٹھا اور بازو پھیلا دیئے۔ دونوں میری بانہوں میں سمٹ آئیں۔ میں نے ان کا سر تھپکتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

''بولو، مانگو کیا مانگتی ہو؟''

''جو ہم مانگتی ہیں وہ آپ نہیں دے سکتے، ہم تو اپنے بھائی کی زندگی کی دعا مانگتی ہیں، سلامتی کی دعا مانگتی ہیں۔ جو آپ نے اب تک دیا، وہ کم ہے کیا؟''

میرے سینے سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ میں ان سے الگ ہوا تو جنید میرے گلے لگ گیا۔

''میں بھی تو چاچا بن گیا ہوں نا۔''

''ابھی وہ آنے والا آیا نہیں اور تم ابھی سے اپنے رشتے جوڑ رہے ہو۔'' اماں بھی وہیں آ گئیں تو میں ان کے ساتھ گلے لگ کر ملا۔ مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں جا رہا تھا۔ انہوں نے مجھے خود سے الگ کیا اور بولیں۔

''جا سوہنی کے پاس، وہ اپنے کمرے میں ہے۔''

میں نے انہیں دیکھا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

سوہنی بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری آہٹ سن کر وہ شرما لجا گئی، جیسے پہلے دن کی دلہن حیا سے دہری ہو جاتی ہے۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ وہ یونہی بیٹھی رہی۔ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ سمٹتی ہوئی میرے ساتھ آ لگی تو میں نے کہا۔

''اتنا قیمتی تحفہ دینے کا بہت شکریہ۔''

''آپ نے اپنا آپ مجھے سونپ کر جو اتنا قیمتی تحفہ دیا، اس سے تو بہت کم ہے۔'' وہ منمناتے ہوئے بولی۔ میں نے اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''پتہ نہیں ہماری قسمت میں کیا ہے، بیٹا یا بیٹی، لیکن جو بھی ہے، وہ میرے رب تعالیٰ کی رضا ہے۔ بیٹی رحمت ہے اور بیٹا نعمت۔ بس اپنا خیال رکھنا۔''

''جی، ضرور۔'' اس نے نگاہیں جھکائے کہا تو میں نے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر چہرہ اوپر کیا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر ایک الوہی نور پھیلا ہوا تھا۔ اس دن مجھے وہ بہت ہی پیاری لگی۔ یوں جیسے آج مجھے اس سے محبت ہو گئی ہو۔ میں اس سے الگ ہو بیٹھا اور مہوش اور رونیت کور کی بات بتانے لگا۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ مجھے لگا زندگی کتنی خوبصورت ہے۔

"جسپال سنگھ کو بتایا؟" ایک دم سے سوہنی نے پوچھا تو میں نے کہا۔

"اُو بیوی، مجھے خود ابھی پتہ چل رہا ہے اور میں کیسے بتا سکتا ہوں اسے۔" یہ کہہ کر میں نے پوچھا۔

"کیا بتادوں اسے؟"

"ہاں، پھر مجھے اس سے بات بھی کرنی ہے۔"

"کیا بات کرنی ہے۔" میں نے یونہی سرسری سے لہجے میں پوچھا تو وہ بولی۔

"یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔"

"چلو، تمہاری مرضی۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد، بھی لاؤنج میں تھے۔ یہاں تک کہ شمس اور قمر بھی ایک جانب بیٹھے ہوئے تھے۔ اشفاق چوہدری نے لندن میں تائی کو بتادیا تھا۔ اروند نے ایک بڑی اسکرین لگا دی تھی۔ جس پر اس سے باتیں ہوتی رہی تھیں۔ وہ افسوس کر رہی تھی کہ میں یونہی لندن چلی آئی۔ مجھے پتہ ہوتا تو میں نے جانا ہی نہیں تھا۔ اس نے بہت جلد آنے کا کہا تھا۔ اس سے بات ہو چکی تو اروند سنگھ اوگی سے رابطہ کرنے لگا۔ کچھ دیر وہاں رابطہ ہو گیا تو اسکرین پر سب سے پہلے کلجیت کور دکھائی دی۔

"بہت بہت ودھائی ہو سب کو، خاص طور پر دھی سوہنی کو۔ بہت دل کر رہا ہے کہ اُڑ کر تم سب لوگوں کے پاس آ جاؤں، پر اب انوجیت کی شادی کر کے ہی آؤں گی، ننکانہ صاحب متھا ٹیکنے اور نور نگر تم سب سے ملنے۔"

"جم جم آئیں گی، ہم انتظار کر رہے ہیں۔" سوہنی نے کہا اور پھر جلدی سے پوچھا۔

"کوئی بات ہوئی دن رکھنے کی؟"

"نہیں ابھی تو ان سب سے بات ہوئی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ میں اسی ہفتے ہی ان کی شادی کروا دوں گی۔ برار صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔"

"پھر اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگ اگلے مہینے میں آ رہے ہیں؟" سوہنی نے پوچھا۔

"رَبّ خیر سکھ رکھے، اگلے ہفتے میں آ رہے ہیں۔ ہمارے کاغذات چلے گئے ہیں۔"

"سبھی آ رہے ہیں نا؟" رونیت کور نے پوچھا تو جسپال نے سامنے آ کر کہا۔

"ہاں سبھی آئیں گے، میں بھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ رکا پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"سوہنی بہن، بہت بہت مبارک ہو، سب چاچا بنے ہیں، میں ماما بنوں گا۔" اس نے انتہائی پیار سے کہا تو سوہنی ایک دم سے کرخت لہجے میں بولی۔

"خبردار، اگر مجھے بہن کہا اور ہمارے گھر میں قدم رکھا تو، تمہیں کوئی اجازت نہیں ہے یہاں آنے کی۔"

یہ سن کر جسپال سنگھ ہونقوں کی مانند اسے دیکھنے لگا، اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے سمجھ نہیں آئی کہ یہ ہو کیا گیا ہے؟ وہ حیرت زدہ سا اسکرین پر جامد کھڑا تھا۔ باقی سب بھی اس کے اس رویے پر حیران تھے۔ چند لمحے یونہی گذر گئے۔ تبھی جسپال روہانسا ہوتے ہوئے بولا۔

"ایسی کیا غلطی ہوگئی میری بہن، مجھے بتاؤ تو سہی، ایسا کیا ہو گیا؟"

"تمہیں ہرپریت کا احساس تک نہیں ہے۔ میں نے تم سے اکیلے میں بات کرنا تھی، لیکن اب سب کے سامنے کر رہی ہوں۔ اگر تم ہرپریت کو بیاہ کر لائے تو یہاں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ اگر تم پر بوجھ ہو گی تو یہ بوجھ تیری یہ بہن برداشت کرے گی، بتا دنیا کے کس کونے میں رکھنا ہے اُسے؟"

"یہ...... یہ تم......" جسپال نے کہنا چاہا تو سوہنی نے تنک کر کہا۔

''میں تمہاری ساری دلیلیں اور فلسفے جانتی ہوں۔ دنیا میں تحریک چلانے والے لوگ کیا شادی نہیں کر تے ، اپنوں کو چھوڑ دیتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ تم اس کی محبت کو نظر انداز کر رہے ہو۔'' سوہنی جیسے سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔

''ٹھیک ہے میری بہن، جیسے تم کہو۔'' جسپال نے کہا اور اسکرین سے ہٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے ہرپریت اسکرین کے سامنے تھی۔

''سوہنی! میں مانگے کی محبت نہیں......''

''مجھے فلسفے نہ سمجھاؤ۔ جو کہا ہے وہی کرو۔'' سوہنی نے کچھ اس طرح کہا کہ میں خود حیران رہ گیا۔ اس نے پہلے کبھی ایسے بات نہیں کی تھی۔ اس کے اس انداز میں کتنی محبت تھی، یہ وہی سمجھ سکتا تھا، جس نے ایسا تعلق دیکھا ہو اور برتا ہو۔ ہم کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر سلسلہ ختم ہو گیا۔

❁......❁......❁

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مسافر شاہ کے تھڑے پر جاؤں۔ وہاں جا کر دیکھوں، اس ماحول میں جاؤں۔ میں وہاں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ اچانک مجھے مہوش سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس سال میلہ ضرور لگے گا۔ میں نے مسافر شاہ کے تھڑے پر جانے کی بجائے اشفاق چوہدری کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ باہر گیا ہوا تھا، اسے آنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ میں کافی دیر تک اس سے میلے کے بارے میں بات کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں تھا کہ اس بار میلہ ضرور لگے گا۔ وہ اس کی تیاریوں میں تھا۔ وہ صرف تاریخ کے تعین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تب میں نے اس سے کہا۔

''یار! ایسا کرتے ہیں، پورے علاقے کا ایک چکر لگاتے ہیں، علاقے کے شہ زوروں کو ایک بار پھر سے تیار کرتے ہیں، اسی بہانے لوگوں سے بھی مل لیں گے۔''

''کیا تمہارا الیکشن لڑنے کا ارادہ بن گیا ہے؟'' اشفاق چوہدری نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ویسے ہی، ایک بار تو سب سے مل لیا جائے ، میں بھول ہی گیا ہوں اپنے علاقے کو۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔

''یہ نہ ہو کہ یہیں کوئی نیا فساد نکل آئے؟''

''کیا مطلب، کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''کوٹ سلطان کے چوہدری دین محمد کا بیٹا شہزاد اب اپنے باپ کا وارث بن گیا ہے۔ دین محمد تو بہت اچھا اور بیبا بندہ تھا، لیکن یہ شہزاد اب پر پرزے نکال رہا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس میلے میں ضرور کچھ نہ کچھ ایسا کرے گا، جس سے وہ علاقے کو بتا سکے کہ وہ بھی چوہدری ہے۔''

''چل دیکھ لیں گے ، اگر وہ چار بوریاں نوٹ لٹائے گا تو ہم چھ لٹا دیں گے، بھلا تو عوام کا ہی ہوگا نا۔ طاقت دکھائے گا تو پتہ چل جائے گا اسے کہ آئندہ کچھ نہیں کرنا۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بات یہ نہیں، میں تو فقط اتنا چاہتا ہوں کہ اچھا بھلا امن ہے، پورے علاقے کے لوگ سکون سے جی رہے ہیں، یہ نہیں......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات ٹوکتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لیں گے۔''

میری بات سن کر وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ میں نے اسے مسافر شاہ کے تھڑے پر چلنے کو کہا تو وہ اٹھ گیا۔

مسافر شاہ کے تھڑے پر جس وقت ہم پہنچے، سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ فریدا کھاڑے میں زور کر رہا تھا۔ کئی پہلوان تھے۔ وہاں پر لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی درویش بیٹھا ٹھنڈائی کی تیاری کر رہا تھا۔

میں بھی جا کر ان لوگوں میں کھڑا ہو گیا۔ وہاں پر لوگوں کا جوش ہی اتنا تھا اور وہ اس قدر متوجہ تھے کہ کسی نے مجھے دیکھا تک نہیں۔ میں تھوڑی دیر تک ان کے داؤ پیچ دیکھتا رہا پھر پلٹ کر تھڑے پر آن بیٹھا۔ میرے سامنے ڈھلتا ہوا سورج تھا۔ جس نے مغربی افق کو سارا نارنجی کر دیا تھا۔

❀......❀......❀

ابھی رات کا پہلا پہر ہی تھا۔ جسپال اپنے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ لگا باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ مسلسل سوہنی کی باتوں پر سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا لہجہ کس قدر سخت تھا۔ اس سخت لہجے میں جو مان چھپا ہوا تھا، وہ اس سے نگاہیں نہیں چرا سکتا تھا۔ اگر چہ اس نے اسی وقت سوہنی کے کہنے پر اپنا فیصلہ دے دیا تھا لیکن وہ تب سے یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ کیا واقعی وہ ہرپریت کے ساتھ زیادتی کرتا چلا آیا ہے۔ اس کی محبت کی وجہ سے اسے نظر انداز کرتا رہا ہے۔ اسے خود محسوس ہونے لگا تھا، اس نے ہرپریت کو نظر انداز کیا۔ اگر وہ اپنی محبت میں مخلص نہ ہوتی تو کیا وہ اس کا انتظار کرتی؟ اس پر جان تک وار دینے کا حوصلہ رکھنے والی ہرپریت نے بھی شکوہ تک نہیں کیا تھا۔ وہ اسی بارے سوچ رہا تھا کہ جمال کا فون آ گیا۔

''مجھے پتہ چلا ہے کہ تم اپنے کمرے ہی سے باہر نہیں نکل رہے ہو؟''

''کس نے بتایا،؟'' یہ کہہ کر اس نے خود ہی جلدی سے کہا۔

''خیر، پتہ لگنا کون سا بڑی بات ہے۔'' جسپال نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو جمال نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''دیکھو جسپال، اگر تمہیں سوہنی کی کسی بھی بات سے دکھ پہنچا ہو تو میں اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں، اس نے تو......'' اس نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''تمہیں یہ کس نے کہہ دیا کہ میں نے سوہنی کی بات کا برا منایا ہے، ارے اس نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں کمرے میں پڑا تب سے اب تک یہی تو سوچتا چلا جا رہا ہوں کہ اسے کس طرح یقین دلا سکوں گا کہ یہ سب کچھ میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا، مجھ پر ذمے داریاں ہی ایسی تھیں۔''

''اچھا اب بات سن، شاید سوہنی اس قدر سخت لہجے میں نہ کہتی اگر ہرپریت کی ساری روداد یہ تمہاری بانیتا کور نہ بتاتی۔ یہ دو دن سے سوہنی کے ساتھ رابطے میں ہے اور اس نے ساری باتیں کی ہیں۔ میں نے سب پڑھ لی ہیں۔'' جمال نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''چلو اچھا ہو گیا۔'' وہ بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

''اب تم ایسے کرو، جلد از جلد شادی کرو اور یہاں کا چکر لگا لو، شاید تمہیں پتہ ہے کہ نہیں، میلہ لگوا رہے ہیں۔ اگر آ سکو تو؟'' جمال نے کہا۔

''میں کوشش کروں گا کہ ایک ہفتے میں ہی یہ شادی بھی ہو جائے اور میں ننکانہ صاحب سے ہو آ وٗں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''مجھے بتاتے رہنا، کاش میں تمہاری شادی میں شریک ہو سکتا۔'' جمال حسرت سے بولا تو جسپال نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں، تمہارے پاس آ کر دوبارہ شادی کر لیں گے۔''

اس کے بعد وہ کچھ دیر یونہی باتیں کرتے رہے پھر رابطہ منقطع کر دیا۔ جسپال نے گہری سانس لی اور پلٹ کر نیچے جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ ابھی وہ باہر جانا ہی چاہ رہا تھا کہ ہرپریت آ گئی۔ وہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ تب جسپال نے مسکراتے ہوئے پاس

پڑی کرسی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''بیٹھو۔''

وہ بیٹھ گئی، پھر چند لمحوں بعد بولی۔

''یہ بانیتا بھی نا بس اس نے......''

''بہت اچھا کیا۔ میرے خیال میں ہمیں اب وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔'' جسپال نے کیسے ہی کہا تو ایک لمحے کو اسے یقین نہیں آیا۔ جب وہ خود پر قابو پا چکی تو بولی۔

''پتہ ہے، آج بے بے اسی لیے برار صاحب کی طرف نہیں گئیں۔ اسی بانیتا نے روکا ہوا تھا۔''

''تو اب چلے جاتے ہیں۔'' جسپال نے کہا۔

''نہیں، بے بے نے شام ہوتے ہی انہیں بتا دیا تھا کہ آج ہم نہیں آ رہے ہیں، صبح آئیں گے۔'' ہرپریت نے کہا تو وہ بولا۔

''آج اور ابھی جائیں گے، چل اٹھ۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہرپریت کا ہاتھ پکڑا تو وہ سمٹ کر اس کے سینے سے آ لگی۔ چند لمحوں تک جسپال اسے اپنے ساتھ لگائے رہا، پھر اسے الگ کرتے ہوئے اس نے اپنا سر ہلایا اور اسے لے کر نیچے کی جانب چل پڑا۔ وہ بھی اسی کے ساتھ تیزی سے چلتی گئی۔

❋......❋......❋

اگلی شام تک میلے کا اعلان پورے علاقے میں ہو چکا تھا۔ چوہدری اشفاق نے مسافر شاہ کے تھڑے پر اعلان کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے علاقے کے چند سرکردہ بندوں سے بات کی تھی۔ سیل فون کے ذریعے یہ خبر راتوں رات پورے گاؤں میں پھیل گئی تھی۔ میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہ خبر صرف یہیں تک محدود نہیں رہنی، اس خبر نے کئی سرحدیں پار کر جانی ہیں۔ یہ خبر جتنا پھیلاؤ رکھے گی، ہمیں اتنا ہی محتاط ہونے کی ضرورت تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کون، کس طرح ہم تک پہنچتا ہے، پھر اسی طرح اس کا مقابلہ کیا جائے۔ میں نے بھی پوری تیاری کا سوچ رکھا تھا۔ دوپہر ہونے کو آ گئی تھی۔ اس دوران مجھے نجانے کتنے فون آ گئے۔ میں فون سے اُکتا گیا تو اسے جنید کے حوالے کر دیا۔ میں سکون لینا چاہتا تھا۔ اس لیے اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو گیا۔ پھر جب اٹھا تو شام ہونے کو تھی۔ میں فریش ہو کر باہر لان میں آ گیا، جہاں جنید اور اشفاق چوہدری باتوں میں مشغول تھے۔ میں جا کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ چوہدری اشفاق نے کہا۔

''وہی ہوا نا جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''شہزاد کا یہ پیغام آیا ہے کہ تم لوگوں کو کوئی ضرورت نہیں ہے میلہ کروانے کی، جب ہم چاہیں گے میلہ خود کروالیں گے۔''

''تو اس کا مطلب ہے اس کے دماغ میں کیڑا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ نیا نیا چوہدری بنا ہے اس لیے......'' جنید نے کہنا چاہا تو میں نے کہا۔

''اوہ! نہیں میرے بھائی، ایسا نہیں ہے۔ اس کے دماغ میں یہ کیڑا ڈالا گیا ہے۔ ورنہ جو سمجھ دار بندہ ہے، جس نے اس علاقے میں حالات دیکھے ہیں اور انہیں جانتا ہے، اب وہ ہمت نہیں کر سکتا، ایسی بات کہنے کی۔ ہر بندے کو پتہ ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر اس نے ایسا کہنے کی جرات کیوں کی؟''

''دیکھو ہمارا جو دشمن ہے نا، وہ نزدیک کی نہیں سوچتا، وہ سینده لگانے کے لیے گھر کا بھیدی تلاش کرتا ہے، جب اسے اپنے مطلب کا بندہ مل جاتا ہے تو اس پر سرمایہ کاری کرتا ہے۔ اسے اپنے معیار پر لاتا ہے اور پھر اپنوں کے خلاف لڑوا دیتا ہے۔''

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"تو آپ کا مطلب ہے کہ یہ شہزاد بھی؟" جنید نے حیرت سے کہا۔
"اُو میرے بھائی، بے غیرت لوگوں کا کیا ہوتا ہے۔ یہ سوچ ہی ہوتی ہے نا جو بندے کو غیرت مند بنا دے یا پھر بے غیرتانہ زندگی دے دے۔ نہایت خاموشی اور تحمل سے اس کی تفتیش کرو، میں دعوے سے کہتا ہوں، اس کے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی سازش نکلے گی۔" میں نے اعتماد سے کہا۔
"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" جنید شاید میرا امتحان لینے پر تلا ہوا تھا۔
"اصل میں بات یہ ہے میرے بھائی کہ اب مجھے ان دشمنوں سے لڑلڑ کے اندازہ ہو گیا ہے کہ کون کہاں سے بول رہا ہے۔ دوسرا اس لیے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ مجھے بندر، کتے اور ریچھ نچانا آ گیا ہے، انسان تو احسنِ تقویم سے پیدا کیا گیا ہے۔ جب تک یہ احسن تقویم پر رہتا ہے، اس وقت تک تو وہ اشرف المخلوق کے مقام پر فائز رہتا ہے، لیکن جیسے ہی اس مقام سے گرتا ہے، اسفل سافلین کی طرف جاتا ہے تو اس کی سوچ وہی بندر، کتے اور ریچھ والی ہوتی ہے، وہ جانور کے مقام پر ہوتا ہے، کئی منافقین تو سانپ جیسے ہوتے ہیں۔ وہ تو کتے کے مقام سے بھی گر جاتے ہیں۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"جانور تو سبھی ہوئے، پھر یہ کتا اور سانپ؟" جنید نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
"کتا جیسا بھی ہے، اس میں مالک سے وفاداری کی خُو رہتی ہے۔ وہ ایک جگہ سے کھا لے تو وہاں کا خیال رکھتا ہے۔ لیکن سانپ سے جتنا بھی اچھا سلوک کر لیا جائے، آخر اس نے ڈنگ مارنا ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کسی بندے کی بڑی عزت کرتے ہیں، اُسے مان دیتے ہیں، سب سے مقدم جانتے ہیں۔ اگر وہ انسان والی سوچ رکھتا ہے تو حیا کرے گا۔ اگر جانور کی سوچ پر آ جائے گا تو وہ کتے سے بھی بدتر ہوگا۔ اس کی خصلت سانپ جیسی ہوگی۔" میں نے کہا تو وہ ہنس دیا، پھر ہنستے ہوئے بولا۔
"مجھے تو لگتا ہے آپ سلوتری ہو گئے ہیں۔"
اس پر چوہدری اشفاق بھی کھل کر ہنس دیا۔ پھر ایک دم سے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔
"تو پھر کیا کرنا ہے شہزاد کا؟"
"کچھ بھی نہیں۔ وہ خود باؤلے کتے کی طرح ہم پر چڑھ دوڑے گا اور میں جانتا ہوں کس کتے کو کس طرح بھگانا ہے۔ تم اپنا کام کرو۔"
"چلو ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر چوہدری اشفاق مجھے اس دن کی روداد سنانے لگا، ہم رات گئے تک یہی باتیں کرتے رہے۔
وہ صبح بڑی روشن تھی۔ میں ناشتہ کر چکا تو دل چاہا کہ اپنے گاؤں جاؤں وہاں کے لوگوں سے ملوں۔ ان سے باتیں کروں۔ اپنے پرانے گھر میں جاؤں، میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اروند سنگھ میرے پاس آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔
"آپ کا فون کہاں ہے؟"
"میں نے جنید کو دیا تھا، اسی کے پاس ہوگا۔" میں نے اسے بتایا۔
"وہ بند جا رہا ہے۔ خیر میں آپ کو بتانا چاہ رہا ہوں کہ وہ زخم جو "ویرتا" نے میجر راٹھور کو لگایا ہے، اس پر وہ باؤلا ہو گیا ہے۔ اسے یہ پتہ چل چکا ہے کہ یہ سب "ویرتا" ہی نے کیا ہے۔" وہ سکون سے بولا۔
"وہ کیسے؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
"وہ ایسے کہ جو بندہ طارق نذیر نے پکڑا تھا، جس سے آپ نے یہاں سے پہلے پوچھ تاچھ کی تھی، اس

نے سب کچھ اُگل دیا۔ اس کی وجہ سے جتنے بھی بندے تھے اس سارے پراجیکٹ میں وہ بھی پکڑے گئے ہیں۔ ان تینوں نے انہی لوگوں کے پاس آنا تھا۔ یہیں سے اپنا ٹاسک پورا کرنے والے تھے۔ اسے سمجھ یہ نہیں آرہی ہے کہ ''ویرتا'' انہی کے ملک میں ہے یا پورے برصغیر میں۔ ان کا آپس میں کیا جوڑ ہے۔'' اس نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''اس نے ایک طویل ای میل کی ہے اپنے ڈیپارٹمنٹ کو۔ یہ ساری تفصیلات لکھ کر اس نے پوچھا ہے کہ کیا ہمارے خفیہ ادارے ناکام ہو چکے ہیں؟ وہ اب تک ''ویرتا'' کا سراغ نہیں لگا پائے ہیں۔'' وہ خوش ہوتا ہوا بولا تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا خیال ہے تمہارا، انہیں پتہ چل جائے گا، اس کا کتنا امکان ہے؟''

''چاہے تو آج ہی پتہ چل جائے یا پھر کئی مہینے لگ جائیں۔ میں نے ''ویرتا'' کی جو بنیاد رکھی ہے، وہ ساری کی ساری ہوا میں ہے۔ کسی کا بھی کیا دھرا اسی پر ڈالا جا سکتا ہے۔ یا پھر گمراہ کرنے کے لیے تردید بھی کی جا سکتی ہے۔ مطلب کوئی بھی کھیل کھیلا جا سکتا ہے۔ پکڑے جانے کا امکان بھی پیدا ہوگا، جب کوئی کمپیوٹر کی اس دنیا میں ہم سے بھی آگے جا رہا ہوگا اور اسے یہ سمجھ آ جائے کہ یہ سب ہیکنگ کا کمال ہے۔'' اس نے پھر مجھے اس کی تفصیل بتائی

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ''ویرتا'' ایک بلبلے کی مانند ہے، جب چاہے پھٹ جائے۔'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا تو وہ تیزی سے بولا۔

''ایسا تو ہے، لیکن اس وقت جب ہم اس پر توجہ نہ دیں گے تو، ورنہ اس کا پھیلاؤ بہت زیادہ کیا جا سکتا ہے۔ اصل میں جسپال سنگھ کا نیٹ ورک اسے حقیقت میں تبدیل کر رہا ہے۔ میں چاہوں تو اسے مستقل بنیادوں پر بھی بنا سکتا ہوں۔'' اس نے پرجوش لہجے میں کہا تو میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم اسی مستقل بنیادوں پر کام کرنے والا ''ویرتا'' ہی بناؤ۔ کہیں بھی اور کسی بھی جگہ اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔

''وہ بات تو رہ ہی گئی کہ کیا کرنا ہے میجر راٹھور کا، اس کے ساتھ کھیلوں یا چھوڑ دوں؟''

''جیسا تم چاہو۔ کب تک ہر کام پوچھ پوچھ کر کرتے رہیں گے اور ہاں نمس اور قمر کو کیسے پایا تم نے، کیسے لوگ ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''بہت غصہ ہے جی ان میں، انہیں بھارت میں ذلیل ہی بہت کیا گیا تھا۔ ویسے وہ حویلی میں تھوڑا مشکل محسوس کرتے ہیں۔'' اروند نے بتایا تو میں چونک گیا پھر پوچھا۔

''ایسا کیوں؟''

''اصل میں یہاں گھر کا ماحول ہے، ایسے میں کام ہونا، آزادانہ پھرنا وہ سب......'' وہ کہتے کہتے رُک گیا پھر بولا۔

''میں اس پر سوچ رہا تھا کہ کیوں نا ہم اپنی ایک لیب بنالیں۔ حویلی سے نکل کر ادھر شفٹ ہو جائیں۔ ہم اپنا ماحول بنالیں۔'' اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جیسا تم بہتر سمجھو، آجکل تو شادیاں ہو رہی ہیں، ان کی بھی کروا دو، یہ بچارے ایسے کیوں رہیں۔''

اس پر اروند ہنسنے لگا پھر بولا۔

''آپ کو مزے کی ایک بات بتاؤں، ان دونوں کی محبوبائیں بھی ہیں۔ ادھر آگرہ میں رہتی تھیں، آج کل

امریکا میں ہیں۔ یہ ان سے شادی کرنا چاہتے ہیں، ایک دن مجھے کہہ رہے تھے کہ اگر یہاں کچھ سکون ہوتا ہے تو وہ آپ سے اس سلسلہ میں بات کریں۔"

"اگر وہ جانا چاہتے ہیں تو ہم انہیں یہاں......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

"یہی تو بات ہے وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے ہیں تب ہی تو لیب کا کہہ رہا ہوں۔ وہ ان دونوں سے یہی کہہ رہے ہیں کہ اگر پاکستان میں آسکتی ہو تو ٹھیک ورنہ بائے بائے، وہ دونوں یہیں رہنا چاہتے ہیں۔"

"میں نے ان دونوں کے بارے میں سوچا ہے۔ وہ یہاں پر قانونی حیثیت اختیار کرلیں گے تو پھر ان کا سب کچھ بنا دیں گے۔ ہم نے کسی کو مجبوراً نہیں رکھنا، باقی تم جیسا چاہو، تم بھائی ہو، تمہیں بھی فیصلے کا اختیار ہے، میں کب تک؟" میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"بھائی آپ کے ساتھ ہی تو یہ ساری بہاریں ہیں۔ اتنا پیار ہمیں مل گیا۔"

"ٹھیک ہے ابھی چلو میرے ساتھ، گاؤں گھوم کے آتے ہیں، پھر آکر شمس قمر سے باتیں کریں گے۔" میں یہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا تو وہ بھی میرے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔

راستے میں اروند سنگھ نے بتایا کہ اُوگی پنڈ میں انوجیت سنگھ اور جسپال سنگھ کی شادی کے چرچے ہو رہے تھے۔ بانیتا کور نے سارا انتظام سنبھال لیا ہوا تھے۔ سندیپ کور بھی جالندھر سے آگئی تھی۔ اس کے ساتھ نوتن کور بھی آگئی۔ کلجیت کور نے سارے انتظامات بلبیر سنگھ پنچ کے سپرد کر دیئے تھے۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ جسپال کی شادی ہو اس کی سیکورٹی نہ ہو۔ ایک ان دیکھا حصار اوگی پنڈ میں بن چکا تھا۔ ساری شاپنگ ہو چکی تھی۔ دو دن بعد ان کی شادی ہونا طے پا چکی تھی۔ اس کا رابطہ تھا۔ یہ سب سن کر میں بڑی دیر تک مسکراتا رہا۔

اس وقت میں نور نگر گاؤں میں اپنے پرانے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ چوہدری اشفاق بھی آ گیا ہوا تھا۔ بہت عرصے بعد مجھے گاؤں کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ میری آمد کا سن کر بھیدہ بھی آ گیا تھا۔ اماں نے اسے زمین دلا دی تھی اور اب وہ ڈیرے پر چارا ڈالنے والا ملازم نہیں رہا تھا، اچھا بھلا کاشت کار تھا۔ بندہ خوشحال ہو تو اس کے طور طریقے ہی بدل جاتے ہیں۔ وہاں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے کہ گاؤں ہی کے ایک بندے نے بتایا۔

"وہ چوہدری شہزاد کل سے علاقے کے معتبر لوگوں کے پاس جا رہا ہے۔ لیکن وہ وہاں جا کر میلہ روکنے کی بات نہیں کر رہا ہے، وہ اپنی ہی کہانی سنا رہا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ یہ جو مسافر شاہ کے تھڑے کے ساتھ زمین پڑی ہے۔ اتنی ساری زمین، جس پر کبھی کسی نے دعویٰ نہیں کیا۔ یہ علاقے کے لوگوں کے کام آنی چاہئے۔ جمال یہ میلے کا ڈھونگ رچا کر اس زمین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے پہلے ہی وہاں پہلوانوں کی صورت میں بدمعاش بٹھا رکھے ہیں۔ یہ ایک طرح سے قبضہ ہی ہے۔"

"کیا یہ بات تو ٹھیک کہہ رہا ہے؟ میرا مطلب ہے وہ ایسا ہی کہہ رہا ہے۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"بالکل، ایسے ہی کہہ رہا ہے۔ بلکہ میں سچ بتاؤں تو مجھے لالے اکبر علی نے کہا بھی تھا کہ ہم ان معتبر لوگوں کے پاس جائیں اور چوہدری شہزاد کا کوئی حل نکالیں، اسے کیا پتہ کہ جمال ہمارے لیے کیا کچھ نہیں کر رہا ہے۔"

"اوئے، ہمیں اس مقصد کے لیے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس علاقے کے

لیے کیا کچھ کیا اور کیا کرنا چاہتا ہوں، یہ تو میں اور میرا ربّ جانتا ہے۔ باقی رہی مسافر شاہ کے تھڑے پر میلے کی بات تو وہاں میلہ لگے گا۔'' میں نے بڑے سکون سے کہا۔

''ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔'' اس نے کہا تو بات آئی گئی ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ بات عوام میں آگئی ہے۔ انہیں کچھ کہنے کا حوصلہ مل گیا ہے۔ میں وہاں دوپہر تک رہا، پھر حویلی واپس پلٹ گیا۔

شام تک مجھے مختلف ذرائع سے یہ خبر مل گئی کہ چوہدری شہزاد کیا کچھ کر رہا ہے۔ وہ لوگوں کو یہی تاثر دے رہا تھا کہ میں مسافر شاہ کے تھڑے کی زمین پر قابض ہونا چاہتا ہوں۔ وہ علاقے کے لوگوں کو ساتھ ملانا چاہتا تھا کہ مجھے اس ''حرکت'' سے روکا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک پنچائت بلائی جائے اور اس میں مجھے اس سے روکا جائے۔

اگلے دن کی صبح میں حویلی ہی میں تھا کہ علاقے کے ایک بڑے معتبر بزرگ سردار فیاض نے مجھے فون کیا۔ وہ مجھے اپنے ہاں بلانا چاہتے تھے۔ وہ کوئی بڑے زمیندار نہیں تھے۔ لیکن اپنی شرافت کی وجہ سے پورے علاقے میں ان کی عزت تھی۔ انہوں نے مجھے بتا دیا کہ علاقے کے دوسرے لوگ بھی وہیں ان کے پاس آنے والے ہیں۔ میں ان کے پاس جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

میرے ساتھ جنید اور چوہدری اشفاق ہی تھے۔ وہاں سردار فیاض کے ڈیرے پر پورے علاقے کے معززین جمع تھے۔ ان میں ایم این اے سلیم خان بھی تھا۔ میرے پہنچتے ہی بات شروع ہوگئی۔

''بیٹا جمال! ہم میں سے بہت سارے لوگوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ تم مسافر شاہ کے تھڑے پر میلہ کروا رہے ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک پرانی روایت ہے اور پتہ نہیں کب سے چل رہی ہے۔ لیکن ہمارے دوست دین محمد کے بیٹے چوہدری شہزاد کو تحفظات ہیں کہ تم وہاں کی زمین کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتے ہو۔ کیا ایسا ہے؟'' سردار فیاض نے بڑے تحمل سے بات کا آغاز کیا تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا اور اسی تحمل سے بولا۔

''آپ میرے بزرگ ہیں اور سارے لوگ میرے لیے انتہائی محترم ہیں۔ میں مسافر شاہ کے تھڑے کی زمین پر قطعاً قبضہ نہیں کرنا چاہتا۔''

میرے یوں کہنے پر سردار فیاض نے چوہدری شہزاد کی طرف دیکھ کر کہا۔

''لیکن اس کے پاس کیا جواب ہے کہ وہاں اس نے پہلوان بٹھا رکھے ہیں۔ وہاں کمرے تعمیر کرتا چلا جا رہا ہے۔ وہاں لے جا کر لوگوں کا مارتا پیٹتا ہے۔''

''ہاں میں نے ایسا کیا اور مزید بھی کرتا رہوں گا۔ اس نے آدھی بات بتائی ہے کہ کمرے کیوں تعمیر کیے، وہاں پر آنے جانے والے لوگوں کی خدمت کے لیے، وہاں لوگ بھی اسی مقصد کے لیے بیٹھے ہیں۔ رہا مار پیٹ کا سوال تو میں یہ صاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ جو بھی اس علاقے میں غلط کام کرے گا، چاہے وہ چوہدری شہزاد بھی ہو، میں اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کروں گا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ ان لوگوں کو کیوں پیٹا گیا؟''

''ہاں بتاؤ بھئی؟'' سردار فیاض نے کہا تو وہ تنک کر بولا۔

''یہ غنڈہ گردی کا صاف اعتراف کر رہا ہے، اب بھی مجھ سے پوچھتے ہیں۔''

اس پر ایم این اے سلیم خان بولا۔

''میں اس ساری صورت حال کو جانتا ہوں۔ میرے ہاں سے ہی دو بندے پکڑے گئے تھے جو

جمال کو قتل کرنے آئے تھے۔ یہ بہر حال لمبی کہانی ہے، مجھے لگتا ہے کہ چوہدری شہزاد خواہ مخواہ کی مخالفت کر رہا ہے۔''

''نہیں میں خواہ مخواہ کی بات نہیں کر رہا ہوں، مجھے پتہ کہ یہ ایسا کر رہا ہے، یہی کیوں میلہ کروا رہا ہے، پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ سب علاقے کے لوگ مل کر میلہ لگاتے تھے۔'' اس نے زور دار انداز میں کہا تو میں نے انتہائی تحمل سے جواب دیا۔

''اس لیے کہ میں اکیلا اس پر خرچ کر سکتا ہوں اور اس سارے انتظام کو سنبھال بھی سکتا ہوں۔ میں نے وہاں کی خدمت کا ذمہ لیا، آپ لے لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''میں اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہوں۔'' چوہدری شہزاد تیزی سے بولا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں سوا ایکڑ زمین دیتا ہوں، چوہدری اس پر غریب لوگوں کو گھر بنا دے، اسکول اور اسپتال بنوا دے۔ یہاں کے لوگوں کے روزگار کے لیے کوئی فیکٹری لگوا دے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر خدمت کرنی ہے تو کریں۔''

''یہ کیا بات ہوئی، میں تمہاری زمین پر......''

''میری نہیں عوام کے نام، ان غریب لوگوں کے لیے میں ان لوگوں کو دے دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''میں تو ایسا نہیں کر سکتا۔'' اس نے جواب دیا۔

''دیکھو حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک کی زمین اتنی ہی ہے۔ اتنے لوگ آ کر چلے گئے۔ سب ہی کا دعویٰ تھا کہ یہ زمین ہماری ہے۔ لیکن سیانے کہتے ہیں کہ یہ زمین ہر چالیس سال بعد اپنا مالک بدل لیتی ہے۔ جو چیز میری نہیں، میں اسے رکھ کر کیا کروں گا۔ اسے لوگوں کے کام آنا چاہئے۔ یہ میرا خیال ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ میں زمین پر قبضہ کرنے جا رہا ہوں تو میں نے آج سے مسافر شاہ کے تھڑے کے ساتھ والی زمین کو لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کیا، اب جس کی ہمت ہے وہ مجھے روک کے دکھائے۔'' میں نے کہا اور سب کی جانب دیکھا وہ بھی ایک دم سے ہکا بکا رہ گئے۔ کوئی نہیں بولا تو میں نے کہا۔

''اب اس علاقے میں اسکول، اسپتال اور غریبوں کے گھر بنیں گے۔ ان کے روزگار کا بندوبست ہوگا۔ آؤ، جتنا میں کرتا ہوں، اتنا کوئی دوسرا کرے۔ ہے کوئی؟''

میرے یوں کہنے پر کوئی نہیں بولا۔ کوئی بھی اپنی زمین سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ان میں سے چند ایسے تھے جو جاگیردارانہ سوچ رکھنے والے تھے۔ وہ تو یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں کو اس قدر سہولت مل جائے۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو سلیم خان بولا۔

''جمال! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھ سے جتنا ہو سکا، میں اب عوام کے لیے کروں گا، جو بھی مخالفت کرے گا، میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔''

''میں آپ سب سے درخواست کروں گا، جس طرح آج تک میلے کے لیے اکٹھے ہوتے آئے ہیں، اسی طرح لوگوں کی خدمت کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔ ہمارے ساتھ رہنے والے لوگوں کا کیا قصور ہے کہ وہ ساری زندگی سسکتے رہیں۔ زمین اللہ کی وسائل اللہ کے، ہم قبضہ جما کر بیٹھنے والے کون ہیں۔ آؤ اللہ کے بندوں کی خدمت کریں۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں پتر۔'' سردار فیاض نے کہا تو چوہدری شہزاد غصے میں اٹھ کر چل دیا۔ اب وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

❋ ❋ ❋

اس دن اوگی پنڈ پر بہار ہی کچھ دوسری طرح کی تھی۔ انوجیت سنگھ چونکہ اسمبلی کا ممبر تھا۔ اس لیے اس

کی شادی پر کئی سارے ممبر آنے والے تھے۔ اوگی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ نکودر اور جالندھر کی ساری انتظامیہ وہاں موجود تھی۔ جگتار سنگھ اور اس سے تعلق رکھنے والے بھی لوگ ایک دن پہلے ہی جالندھر میں آ موجود ہوا تھا۔ بھوپندر سنگھ برار نے اپنے گاؤں میں بڑے پیمانے پر انتظام کیا ہوا تھا۔ گرلین کور کے ساتھ آنجہانی پروفیسر دیویندر سنگھ کے سارے لوگ آ چکے تھے۔ انوجیت سنگھ کی بارات بڑی شان سے بھوپندر سنگھ برار کے گاؤں پہنچی۔ وہ سیدھے ہی گرودوارے گئے تھے۔ ان کے پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی دلہن کو لے آیا گیا۔ ارداس اور پھیروں میں انہیں دو گھنٹے لگ گئے۔ وہیں سے بارات بھوپندر سنگھ کی حویلی میں آئی، وہاں کھانے کا انتظام تھا۔ دوپہر ہوتے ہی وہ واپسی کے لیے چل پڑے۔ ایسا عموماً ہوتا نہیں تھا لیکن اسی دن جسپال سنگھ اور ہرپریت کی شادی اوگی پنڈ کے گرودوارے میں تھی۔ وہ بھی سیدھے وہیں پہنچے۔ جسپال سنگھ اور ہرپریت کور دونوں گرودوارے جا پہنچے۔ سہ پہر تک ان کی شادی ہو گئی۔ وہیں سے مہمان واپس جانے لگے۔ جس وقت وہ گھر پہنچے وہ بس وہی لوگ تھے، جو ایک طرح سے گھر کے افراد تھے۔ جسپال سنگھ کی بھی شادی ہو گئی۔ اسی شام اس کے ٹریول ایجنٹ نے بتایا کہ ٹھیک تین دن بعد آپ لوگ ننکانہ صاحب روانہ ہو سکتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

میلے کے سارے انتظامات ہو چکے تھے۔ دو دن کے بعد میلہ تھا۔ اس دن میں نے علاقے کے معززین کو حویلی میں دعوت دی تھی کہ انہیں میلے کے بارے میں تفصیل بتا دوں۔ میں اس موقعہ پر اہم اعلان بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے چوہدری شہزاد کو بھی خصوصی دعوت دی تھی۔ دوپہر سے ذرا پہلے بلائے گئے بھی مہمان آ گئے۔ بھی باتوں میں مصروف تھے کہ سردار فیاض نے کہا۔

”یار جمال باتیں تو ہوتی رہیں گی، پہلے وہ بات کر لیں، جس کے لیے ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔“

اس پر وہاں موجود سب لوگ متوجہ ہو گئے تو میں نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”یہ میلہ نجانے کب سے لگتا چلا آ رہا ہے۔ مسافر شاہ بھی یہاں آئے تھے یا نہیں اس بارے بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ یہاں کوئی بزرگ آئے تھے۔ سو ہم مان لیتے ہیں۔ میلے کا اصل مقصد تو یہی ہے کہ ہم اپنے علاقے کے لوگوں کو تفریح فراہم کریں، اپنے شہہ زوروں کے بارے میں جانیں۔ ہمارے پاس کیسے کیسے لوگ ہیں، ان کے بارے میں جانیں۔ وہ لوگ جو سارا سال کمائی کی آس لگا کر بیٹھے رہتے ہیں، وہ کچھ کھا کما لیں۔ میں اگر کچھ بھول رہا ہوں تو وہ آپ بتا دیں۔“

”نہیں تم اپنی بات جاری رکھو، ہم بات کر لیں گے۔“ سردار فیاض نے کہا۔

”دیکھیں، میں بھی اسی علاقے سے ہوں، آپ سب میں سے ہوں۔ آپ مجھے جانتے ہیں، میں نے بھی غربت دیکھی ہے۔ مجھے ان لوگوں کا احساس ہے جو آج بھی میری طرح غربت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ میں ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے جو یہ زمین حاصل کی ہے میری نہیں، میری بیوی کی ہے۔ جس میں سے اسی نے سوا ایکڑ زمین وقف کر دی ہے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے مسافر شاہ کی زمین سے کوئی غرض نہیں۔ نا کسی دوسری زمین سے۔ کوئی اگر میرے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہے تو بسم اللہ، نہیں تو اُسے تنقید، سازش یا منفی پراہ پیگنڈا کرنے کی میں بالکل بھی اجازت نہیں دوں گا۔“

''یہ تو تمہاری اپنی بات ہے ہم تو میلے کی بات کرنے یہاں آئے ہیں۔'' سردار فیاض نے کہا۔

''میں اسی طرف آ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں ایک لحہ کو رکا اور پھر کہتا چلا گیا،''اس میلے میں جو بھی مقابلے ہوں گے، ان کے منصف آپ ہیں۔ جس بھی علاقے کا جو مقابلہ ہو گا، اسے جیتنے والے کو جو انعام ملے گا وہ میں دوں گا۔ وہ انعام ہو گا، اس گاؤں میں اسکول، اسپتال، ڈسپنسری یا کسی بھی شے کی فیکٹری۔ اب یہ آپ پر ہے کہ کس مقابلے کا کیا انعام رکھتے ہیں۔ ہر شہہ زور کو اس کے علاوہ نقد انعام بھی میں ہی دوں گا۔''

''یہ تو بہت بڑی بات کہی تم نے، اتنا کر لو گے؟'' سردار فیاض نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''میں کر لوں گا آپ سنبھالنے والے بنیں، مجھے یہ ڈر ہے کہ آپ لوگوں انہیں چلا نہ پائیں۔''

''ممکن ہے، ایسا ہو، پھر تمہارا کیا تو ضائع گیا۔'' ایک معزز نے کہا۔

''میں سوا ایکڑ اسی لیے وقف کر رہا ہوں۔ اس پر کاروبار ہو گا، یہاں کے لوگوں کو روزگار ملے گا، وہ خوشحال ہوں گے۔ مجھے صرف ایک ڈر ہے؟'' میں نے کہا تو سب نے میری جانب دیکھا

''وہ کیا؟'' دوسرے معزز نے پوچھا۔

''یہاں کے زمینداروں اور جاگیرداروں سے۔ جاگیرداری زمین کے ساتھ منسوب نہیں، یہ ایک سوچ کا نام ہے۔ دوسرے کو کمتر خیال کرنا۔ میں اس کے سخت خلاف ہوں۔ آپ اپنے لیے جو چاہئیں کریں۔ لیکن کسی کو دکھ دے کر نہیں اور نہ ہی کسی سے چھین کر اپنا بنائیں۔ میں نے بس یہی کہنا ہے، اب آپ جو بھی اور جیسا بھی انتظام کریں، میرے ذمے جو خدمت لگائیں میں تیار ہوں۔''

''اور اگر اس سارے کام میں کسی نے مداخلت کی تو......'' سردار فیاض نے کہا۔

''میں اسے ایسا کرنے نہیں دوں گا، جس طرح روک سکا، اسے روکوں گا۔'' میں گمبھیر لہجے میں کہا تو سردار فیاض انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

''تو پھر سنو میں اور میری نسل تیرے ساتھ ہے۔ میں اپنی نسل کو وصیت کر دوں گا کہ وہ تیری تابع رہے۔ تم سے پہلے ہم اس کا سر کچل دیں گے۔''

اس کے یوں کہنے پر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پھر سردار فیاض نے ہی میلے کے انتظامات کی بات چھیڑ دی۔

دوپہر تک سارے معاملات طے پا گئے۔ وہ سب کھانا کھا کر چلے گئے۔ اس دن چوہدری شہزاد نے کسی قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ امن رہے۔

سہ پہر کے وقت میں اور سوہنی لان میں بیٹھے ہوئے چائے پی چکے تھے۔ اماں اپنے کمرے میں تھی۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جسپال سنگھ کی اروند سنگھ اور فہیم سے بات ہوئی ہے۔ وہ ابھی کچھ دیر بعد کسی وقت واہگہ سے پاکستان آ جائیں گے۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ پہلے جنم استھان جائیں گے، اس کے بعد پنجہ صاحب سے ہو کر ہی لاہور واپس آئیں گے۔ پھر جو بھی پروگرام بنا۔

میں نے لاہور میں سرمد کو فون کیا۔ وہ اس وقت واہگہ پر ہی کھڑا تھا۔

''ابھی تک پہنچے نہیں ہیں، ویسے دوسری طرف آ گئے ہیں۔''

''کوئی پرابلم تو نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، کوئی نہیں، ابھی تک تو کوئی نہیں۔'' اس

نے تیزی سے جواب دیا۔
''پروگرام بتایا انہوں نے؟'' میں نے پوچھا۔
''جی، یہاں سے سیدھے ننکانہ صاحب جائیں گے، وہیں سے حسن ابدال، مطلب کل شام تک ہم واپس لاہور آسکیں گے۔''
''چلو مجھے بتاتے رہنا۔'' میں نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ میں اور سوہنی اسی موضوع پر باتیں کر رہے تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ دوسری جانب صفدر اسماعیل تھا۔ کچھ تمہیدی باتوں کے بعد اس نے بتایا۔
''آپ کے ہاں جو میلہ لگنے جا رہا ہے، اس کے بارے میں اعلیٰ سطح پر بات ہو رہی ہے۔''
''وہ کیوں بھائی؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''اصل میں یہاں سے جو بھی خفیہ رپورٹس آئی ہیں اور ادھر اُدھر سے جو پتہ چلا ہے۔ آپ کو اندرونی طور پر بھی خطرہ ہے اور بیرونی عناصر بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''
''اگر اس کی وضاحت کر دو تو ممکن ہے میں ان خطرات پر قابو پالوں۔'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''دراصل باہر کئی طرف سے یہ عندیہ مل رہا ہے کہ وہ یہاں کوئی نہ کوئی ہنگامہ تو کریں گے۔ وہ لوگ جو آپ کے ہاتھوں برباد ہو گئے ہیں، وہ کہاں سکون سے بیٹھیں گے۔'' اس نے بتایا۔
''یہ کوئی نئی بات نہیں، ایک بار ایسا ہی میلہ تھا اور مجھے یہاں سے اٹھا لیا گیا تھا۔ میں اس کا خیال رکھوں گا۔ یہ میرے ذہن میں ہے۔'' میں نے کہا۔
''آپ کے اسی علاقے میں کچھ لوگوں نے اپنے لوگ بنا لیے ہیں، وہی یہ چاہیں گے کہ آپ کو نقصان پہنچایا جائے، زیادہ ضرورت یہیں کے لوگوں پر نگاہ رکھنے کی ہے۔'' اس نے صلاح دی تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔
''یہاں کی چھان پھٹک کر کے بتاؤ کہ کون لوگ ہیں، میں انہیں دیکھ لوں گا۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔
''مجھے اطلاع یہ ہے کہ آج رات ہی کچھ لوگ یہاں آپ کے علاقے میں آنے والے ہیں، وہ جہاں بھی جائیں گے، وہی آپ کا ٹارگٹ ہو گا۔'' اس نے وضاحت نہیں کی پوری بات بتا دی۔ میں سمجھ گیا اس لیے میں نے کہا۔
''اس بارے کوئی بھی نئی اطلاع ملے مجھے دینا، باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔''
چند باتوں کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا یہاں کا نیٹ ورک اتنا ہی کمزور ہے کہ یہ اطلاع مجھے باہر سے مل رہی ہے۔ میں نے اسی وقت چوہدری اشفاق کو بلا لیا۔ سوہنی نے نہیں پوچھا کہ بات کیا ہے وہ سمجھ چکی تھی کہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔
مغرب تک چوہدری اشفاق میرے پاس نہیں آ سکا۔ اس لیے مجھے پریشانی ہونے لگی۔ میں نے دوبارہ فون کیا تو وہ حویلی آ چکا تھا۔ لاؤنج تک آتے اسے کچھ وقت لگ گیا۔ تب وہ میرے پاس صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔
''یہاں سیکورٹی کے بہت سارے معاملات ایسے تھے، جنہیں دیکھتے ہوئے ......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔
''آج رات یا کل کسی وقت یہاں اس علاقے میں کچھ بندے آنے والے ہیں، تم ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''
اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں نے اس کی چوری پکڑ لی ہو پھر وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا۔
''کس نے بتایا تمہیں؟''
''میں نے جو پوچھا ہے؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا تو اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتہ ہے اور میں نے بندے بھی لگا دیئے ہوئے ہیں۔ تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ تم خواہ مخواہ پریشان ہو جاؤ گے۔ میں جب دیکھ رہا ہوں سب کچھ تو تم......"

"نہیں۔ وہ سب ٹھیک ہے لیکن مجھے بتاؤ، تاکہ میرے علم میں رہے۔" یہ کہہ کر میں رکا اور پھر پوچھا۔

"پتہ چلا کس کے پاس آنے والے ہیں؟"

"دو تین جگہیں ہیں ایسی، وہاں پر میری پوری نگاہ ہے، جیسے ہی انہوں اس طرف منہ کیا، وہ میرے پاس ہوں گے، فکر کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں۔" میں نے کہا اور اسے آج معززین سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتانے لگا۔ یہاں تک کہ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا۔

کھانے کے بعد میں حویلی کی چھت پر چلا گیا۔ میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسے ماحول میں اپنے ہی علاقے کے کسی بندے پر چڑھائی ہو جائے۔ وہ لاکھ غلط سہی لیکن تھا تو میرے علاقے کا۔ میں ان دنوں میں کسی بھی نزاعی کیفیت سے بچنا چاہ رہا تھا۔ میں ایسا ہی کچھ سوچ رہا تھا کہ میرے اندر سے آواز آئی، یہ تو ایسا کب سے ہو گیا۔ جو تیرا دشمن ہے تو بس دشمن ہے۔ سانپ پالنا بے وقوفی ہے۔ جو بھی سانپ پالتا ہے، انہی سانپوں سے ڈسا جاتا ہے۔ یا تو بندہ انسان ہوتا ہے یا پھر منافق ہوتا ہے۔ منافق کسی طرح کی ہمدردی کے لائق نہیں ہے۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ مجھے چوہدری اشفاق کا فون ملا۔ اسے اطلاع ملی تھی کہ چند مشکوک لوگ نور نگر سے سے قریب ہی ایک گاؤں عزیز آباد میں آ گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں نے اس سے کہا۔

"میں آ رہا ہوں۔"

دلچسپ اور عجیب

انوکھا موسیقار۔ لندن کا موسیقار جان اسمتھ اپنی ٹھوڑی کو ڈھول کی طرح پیٹ کر برطانیہ کے تمام ہر دلعزیز گانوں کے سر نکال سکتا تھا۔

عجیب مینڈک۔ آسٹریلیا میں بلی جتنے بڑے مینڈک پائے جاتے ہیں جو کہ اٹھارہ فٹ لمبی چھلانگ لگاتے ہیں۔

شیشے کا آدمی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں چین میں ایک آدمی کا جسم اس قدر شفاف تھا کہ اس کے تمام اندرونی اعضا بخوبی نظر آتے تھے۔

دو دماغ والا بندر۔ امریکہ میں آج بھی ایسے بندر پائے جاتے ہیں جو دو دماغ رکھتے ہیں۔ ایک دماغ ان کے جسم کو اور دوسرا ان کی دم کو کنٹرول کرتا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا چمگادڑ۔ فروٹ بیٹ دنیا کا سب سے بڑا چمگادڑ ہے۔ یہ ملائیشیا میں پایا جاتا ہے اور اس کی لمبائی پانچ فٹ ہوتی ہے۔

شبانہ صابر ...... جتوئی

"میں اسی لیے تمہیں نہیں بتا رہا تھا۔" اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب مجھ سے رہا نہیں جائے گا۔" میں نے کہا۔

"چلو تم اپنی ضد پوری کر لو۔ میں نہیں جاتا کہیں۔ مجھے پتہ ہے تم میری تو مانو گے نہیں۔" اس نے غصے میں کہا تو میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے نہیں آتا، لیکن جب بندے پکڑ لو تو مجھے بتا دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ میرے یوں پوچھنے پر وہ برا محسوس کر رہا تھا۔ رات کا دوسرا پہر تھا۔ میں اس وقت چھت پر ہی

تھا۔تبھی مجھے چوہدری اشفاق کا فون آیا کہ اس نے وہ تین بندے پکڑ لیے ہیں۔تبھی میں نے تیزی سے پوچھا۔
''کون ہیں اور کس کے پاس آئے تھے؟''
''ابھی تک وہ مان نہیں رہے ہیں کہ وہ کون ہیں، لیکن وہ جس بندے کے پاس آئے ہیں، وہ کوئی اور نہیں چوہدری شہزاد ہی ہے۔''
''مجھے پہلے ہی سے یہی شک تھا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔
''اس نے عقل مندی یہ کی ہے کہ انہیں اپنے پاس نہیں، بلکہ اپنے کزن کے ڈیرے پر بلایا ہے۔اس کے کزن کو صرف اتنا پتہ ہے کہ یہ اشتہاری ہیں اور پناہ لینے آئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔
''اس وقت کہاں ہیں؟''
''اسی کے ڈیرے پر، شہزاد کا کزن کہہ رہا ہے کہ اگر یہ غلط بندے ہوئے تو میں خود انہیں گولی ماروں گا۔وہ......''
''وہ تمہیں دھوکا دے رہے ہیں اشفاق۔خیر، دیکھتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں، تم اس کے کزن کی بات مان لو۔'' میں نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔میں نے سوچ لیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔

❁......❁......❁

وہ میلے کا پہلا دن تھا۔میں صبح ہی سے مسافر شاہ کے تھڑے پر کئی چکر لگا چکا تھا۔میں بار بار اس لیے باہر جا رہا تھا کہ جو کوئی بھی مجھے نقصان پہنچانے کے لیے یہاں آ چکے ہیں۔مجھ پر حملہ آور ہوں، ان کا پتہ چلے۔لیکن ابھی تک کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔میں چوہدری شہزاد کو اس وقت تک ڈھیل دینا چاہ رہا تھا، جب تک وہ خود حملہ کے لیے سامنے نہیں آ جاتا تھا۔
جس طرح میلے کی پرانی روایت تھی۔دو دن پہلے ہی سے لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔خیمے لگ گئے تھے۔دکانیں سج گئی تھیں۔دور و نزدیک سے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والے فنکار جمع ہو چکے تھے۔تھیٹر، موت کا کنواں، بازی گر، نٹ باز، بہروپیے، جادوگری اور شعبدہ بازی کے کمالات دکھانے والے سنیاسی، حکیم، پتھر بیچنے والے، عورتوں کے ہار سنگھار اور بچوں کے کھلونے فروخت کرنے والے اور نجانے کون کون سے حلوائی آ چکے تھے۔ہر کوئی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے اور داد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اچھی خاصی رقم کمانے کے لیے بے تاب تھا۔سردار فیاض اس میلے کی نگرانی کر رہا تھا۔سہ پہر کا وقت ہو چکا تھا۔کئی مقابلے ہو چکے تھے۔
اس وقت کشتی کا مقابلہ تھا۔آج جو پہلوان جیت جاتے ان کا کل مقابلہ ہونا تھا اور پرسوں شام ان کا فائنل ہوتا جس میں ایک پہلوان وہ میلہ جیت جاتا۔میں وہ مقابلہ دیکھنے کے لیے نکلنے لگا تھا کہ حویلی کے گیٹ سے کئی کاریں اندر آ گئیں۔پورچ میں رکتے ہی پہلی کار سے سرمد نکلا۔میں نے اپنے پیچھے دیکھا تو اماں سمیت سبھی لوگ بڑے دروازے پر آ چکے تھے۔میں سمجھ گیا اور ایک طرف ہو گیا۔
اسی سرمد کی کار سے پہلے جسپال سنگھ اترا، اس کے ساتھ ہرپریت کور باہر آئی۔پچھلی کار سے کلجیت کور، انوجیت اور اس کی بیوی سمرن کور باہر آ گئی۔ہرپریت سیدھی میرے پاس آئی میرے پاؤں چھوئے۔اور میرے گلے لگ کر بے تحاشا رو دی۔تب میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔
''پاگل! کیوں روتی ہے تو اپنے بھائی کے گھر آئی ہے۔تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔''
''نہیں یہ ساس کے گھر آئی ہے، اس لیے رو رہی ہے۔'' اماں نے کہا تو ایک دم سبھی ہنس دیئے۔تیسری

کار سے بانیتا کور اور تانی نکلی۔ چوتھی کار میں سے گیت، زویا، علی نواز، سلمان برآمد ہوئے۔ ایک دم سے حویلی میں گویا میلہ لگ گیا۔ میں ان سب کو دیکھ کر ایک دم سے خوش ہو گیا۔

سوہنی نے پنجابی روایت کے مطابق پہلے دروازے پر تیل گرایا۔ پھر باری باری وہ سب سے ملنے لگیں۔ کچھ دیر بعد لاؤنج میں سماں بندھ گیا۔ کلجیت کور اماں کے ساتھ بیٹھی حیران تھی کہ نور نگر اس کی سوچ سے بڑھ کر تھا۔ سب سے زیادہ حیرت تانی پر تھی کہ اس نے اپنے آنے کے بارے میں خبر نہیں دی۔ وہ اماں کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔

''مجھے تو ان سب کی آمد کے بارے میں پتہ تھا۔ پتر اروند اور فہیم مجھے بتاتے رہے ہیں وہ سب ان کے ساتھ رابطے میں تھے۔'' اماں نے گویا انکشاف کیا۔

ان سب سے باتیں کرتے ہوئے مجھے وہیں پر شام ہو گئی۔ یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا۔ میں اور جسپال سنگھ باہر لان میں آ گئے۔ اسے سب باتوں کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان تین لوگوں کے بارے میں تو پتہ ہے، مزید کے بارے میں ابھی کھوج نہیں لگا تھا۔ ممکن تھا ہوں، ممکن ہے نہ ہوں۔ چوہدری اشفاق نے مجھے بتا دیا کہ کشتی کا مقابلہ کس کس نے جیتا ہے۔ ان جیتنے والوں میں فرید بھی تھا۔

❁ .... ❁ .... ❁

وہ میلے کا آخری دن تھا۔ سارے مقابلے ہو چکے تھے۔ صرف ایک کشتی کا مقابلہ رہ گیا تھا۔ وہ فرید اور علاقے کے نامی گرامی پہلوان ''دونا'' کے درمیان تھا۔ سارے علاقے میں خبر پھیل چکی تھی۔ علاقے کے عوام اس کانٹے کے مقابلے کو دیکھنے کے بڑی تعداد میں جمع تھے۔ ایک طرف میں یہ مقابلہ دیکھنا چاہتا تھا اور دوسری طرف یہی وہ لمحات تھے، جس میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

بظاہر پورے میلے پر کنٹرول تھا، ہر جگہ لوگ تھے۔ بہت زیادہ خفیہ والے بھی، وجود تھے۔ افضل رندھاوا پوری طرح مستعد تھا۔ بقول اس کے کوئی چڑیا بھی نہیں پھڑک سکتی تھی لیکن نجانے کیوں میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ ایسا کچھ جس سے شاید میں نہ رہوں۔

فرید میدان میں اُتر آیا تھا۔ اس کے سامنے والا دونا پہلوان اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ گرانڈیل اور اس سے زیادہ پھرتیلا۔ لوگوں کو چپ لگ گئی تھی۔ میں سردار فیاض کے ساتھ شامیانے کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی سے ان دونوں پہلوانوں کے بدن چمک رہے تھے۔ کشتی کے منصف نے دونوں کو اکھاڑے میں اتارا اور خود باہر نکل آیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر جھپٹے۔ دونا نے پڑتے ہی داؤ مارا، جسے کمال مہارت سے فرید بچا گیا۔ اس نے فرید کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں وہ طریقہ سوچ لیا تھا کہ کس طرح فرید کو پچھاڑنا ہے۔ تقریباً دو منٹ تک وہ ایک دوسرے پر داؤ آزماتے رہے۔ جم غفیر پر یوں خاموشی طاری تھی، جیسے یہاں کوئی بھی نہ ہو۔ ایسے میں میرا فون بج اٹھا۔ وہ فون چوہدری اشفاق کا تھا۔

''ہاں بولو۔''

''تمہارے بالکل دائیں جانب دو بندے کھڑے ہیں نا سیاہ لباس والے؟''

''ہاں میں نے دیکھا ہے، ان کو۔''

''یہ وہی ہیں، ان کے پاس پسٹل بھی ہیں، یہ وار کریں گے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''انہیں پکڑا......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

''وہ میں سنبھال لوں گا، بس تمہیں محتاط کرنا تھا۔''

میں پوری طرح مستعد ہو گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ انہوں نے حملہ کس وقت کرنا ہے۔ میں اب فرید کی

کشتی کی جانب متوجہ نہیں تھا بلکہ وہ لوگ میری نگاہوں میں تھے۔ میں نے اپنے پسٹل کو ٹٹولا اور پوری طرح تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ میں اپنا دفاع تو بخوبی کر سکتا تھا لیکن اگر ان کے فائر سے میرے ساتھ بیٹھے کسی بندے کا نقصان ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ فرید اکھاڑے میں زور آزمائی کر رہا تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر درویش فرید پر پوری توجہ لگائے بیٹھا تھا۔

اچانک فرید نے دونا پہلوان کے دائیں پیر کو پکڑا، اس کے بائیں گھٹنے پر اپنے گھٹنے کا دباؤ بڑھایا، ہاتھ سے اس کی گردن کو جھٹکا دیا، دونا لڑکھڑا گیا، یہی وہ لمحہ تھا جب فرید نے اسے باہوں پر سنبھالا اور زور سے زمین پر دے مارا۔ اس سے آگے میں نہیں دیکھ سکا۔ میری نگاہ ان دونوں پر گئی، وہ انتہائی سرعت سے اپنے اپنے پسٹل نکال چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتے، ان کے پیچھے کھڑے لوگوں نے انہیں دبوچ لیا۔ چوہدری اشفاق نے ان کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہ انہیں گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ میں نے سکون کا سانس لیا لیکن مطمئن پھر بھی نہ ہوا۔ نجانے کس بل میں کون سا سانپ موجود ہے؟

شور سے کانوں میں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لوگ نعرہ بازی کر رہے تھے۔ ہوتا یہ ہے کہ اس طرح کشتی جیت لینے کے بعد پہلوان انعام کے لیے پورے دائرے کا چکر لگاتا ہے اور لوگ اسے انعام دیتے ہیں۔ لیکن فرید نے ایسا نہیں کیا، وہ سیدھا ہماری طرف چلا آیا، جہاں سردار فیاض اور اس کے ساتھ علاقے کے معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے قریب آ گیا۔

''فرید پتر، وہیں پنڈال کے درمیان میں چلو، میں تمہیں وہیں انعام دینے آتا ہوں۔'' سردار فیاض نے کہا تو وہ بولا۔

''میں یہاں موجود ہر بندے سے بات کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو؟'' اس نے کہا تو سردار فیاض نے اسپیکر والے کو اشارہ کر دیا۔ اس نے مائیک اسے دیا تو وہ کہنے لگا۔

''میرے علاقے کے لوگو سنو۔'' اس نے کہا تو سب ٹھٹک گئے۔ وہ کہنے لگا، ''سنو، یہ کشتی جیت کر میں اپنے علاقے میں اسپتال جیت گیا ہوں۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں وہ اسپتال چلے گا کیسے؟ یہاں کے عوام کو اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ ایک پہلوان کو پالنا ایک ہاتھی کو پالنے کے برابر ہوتا ہے، اور یہ اسپتال؟''

اس پر سردار فیاض اٹھا، مائیک اسے دے دیا تو اس نے کہا۔

''جمال نے اعلان کیا ہے اسپتال بنوا کر دینے کا، لیکن اسے چلانے کے لیے میں ایک فیکٹری لگا رہا ہوں۔ اس کی ساری آمدنی اس اسپتال کی ہوگی۔ جتنا یہ جمال کرے گا، اتنا ہم علاقے والے کریں گے، مت گھبراؤ میرے پتر۔''

یہ کہہ کر سردار نے انعام کی رقم اسے دے دی۔ اس کے ساتھ ہی میلہ ختم ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کی جانب چل پڑے تھے۔

سورج غروب ہو گیا تھا۔ میں وہاں سے نکلا تو سیدھا مسافر شاہ کے تھڑے پر گیا۔ وہاں جسپال سنگھ کے سامنے، وہ دونوں سامنے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ چوہدری شہزاد مجرموں کی مانند کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ دو اور لوگ بھی تھے۔ میں نے ان کے بارے میں پوچھا تو چوہدری اشفاق نے بتایا۔

''ایک تو ان کے ساتھ کا ہے، یہ تینوں یہاں آئے تھے، اس نے بھی دوسری طرف سے پسٹل نکال لیا تھا فائر کے لیے۔ اس کے ساتھ والا ''را'' کا ایجنٹ ہے،

جو اس شہزاد کو اپنا سورس بنا کر یہاں اپنا کام کرنا چاہتا تھا۔ میں ان کی تہہ تک پہنچ گیا ہوں، یہ شہزاد غدار ہے، اور غدار کی سزا کیا ہوتی ہے؟"

وہ ایک دم سے جذباتی ہو گیا تھا۔ میں اس وقت کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اچانک میرے دل میں آئی کہ انہیں معاف کر دوں۔ تبھی اس کے ساتھ ہی دوسرا خیال آیا تو میں بولا۔

"اشفاق! اب یہ ہمارے مجرم نہیں، ہمارے وطن کے مجرم ہیں۔ انہیں وہی سزا ملے گی جو وطن دشمنوں کو ملتی ہے، اس لیے انہیں صفدر اسماعیل کے حوالے کر دو، وہی ان کا فیصلہ کریں گے۔"

"میں انہیں یہیں......" چوہدری اشفاق نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ انہیں لے کر چل دیئے۔ میں نے سب کو جانے کا کہہ دیا۔ اور تھڑے کے پاس بنے کمروں کے آگے بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جسپال بھی میرے سامنے والی چارپائی پر آ کر بیٹھا تو میں نے درویش سے کہا۔

"یار چائے ہی پلا دو، ہو جائے گا بندوبست؟"

"کیوں نہیں سرکار، ابھی بن جاتی ہے۔" اس نے خوشی سے کہا اور اندر کی جانب چل پڑا۔

"یہ میلہ ختم ہوا ہے تو اب سکون ہے۔ اب ایک دن آرام کے بعد ہم نکلیں گے، ساری......"

"نہیں جمال، میں کل ہی واپسی کے لیے نکلوں گا اور پھر ایک دو دن بعد میں واپس کینیڈا چلا جاؤں گا۔ مجھے اب وہاں بہت کام ہیں۔" اس نے سکون سے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔

یہی وہ لمحے تھے، جب مجھے لگا کہ ایک دم سے خوشبو پھیل گئی ہو۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مسافر شاہ کے تھڑے پر وہی والے بابا جی کھڑے ہیں اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ میں انتہائی تیزی سے

اٹھا، یہی حال جسپال کا تھا۔ درویش بھی ٹھٹک کر انہیں دیکھنے لگا۔ میں ان کی طرف بڑھا۔ وہ میری طرف دیکھتے رہے۔ میں بالکل ان کے پاس چلا گیا تو انہوں نے پیار سے مجھے اپنے گلے لگالیا۔

''میں نے تم سے وعدہ کیا تھا نا کہ تم سے ملوں گا، لو آج میں تم سے ملنے آ گیا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئے پھر بولے،''تم تو میرے سامنے رہے ہو۔ تمہیں لگا ہوگا کہ میں تمہیں کئی بار ملا ہوں۔ حقیقت میں آج تمہیں دوسری بار ہی مل رہا ہوں۔ باقی سب میرے عکس تھے۔''

''میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' میں نے بہ مشکل کہا تو وہ مسکرا دیئے اور بولے

''آج تجھے ملنا تھا، بہت ضروری تھا ملنا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کیلئے خاموش ہوئے اور پھر بولے۔ ''بیٹھو۔'' میں ان کے ساتھ ہی تھڑے پر بیٹھ گیا۔ جب ہم بیٹھ چکے تو وہ بولے

''جمال! یہ جو مردمومن ہوتا نا، اس میں دو خوبیاں ایک ہی وقت میں ہونا لازمی ہیں، ایک جلال اور دوسری جمال۔ دونوں لازم ملزوم ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر کچھ بھی نہیں ہیں۔ جیسے شیشہ...... جمال اس کی خوبصورتی ہے لیکن اس کی سختی اس کا جلال ہے۔ لوہے کا ٹکڑا ایک عام سی شے ہوگا، یہ محض جلال ہے لیکن اگر اسے جمال نہیں دیں گے تب تک اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ اگر وہ لوہے کا ٹکڑا، تلوار کے روپ میں آ جاتا ہے تو یہ اس کا جمال ہے، اس پر سونا بھی لگایا جاتا ہے، ہیرے جواہرات سے بھی مزین کیا جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رُکے پھر بولے، ''دیکھو، حق و باطل کی کشمکش ازل سے چل رہی ہے اور ابد تک رہے گی۔ جس کا جتنا حصہ ہے، جتنا کام ہے وہ کر کے الگ ہو جاتا ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ مردمومن کسی بھی وقت جمال اور جلال سے آزاد ہو جائے۔ اگر وہ جمال سے آزاد ہوتا ہے تو اس کا کام، تبلیغ یا مقصد بالکل ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر وہ جلال کو چھوڑ دیتا ہے تو اس پر کفر حاوی ہو جائے گا۔ دراصل جمال اور جلال کا آپس میں ایسا تعلق ہے کہ ان سے زندگی کے مثبت اور منفی وہ پہلو سامنے آتے ہیں جن سے انسان کی بقا ضروری ہے۔ میدان جنگ میں ہے تو قوت بازو اور خانقاہ میں ہے تو برداشت، حوصلہ اور تحمل۔ سننے کا حوصلہ جو منبر کا تقاضہ ہے۔ جس نے بھی زیادتی کی ہو، حق پر ہوتے ہوئے بھی صبر اور برداشت کرنا۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے کیا اور کر کے دکھایا۔''

وہ پھر خاموش ہو گئے۔ میں چپ رہا، بولنے کا یارا ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد فرمانے لگے۔

''مومن کی غیرت کا تقاضہ ہے کہ اس میں جلال اور جمال برابر ہوں۔ جس حسن میں قوت نہیں وہ بے کار ہے۔ کوئی جتنی بھی خوبصورتی ہو وہ اپنی بقا کو قائم نہیں رکھ سکتی ہے۔ جمال ایسی چیز ہے جو دراصل اس قوت کی محافظ ہے۔ اگر جمال نکال دیا جائے تو محض قوت رہ جائے گی، جیسے شیر کی درندگی۔ محض درندگی کو انسان نے کس سے تسخیر کیا؟ یہ وہ قوت ہی نہیں جو شیر استعمال کرتا ہے۔ یعنی جمال ایک ایسی چیز ہے جو جلال والی قوتوں کو ایسا روپ دیتا ہے جس سے اس کی صلاحیتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے انسان دوسری مخلوقات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جب تک جمال کی لہر انسان پر نہیں چڑھتی اس وقت تک اس کے جلال کی قوت نہیں بنتی۔ جلال نے جب جمال کو حاصل کرنا ہے تو صبر اور برداشت سے حاصل کرنا ہے، حق پر ہوتے ہوئے برداشت کرنا اصل حق ہے، یہی اصل طاقت ہے۔''

یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گئے۔ جیسے مراقبے

میں ہوں۔

"انسان نے سوچا میں چاند پر چلا جاؤں، آخر وہ کیا قوت تھی جو اسے چاند پر جانے کے لیے اکساتی تھی؟ اگر وہ انسان میں تھی ہی نہیں تو کہاں سے آ گئی؟ اصل میں وہ اس کے باطن میں پڑی تھی۔ ایک انسان نے سوچا کہ وہ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں بات کرے گا، اس نے کیا اور ہو رہا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے یہ اس خواہش کو کس روپ میں سامنے لے کر آیا۔ یہ اس کے باطن کی طاقت پر منحصر ہے کہ وہ اسے کیا روپ دیتا ہے، اگر یہ دلیل سمجھ میں آ گئی تو کچھ بھی ماورائی نہیں رہتا۔ پھر یہ عشق بن جاتا ہے۔ یہ انسان کی اپنی دلیل ہے، اپنا ارادہ ہے اور خواہش ہے کہ وہ تار کے ساتھ بات کرے یا بے تار کے بات کرے۔ تم پھول کو پکڑ سکتے ہو کیا خوشبو کو چھو سکتے ہو؟، خوشبو کی بھی ایک ماہیت ہے۔ ہاں خوشبو کو بھی پکڑا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے پکڑنے کے لیے اتنا ہی لطیف ہونا پڑے گا۔ اس طاقت کو وہی پکڑ سکتا ہے، جو اتنا ہی لطیف ہوگا، پھر خوشبو کا جوہر ہاتھ آ جاتا ہے۔ یہ ایک پھیلاؤ ہے۔ ازل سے ابد تک ظاہر اور باطن نے ساتھ ساتھ رہنا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ گئے، میں بھی اٹھ گیا۔ تب انہوں نے مجھے سینے سے لگایا، مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو پہلی بار ان سے ملنے پر ہوئی تھی۔ پھر میرے چہرے پر نگاہیں لگا کر بولے۔

"اب ہم شاید نہ مل سکیں، میرا وقت پورا ہو گیا، اب تیرا وقت ہے۔ خود کو سنبھال لینا۔ ظاہر کا سفر ہو گیا، اب باطن کے سفر پر جانا ہے۔ تم پر ایک نئی دنیا کھل رہی ہے۔ اس کا مشاہدہ بہت احتیاط سے کرنا، یہ ریاضت ہے۔ روحانیت پوری سائنس ہے اور انسان کا لطیف ہونا ایک آرٹ ہے۔ فنا فی اللہ وہی سمجھ سکے گا جو اس سائنس کو سمجھتا ہو اور اس کے مطابق اس ریاضت سے گذرا ہو۔"

یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹے اور تھڑے سے اترتے چلے گئے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ ایک انچ بھی ادھر ادھر نہ ہل سکا۔ میں انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے خود پر غور کیا۔ مجھ میں ایک نئی طرح کی قوت آ گئی تھی۔ مجھے لگا میری دنیا ہی بدل گئی ہے۔

میں نے دیکھا، دور تک روشنی پھیل گئی ہے۔ اس میں وہ سب لوگ موجود ہیں جو میرے ساتھ چلے تھے۔ ایک طرف اگر ولید اپنے تین سو تیرہ لوگوں کے ساتھ کھڑا ہے تو دوسری جانب جسپال سنگھ کے پیچھے جم غفیر تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

❁ ❁ ❁

عزیز قارئین! جنھوں نے میری اس کہانی کو پسندیدگی کی سند دی' ان میں شکر گزار ہوں۔ یہ اس کہانی کا اختتام نہیں ہے بلکہ یہ کہانی جاری ہے۔ بعض وجوہات کے باعث اس کہانی کے بقیہ واقعات "نئے افق" میں شائع نہیں کیے جا سکتے۔ ان شاء اللہ آپ مکمل کہانی جلد ہی کتابی صورت میں پڑھ سکیں گے۔

آپ کا اپنا امجد جاوید

شکاری

منعم اصغر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

شکاری

منعم اصغر

مرد اگر بگڑ جائے تو بے لگام گھوڑا بن جاتا ہے۔ دین ہو یا خاندانی شرافت و نجابت وہ گناہوں کے صحرا میں دوڑتے ہوئے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا مگر جب وہ بگڑتا ہے تو......
ایک حسینہ کی سرگزشت' شیطان نے اس کا دامن آلودہ کر دیا تھا۔

باہر انتہائی تیز بارش ہو رہی تھی' وقفے وقفے سے گرجتی اور چمکتی بجلی یمنہ جیسے کمزور دل لوگوں کے دل ہولا رہی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے اور وہ ماں کے کمرے میں اس کے سرہانے بیٹھی بے بسی سے زار و قطار رو رہی تھی۔ اس وقت ماں کی حالت بھی زیادہ خراب ہو رہی تھی' وہ ہاتھ پاؤں مارتی' بمشکل سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔

یمنہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت آخر کیا کرے؟ باپ کو کھونے کے بعد وہ ماں کو ہرگز نہیں کھونا چاہتی تھی' بھری دنیا میں ایک ماں کے علاوہ اس کا تھا ہی کون؟

یمنہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی' اس کے پیدا ہوتے ہی باپ چل بسا' ماں نے محنت مزدوری کر کے اسے پڑھایا لکھایا اور اس قابل بنایا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے۔ یمنہ خود جاب کے ساتھ ساتھ بچوں کو ٹیوشن بھی دیتی تھی جس سے وہ خوشحال زندگی گزار رہی تھیں۔

رات سونے سے پہلے اماں کی طبیعت خراب ہو رہی تھی وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی تھی مگر انہوں نے منع کر دیا اور اب وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹتی آنسو بہا رہی تھی۔ اکیلی لڑکی اتنی رات کو کیا کر سکتی تھی۔

''یمنہ میری بچی...... میرا آخری ٹائم آ گیا ہے میں نہیں بچ پاؤں گی یمنہ! مجھے اپنی موت کا کوئی افسوس نہیں...... افسوس تو اس بات کا ہے کہ تمہیں اس ظالم دنیا میں اکیلے چھوڑ کر جا رہی ہوں مجھے معاف کرنا میری بچی!'' الفاظ نہیں تھے تیر تھے جو یمنہ کے دل میں اترتے چلے گئے وہ تڑپ کر رہ گئی۔

''نہیں اماں! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں...... میں خالہ زبیدہ کو فون کرتی ہوں وہ آ جائیں پھر اسپتال چلتے ہیں۔'' اچانک اسے خالہ زبیدہ یاد آئیں جو اماں کی سہیلی تھیں اور اکثر ان کے گھر آتی رہتی تھیں۔ یمنہ انہیں کال کرنے کے لیے دوسرے کمرے سے موبائل اٹھا لائی اور زبیدہ خالہ کو کال ملا کر ساری صورت حال بتائی۔

بارش اب تھم چکی تھی' آدھے گھنٹے بعد جب زبیدہ خالہ گھر پہنچی اماں اپنے خالق حقیقی سے جا ملی تھیں۔ یمنہ ساکت رہ گئی' اسے لگا جیسے وہ یکدم ٹھنڈی چھاؤں سے تپتی دھوپ میں ننگے سر آ کھڑی ہو۔

❀......❀......❀

''کیا بات ہے انا! کیوں پریشان ہو؟'' آثم اور انا اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہے



تھے جب آثم نے سنجیدگی سے پوچھا تھا کیونکہ انا خلاف توقع آج چپ چپ اور کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھی۔

''آثم مجھے ڈر سا لگنے لگا ہے اگر میرے ماں باپ کو پتا چل گیا تو وہ کیا سوچیں گے؟'' انا نے پریشانی کی وجہ بتائی۔ آثم ہلکا سا مسکرایا اور اسے ہوٹل کے روم میں لے آیا۔

''لو اب کسی کو پتا نہیں چلے گا۔'' آثم اس کے قریب آ گیا انا گھبرا گئی۔

''میرا مطلب...... آثم اگر کسی نے مجھے تم سے ملتے دیکھ لیا تو بہت بُرا ہوگا تم آخر رشتہ کیوں نہیں بھیجتے؟'' انا نے گھبرا کر آثم کی توجہ بٹانی چاہی کیونکہ تنہائی میسر آتے ہی وہ صاف طور پر آثم کی آنکھوں میں شیطانیت ناچتی دیکھ رہا تھا۔

''وہ سب بھی ہو جائے گا جان آثم! تم فکر مت کرو۔'' وہ انا کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔

''آثم پلیز...... مجھے جانا ہے دیر ہو رہی ہے۔'' انا نے اسے ہلکا سا دھکا دے کر دور کیا اور دروازے کی طرف بڑھی مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتی آثم تیزی سے اس کے سامنے آ گیا تھا۔

''انا رکو نا اتنی بھی کیا جلدی؟'' وہ مکروہ ہنسی ہنسا انا کانپ کر رہ گئی۔

''آثم جانے دو مجھے...... مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں۔''

''پر مجھے تو بہت پسند ہے۔'' اس کے کہنے پر آثم بولا۔

''آثم میں ایسی نہیں ہوں اور یہ سب کر کے ہمارے پیار کی توہین مت کرو' مجھے اپنی نظروں میں مت گراؤ۔'' انا روہانسی ہوگئی مگر آثم پر کوئی اثر نہیں ہوا اس نے آگے بڑھ کر انا کو دبوچ لیا۔ انا پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

''آثم تمہیں خدا کا واسطہ' تمہاری بہن بھی ہوگی اسی کا واسطہ۔'' انا چیختی' چلاتی رہی مگر آثم درندہ تھا وہ پہلے بھی کئی لڑکیوں کا شکار کر چکا تھا انا ابھی دیگر لڑکیوں کی طرح اس کا شکار بن گئی۔ وہ سب کے ساتھ یہی کرتا تھا پہلے پیار کا دعویٰ کرتا لڑکیوں کو اپنے شیشے میں اتار کر ان کی عزت کی چادر کو تار تار کرتا تھا اور ایسا کرنے کا اسے کوئی ملال بھی نہیں تھا۔

❁ ✿ ❁

یمنہ پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی' دنیا یکدم خالی سی ہوگئی تھی جب اس بھری دنیا میں آپ سے آپ کا آخری سہارا بھی چھن جائے تب پتا چلتا ہے کہ وہ آپ کے لیے کیا تھا؟

یمنہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا' اماں کے جانے کے بعد وہ ٹوٹ کر رہ گئی تھی تاہم یمنہ ایک نیک و پرہیز گار لڑکی تھی۔ اللہ کی رضا میں راضی ہونے والی' وہ ماں کی وفات پر صبر کر کے اللہ کی رضا میں راضی ہوگئی تھی۔

رات صبح میں تبدیل ہو چکی تھی' بارش ہونے کے بعد آسمان صاف اور ہر چیز نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ چہچہاتے پرندے معمول کے مطابق ذکر الٰہی میں مشغول تھے۔ سب کچھ ویسا ہی تھا مگر یمنہ کی دنیا بدل چکی تھی۔ صبح ہوتے ہی زبیدہ خالہ کا بیٹا تائب گھر آچکا تھا۔ یمنہ کے محلے میں کسی کے ساتھ تعلقات نہیں تھے' پورے محلے میں صرف حنا سے اس کی دوستی تھی' وہ بھی اس کے غم میں برابر کی شریک تھی۔ اعلان ہونے کے بعد محلے کی خواتین و حضرات جمع ہونا شروع ہو چکے تھے' اماں کو غسل دینے کے بعد اب اسے سپرد خاک کر دینے کے لیے اٹھایا جا رہا تھا اور یہ منظر دیکھ کر یمنہ کا ٹوٹ گیا وہ ماں سے لپٹ کر رونے لگی۔

❁ ✿ ❁

آثم جس کے ماں باپ نے اس کا نام عاصم رکھا تھا مگر وہ اپنا نام آثم لکھتا اور بتاتا تھا۔ انتہائی گھٹیا' کمینہ' مغرور' منہ پھٹ' بدتمیز اور بگڑا ہوا لڑکا تھا۔ اسکول کے دنوں سے ہی وہ ایسے بُرے بُرے کاموں میں ملوث ہو گیا تھا۔ ماں باپ' بہن بھائی کی وہ سنتا نہیں تھا ہمیشہ اپنی ہی من مانی کرتا۔

شروع شروع کے دنوں میں وہ چھوٹے موٹے بُرے کام کرتا تھا مگر اب وہ بہت بڑے گناہ کرنے لگا تھا۔ ہر وقت لڑکیوں کے چکر میں رہتا اور لڑکی نظر آتے ہی انہیں پھنسانے کی کوشش کرتا' اب تک وہ کئی لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا چکا تھا اور ان بدنصیب لڑکیوں میں انا بھی شامل تھی۔

ہوٹل سے نکلنے کے بعد آثم نے اسے سڑک پر چھوڑ دیا تھا' وہ مُردہ قدموں سے چلتی ہوئی بنا کچھ دیکھے سر پر دوپٹہ اور پیروں میں جوتی کی پروا کیے بنا آگے جا رہی تھی۔

وہ ابھی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ آثم کی تیز رفتاری سے آتی بائیک نے اسے ٹھوکر ماری تھی اور وہ اچھل کر سڑک پر جا گری۔ سامنے سے آتے ٹرک کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے خود ٹرک ڈرائیور نے بھی ٹرک کو کنٹرول کرنے کی پوری

کوشش کی مگر دیر ہو چکی تھی۔ ٹرک نے اسے کچل کر رکھ دیا' اب آثم اطمینان سے واپس بائیک پر بیٹھ کرزن سے آگے بڑھ گیا۔

آج اماں کو مرے پانچ دن گزر گئے تھے' اس وقت گھر کے صحن میں زبیدہ خالہ اور تائب کے ساتھ حنا بھی آئی بیٹھی تھی۔ یمنہ سب کے لیے چائے لے کر وہیں چلی آئی اور سرو کرنے لگی۔

''یمنہ بیٹا کیا سوچا تم نے؟'' زبیدہ خالہ نے چائے کا کپ پکڑے ہوئے پوچھا تھا۔

''کس بارے میں؟'' حنا نے چونک کر پوچھا تو زبیدہ گویا ہوئیں۔ ''بیٹی تم تو جانتی ہو کہ خالدہ کے جانے کے بعد یمنہ بالکل اکیلی پڑ گئی ہے اس لیے میں اسے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہوں۔''

''پر میں یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی' یہاں میری ماں کی یادیں وابستہ ہیں۔'' یمنہ کی آواز بھرا گئی۔

''پر یمنہ تم یہاں اکیلی نہیں رہ سکتیں' گھر میں کوئی مرد نہ ہو تو لڑکی کا اکیلے رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ تم چلو ہمارے ساتھ پلیز' بات کو سمجھو۔'' خاموش بیٹھے تائب نے پہلی بار زبان کھولی تھی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی میں کچھ سامان لے آؤں۔'' اس کی بات پر سب نے سر ہلایا تو وہ اندر چلی گئی' واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا بیگ تھا' بیگ رکھ کر وہ حنا سے گلے ملنے کے لیے اس کی طرف بڑھی اور اس کے گلے لگ گئی۔

''آتی رہنا یمنہ! میں تمہارے بغیر بہت اداس رہوں گی' کبھی سوچا نہ تھا کہ......'' حنا آبدیدہ سی ہوگئی خود یمنہ کی آنکھوں سے اشک ٹوٹ کر منہ پر اوڑھے حجاب میں جذب ہوگئے۔ وہ گھر پر ایک

الوداعی نظر ڈال کر زبیدہ خالہ کے ساتھ ہولی۔

بے شک زبیدہ خالہ کا گھر اس کے لیے نئی جگہ نیا ماحول تھا مگر اسے وہاں ایڈجسٹ ہونے میں ذرا بھی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ خالہ زبیدہ اور اسلم انکل اس سے بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ اسلم انکل اور زبیدہ خالہ کی تین اولادیں تھیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ تائب اور ایمن سے تو وہ مل ہی چکی تھی مگر وہ ان کے دوسرے بیٹے کو ابھی نہیں ملی تھی۔ ایمن سے بھی اس کی پہلے ہی دن دوستی ہوگئی تھی، یمنہ نے آتے ہی پورا گھر سنبھال لیا۔

ابھی وہ مغرب کی نماز ادا کر کے اٹھی ہی تھی کہ دروازہ بج اٹھا، سب صحن میں ہی بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ دروازہ ایمن نے کھولا تھا، آنے والا خالہ کا دوسرا بیٹا ہی تھا وہ وہیں رک گئی۔

''ارے یمنہ آؤ نا بھائی سے ملو۔'' خالہ زبیدہ نے کہا تھا وہ جھجکتی ہوئی ان کی طرف بڑھ گئی۔

''یمنہ میرے بیٹے سے ملو یہ ہے عاصم! تمہارا چھوٹا بھائی۔'' خالہ بہت محبت سے بتا رہی تھیں۔

''عاصم نہیں اماں آثم!'' آثم نے چڑ کر کہا اور سامنے کھڑی خوب صورت لڑکی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''جو بھی ہے چھوڑو! یہ یمنہ ہے اب سے ہمارے ساتھ رہے گی تم اسے ایمن کی طرح اپنی بہن ہی سمجھو۔'' خالہ نے تعارف کراتے ہوئے کہا تو یمنہ نے اسے سلام کیا وہ مسکرا اٹھا۔

''کیسی ہیں یمنہ!'' وہ محبت بھرے لہجے میں بولا تھا یمنہ نے مسکرا کر جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جی بھائی اللہ کا شکر ہے۔'' آثم نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی، وہ بلاشبہ خوب صورت و حسین تھی اور شاید نماز پڑھ کر آئی تھی تبھی تو اس کا نورانی چہرہ اور بھی دمک رہا تھا اور جلد ہی ایمن اور تائب کے ساتھ اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہاں سب رات کا کھانا آٹھ بجے کھاتے تھے، کھانا کھانے کے بعد وہ برتن دھو کر نکلی تو عشا کی اذان ہورہی تھی۔ کمرے میں شاید ایمن اور آثم ٹی وی دیکھ رہے تھے وہ اندر چلی آئی۔

''ایمن! آثم بھائی ٹی وی کی آواز کم کریں پلیز اذان کا وقت ہے۔'' یمنہ نے دونوں کو ٹوکا۔

''تو کیا ہوا یمنہ! روز ہوتی ہے۔'' آثم نے بے پروائی سے جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

''آثم بھائی!'' یمنہ دل و جان سے کانپ کر رہ گئی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''سوری یمنہ! یہ لو۔'' ایمن نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز بند کی اور اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ بھی آؤ نا؟'' یمنہ نے وہیں کھڑے ہوئے جواب دیا۔ ''میں ٹی وی نہیں دیکھتی ویسے بھی نماز کا وقت ہے تائب بھائی مسجد گئے ہیں، میں بھی نماز ادا کرنے جارہی ہوں، آپ لوگ بھی نماز پڑھیں۔'' یمنہ نے کہا تو وہ دونوں خاموشی سے ٹی وی دیکھتے رہے یمنہ تاسف سے سر ہلاتی نماز پڑھنے چل دی۔

آسمان پر سفید بادل چھائے ہوئے تھے جس سے آسمان کا اپنا نیلا کلر سفید بادلوں میں دب گیا تھا، ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا موسم کو مزید خوشگوار بنا رہی تھی۔ سب لوگ اس وقت صحن میں بیٹھے موسم انجوائے کررہے تھے جب آثم اس کے قریب آبیٹھا۔

''اے کیا پڑھ رہی ہو؟'' اس نے یمنہ کے ملتے لب دیکھ لیے تھے۔ ''گانا گارہی ہو کیا؟ بڑی چھپی رستم نکلی سناؤ مجھے۔''

''نہیں میں گانے نہیں گاتی، میں درود شریف

پڑھ رہی ہوں۔“ یمنہ نے اطمینان سے جواب دیا وہ سناٹے میں رہ گیا۔

”اچھا چھوڑو یہ بتاؤ تم نے اپنی زندگی مطلب مستقبل کے کیا منصوبے بنائے ہیں؟“ آثم نے کوفت سے موضوع بدلا۔

”ہاں بتاؤ نا؟“ تائب اور ایمن بھی وہیں چلے آئے تائب نے بولنا شروع کیا۔

”میں نے منصوبے بنائے ہوئے ہیں‘ سب سے پہلے اپنی پڑھائی مکمل کروں گا پھر اچھی سی جاب‘ جب اپنے پیروں پر کھڑا ہوجاؤں گا تو ایمن اور آثم کی شادی کروں گا پھر اپنی شادی کر کے ماں باپ کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزاروں گا۔“ تائب جیسے بہت ہی پُرجوش تھا۔

”میں پہلے ہی منصوبے بنانا حماقت سمجھتی ہوں کیونکہ زندگی ہمیں کبھی بھی ہمارے منصوبوں کے مطابق جینے کی اجازت نہیں دیتی۔ ہمارے علاوہ ایک اور بھی ہے جو ہمارے لیے منصوبے بنارہا ہوتا ہے جس کے آگے سب کے پلان دھول چاٹتے رہ جاتے ہیں۔“ یمنہ نے بات مکمل کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پیچھے تائب سن سا بیٹھا رہ گیا‘ کتنی گہری بات کرگئی تھی وہ مغموم سی بھولی بھالی لڑکی جو کچھ ہی دنوں میں اس کے دل کے بے حد قریب ہوگئی تھی۔

❁ .... ❁ .... ❁

آثم آج کل بہت ہی بے چین ہورہا تھا‘ انا والے معاملے کی پولیس پوری تحقیقات کررہی تھی‘ اس لیے وہ محتاط ہوگیا تھا مگر اب اس کی نظر معصوم سی یمنہ پر تھی۔

وہ آج کل بہانے بہانے سے اسے گلے لگانے کو دوڑتا‘ چھوٹی سی تعریف پر اس کے ہاتھ چوم لیتا۔ ہر وقت اس کے پیچھے آنکھوں میں محبت

نیا سال

خدا کرے یہ پچھلے سال سے بہتر ہو
ہم سب کو خوشیاں دے اور بلاؤں سے دور رکھے
خدا کرے ہمارے حالات بدلیں، ہمیں مشکلات سے نجات ملے
بجلی کی گیس کی لوڈشیڈنگ سے نجات ملے
بھوک، افلاس، مہنگائی اور بیماری سے رہائی ملے
خدا کرے ہماری حکومتوں اور حکمرانوں کے فاصلے عوام سے کم ہوں
خدا کرے، ہم جو چاند تک پہنچ گئے ہیں پڑوسی کے دل تک بھی پہنچ سکیں
خدا کرے حکمرانوں کو عام آدمی کے دکھ درد کا احساس ہو
خدا کرے دہشت گردی، لاقانونیت اور ظلم وزیادتی ہمارا پیچھا چھوڑ دیں
خدا کرے پاکستان کا نظام بدل جائے اور جبر و استحصال سے عام آدمی کو چھٹکارا مل جائے
خدا کرے ہمارے حکمران، ہمارے سیاستدان عوام کے لیے جھوٹ اور مکروہ فریب کے جال بننا چھوڑ دیں
خدا کرے ہماری عدالتوں سے انصاف سستا ملے اور جلد ملے
خدا کرے ہمارے تھانوں سے مظلوموں کو دھکے نہ ملیں
خدا کرے ہمارے دفتروں سے رشوت کی اور سفارش کی لعنتیں ختم ہوجائیں
قائداعظم نے کہا تھا جس پاکستان میں غریب کو روٹی، مظلوم کو انصاف اور محروم کو چھت نصیب نہ ہو وہ پاکستان نہیں چاہیے۔
خدا کرے ہمارا پاکستان قائداعظم کے خوابوں کی تعبیر بن جائے

ایم جے قریشی..... ڈی آئی خان

لیے پھرتا مگر یمنہ یہ سب نہیں سمجھ پا رہی تھی۔
وہ معصوم سی عبادت گزار لڑکی تھی' ہر وقت نماز' قرآن' دین کی باتیں' درود' آیۃ الکرسی' چھوٹی موٹی سورتیں غرض جو کچھ اسے یاد ہوتا فارغ وقت یا کام کرتے ہوئے پڑھتی رہتی تھی۔
وہ اب اس گھر کو اپنا گھر اور ان لوگوں کو اپنا خاندان ماننے لگی تھی کبھی کبھار حنا بھی آجاتی تھی یوں وہ اللہ کا شکر ادا کرتے کرتے نہ تھکتی تھی۔
وہ سمجھتی تھی کہ آثم اسے بہن سمجھتا ہے بہن کا درجہ دیتا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ آثم اسے بہن سمجھ نہیں سکتا تھا اسے اس وقت ایک منہ بولے بہن بھائی کا پاکیزہ رشتہ نظر نہیں آرہا تھا۔
جو لوگ نفس کے غلام ہوتے ہیں اور خود کو نفس کے حوالے کر دیتے ہیں وہ دراصل اپنی دنیا و آخرت تباہ کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا کو دھوکہ دے رہے ہیں مگر وہ دراصل خود کو دھوکہ دے رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دل پر اللہ مہر لگا دیتا ہے جو پھر کچھ بھی دیکھنے سننے کے قابل نہیں رہتے۔
وہ یمنہ کی زندگی کی سب سے بھیانک رات تھی' ایمن سمیت سب لوگ گاؤں میں ایک شادی اٹینڈ کرنے گئے ہوئے تھے تاہم یمنہ نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ آثم پہلے تو ان کے ساتھ چلا گیا مگر پھر یمنہ کے گھر میں اکیلے ٹھہرنے کا خیال اسے بے چین کر رہا تھا اسے لگا اس سے زیادہ اچھا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا اس لیے وہ جلد ہی وہاں سے آگیا۔
''ارے بھائی اتنی جلدی واپس آگئے؟ باقی سب کہاں ہیں؟'' یمنہ نے حیرانی سے آثم سے پوچھا تھا۔
''ہاں بس تمہاری تنہائی کا خیال تھا۔'' آثم نے کمرے کی کنڈی لگا دی یمنہ الجھ گئی۔
''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' یمنہ نے سنجیدگی سے پوچھا تو آثم کی شکل رونے والی ہوگئی۔
''یمنہ تم جانتی ہو تم میرے لیے کیا ہو' میں بہت بے چین ہوں مجھے تم سے پیار ہوگیا ہے اگر میں نے تمہیں حاصل نہ کیا تو میرا جینا مشکل ہو جائے گا۔''
وہ یمنہ کی سماعتوں پر بم پھوڑ گیا تھا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا بھی کچھ ہوگا۔
''آثم اپنی بکواس بند کرو' بہن ہوں میں تمہاری مجھے ایسی ویسی لڑکی مت سمجھو۔ میں کوئی ایسا کام کر کے اپنی آخرت بگاڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور میں تمہیں بھائی سمجھتی ہوں۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔'' وہ یکدم دہاڑی تھی' آثم کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
''بکواس بند کرو' اتنے دن تجھے گھر میں رکھا کھلایا پلایا صرف اس لیے کہ تم یتیم لڑکی ہو۔'' آثم اب پرانا آثم بن چکا تھا یمنہ ششدر رہ گئی۔
''اور تم کون سی پارسا ہو میں اچھی طرح جانتا ہوں اس لیے سیدھے طریقے سے نامانی تو الٹے طریقے بھی مجھے آتے ہیں۔'' آثم حقارت سے کہتے ہوئے بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر جھپٹا۔
''نہیں آثم...... تم ایسا نہیں کر سکتے' خدا کے قہر سے ڈرو۔ تم بہن بھائی کے پاکیزہ رشتے کی توہین نہیں کر سکتے۔'' یمنہ کو بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔
''ارے کون سا رشتہ اور کون سا خدا کا قہر...... میں پہلے ہی یہ سب کرتا رہا ہوں کوئی کچھ نہیں کر پایا اور پلیز خدا کو تو دور ہی رکھو۔'' آثم پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا وہ چلانے لگی۔

غروب ہونا ہے تمہیں بھی

✦ کبھی کبھی انسان کسی اپنے کو دکھ دے کر سکون محسوس کرتا ہے ایسا وہ بدلے کی آگ میں کرتا ہے لیکن اس کا یہ عمل بعض اوقات دکھ سہنے والے کو اپنے پروردگار سے قریب تر کر دیتا ہے اور اسے جہنم سے قریب کرنے میں اس کے بدلے کا ہاتھ شامل ہو جاتا ہے۔ آنکھیں بند کر لینے سے جس طرح دنیا کی رنگینیاں کہیں او جھل سی ہو جاتی ہیں بالکل اسی طرح مرنے کے بعد حساب اس دنیاوی اندھیرے سے بھی بدتر دکھائی دے گا۔ کل کی چاہ ہم انسانوں کے آج کو تو تاریکی کی طرف دھکیل ہی رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ سفر آخرت کے دیئے بھی بجھائی جا رہی ہے۔ دنیا کی رنگینیاں فریب ہیں آخرت اور قبر کو روشن کرنے والے عمل کریں جن کا اجر مرنے کے بعد ملے گا۔

✦ سورج اپنے مقررہ وقت پر طلوع و غروب ہوتا ہے انسان بھی اسی طرح ایک دن غروب کی جانب سفر کرتا ہے فرق صرف اتنا ہے سورج پھر سے اگلی صبح طلوع ہوتا ہے جب کہ انسان قیامت کے روز حاضر کیا جائے گا سورج جو نظام کائنات میں اہم فریضہ سرانجام دیتا ہے غروب ہوتے وقت اس کا پیغام یہی ہوتا ہے ''غروب ہونا ہے تمہیں بھی ایک دن۔''

دل کی بات

منزل کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔ دراصل جو ہماری خواہش ہے ہم اسے منزل سمجھ لیتے ہیں۔ جب ہماری خواہشات پوری ہوتی رہتی ہیں ہم مطمئن اور آسودہ رہتے ہیں اور جب خواہش ادھوری رہ جائے تو ہم بے چین ہو جاتے ہیں۔ بہت سی چیزیں یا کام ایسے ہیں جو ہو رہے ہوتے ہیں اور ہمیں نظر نہیں آتے مثلاً جیسے وقت کا گزرنا۔ وقت گزرتا ہے وقت گزرتا رہتا ہے ہمیں بہت کچھ دیتا رہتا ہے ہم سے بہت کچھ لیتا رہتا ہے اور وقت کے توسط سے ہی ماضی حال اور مستقبل وجود میں آتے ہیں اور ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا اور مستقبل کی کسی کو خبر نہیں۔

یوں حال ہی ہے جس میں ہم رہ رہے ہوتے ہیں اور اگر ہمارا حال اچھا ہے تو ہمیں سب کچھ اچھا لگتا ہے ہم اپنے ماضی کو یاد نہیں کرتے اور اگر حال اچھا نہیں تو ہم ماضی میں جھانکتے ہیں اور اپنے ماضی کو اپنے حال سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں جو کبھی ہو نہیں سکتا۔

ماضی اور مستقبل ہم ان سے دور ہوتے ہین اور حال ہی ہماری دسترس میں ہوتا ہے یا ہم حال کی دسترس میں ہوتے ہیں۔

زبیر اختر ...... لاہور

''مجھے چھوڑو آثم ...... مجھے خدا کے سامنے شرمندہ مت کرو۔ میں کیا منہ دکھاؤں گی اپنے خدا کو وجود غلیظ مت کرو۔ تمہاری بھی اپنی بہن ہے ڈرو اس وقت سے جب اس کے ساتھ ایسا ہوگا کیونکہ یہ تو طے ہے کہ جو کرو گے ویسا تمہارے ساتھ بھی ہوگا اس دن تمہارا کچھ نہیں بچے گا۔'' مگر آثم پر جب انا کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تو یمنہ کا کیا ہوتا وہ اسے اپنا شکار بنا چکا تھا۔

آثم یمنہ کو وہیں برہنہ چھوڑ باہر نکل گیا تاہم وہ کہنا نہیں بھلا تھا۔

''سنو...... خبردار جو زبان کھولی تو گھر سے بے دخل تم ہی ہوگی۔'' مگر وہ پتھر کی ہو چکی تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

اور وہی ہوا تھا جو آثم نے کہا تھا رات کو آثم کے ساتھ سب گھر میں داخل ہوئے تو یمنہ کو اسی حالت میں پا کر سب کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ثائب دروازے کے ساتھ ہی بیٹھتا چلا گیا ایمن نے بھاگ کر یمنہ پر کمبل ڈالا زبیدہ

خالہ کو تو چکر سے آ رہے تھے۔
"میں پوچھتی ہوں یمنہ بچی یہ کس نے کیا؟" زبیدہ خانم نے آنسو روکتے ہوئے ہمت کر کے پوچھا۔
"آ...... ثم......" یمنہ نے مردہ لہجے میں کہا جہاں تاب ساکت رہ گیا وہیں آثم مشتعل ہوا۔
"ہائے...... میرا نام کیوں لے رہی ہو ماں قسم لے لو میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں تو آپ کے پاس شادی میں تھا نا اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ یہ کسی سے ملتی رہتی ہے اب نام میرا لے رہی ہے۔ دیکھا اماں یہ صلہ دیا ہے اس نے ہماری محبتوں کا۔" آثم غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا' یمنہ نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔
"نہیں...... خالہ یہ جھوٹ بول رہا ہے' اسی نے یہ سب کیا ہے' اللہ اسے کبھی معاف نہیں کرے' اس کے ساتھ بھی ویسا ہی ہو جیسا اس نے میرے ساتھ کیا۔" وہ روتے ہوئے صفائی دے رہی تھی خالہ نے ہاتھ اٹھایا۔
"بس بہت ہوا' ہم نے تمہیں گھر میں پناہ دی اور تم نے یہ کیا اوپر سے میرے معصوم بیٹے پر الزام لگایا' نکل جاؤ میرے گھر سے دفع ہو جاؤ......" یہ وہ خالہ نہیں تھیں جو یمنہ کی خالہ زبیدہ تھیں' یہ تو کوئی اور ہی تھیں شاید آثم کی ماں...... یمنہ نے نظریں اٹھا کر تاب کو دیکھا وہ نظریں چرا گیا۔
"ہاں ہاں یہ تو ہے ہی اسی لائق کیسے ہر وقت مذہب کی باتیں کرتی رہتی ہے مگر اندر سے کیسی گھٹیا نکلی توبہ...... ہم نماز نہیں پڑھتے اللہ اللہ نہیں کرتے مگر تم سے کئی گنا بہتر ہیں۔" ایمن کے یہ الفاظ نہیں تھے کوئی چابک تھے جس سے یمنہ کی روح تک بلبلا اٹھی' اسے وہاں سے نکالا جا رہا تھا تابش کچھ نہیں بول پایا تھا اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے یمنہ نے کہا تو صرف اتنا۔
"آپ لوگوں کے مجھ پر اتنے احسان ہیں اس لیے بددعا نہیں دے سکتی مگر اتنا ضرور کہوں گی آثم کہ کبھی خوش نہیں رہ پاؤ گے۔ تم نے آج تک جتنی لڑکیوں کو برباد کیا ان کا حساب تمہیں دینا ہی پڑے گا۔" تم ایک ایسے شکاری ہو جو عورتوں کی عزت کا شکار کرتا ہے ایک دن تم خود شکار ہو گے تب تمہیں احساس ہوگا کہ شکار ہونا کیسا لگتا ہے۔"
یمنہ نے کہا اور اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا' وہ ایک بار پھر گھر سے بے گھر ہو گئی تھی۔ وہ دوبارہ سے تپتی دھوپ میں آ کھڑی تھی جہاں دور تک کوئی سایہ نہیں تھا۔
وہ رات اس کی زندگی کی بھیانک ترین رات تھی' اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کہاں جا رہی ہے یا کہاں جائے۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہاں پر موجود ہر شخص کی نظریں اس کے وجود پر پڑ رہی ہیں' اس کا دل کر رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔
بے مقصد ادھر اُدھر گھومنے کے بعد اسے دور سے کوئی آتا دکھائی دیا اور اس کے سامنے آ کر رک گیا۔ وہ کوئی اور نہیں تائب ہی تھا' اس نے یمنہ کو گاڑی میں بٹھایا اور اسے اس کے پرانے گھر لے آیا تھا۔ تائب خود بہت شرمندہ تھا وہ نہ یمنہ کی بات کو سچ ثابت کر پا رہا تھا نہ ہی آثم کو جھوٹا۔
اس دوران وہ روزانہ یمنہ سے ملنے آتا اور اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا خیال رکھتا۔ اس سب میں حنا بھی اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ یمنہ کو ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے تھے وہ اپنا ذہنی توازن کھونے جا رہی تھی تائب کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس پیاری سی نیک دل

لڑکی کو ہرگز کھونا نہیں چاہتا تھا تقریباً تین ماہ بعد اس کی طبیعت سنبھلی تھی اور وہ اپنے حواسوں میں واپس آئی تھی۔

پورے تین ماہ بیت گئے تھے اس عرصے میں کسی نے پلٹ کر یمنہ کی خبر تک نہیں لی تھی اس رات وہ سب حسب معمول رات کا کھانا کھا رہے تھے جب آثم اچانک بولا تھا۔

''یمنہ کے ہاتھ کا کھانا تو بھولتا ہی نہیں مگر کسی کو کیا پتا کہ وہ کیسی ہے؟ خیر مجھے تو لگتا ہے اس نے خودکشی کرلی ہوگی۔'' آثم کے یوں اچانک یمنہ کے ذکر پر سب چونک گئے۔

''نہیں آثم! اس نے خودکشی نہیں کی' وہ بہت اسٹرونگ ہے وہ کہتی ہے کہ حرام موت مر کر اپنے لیے جہنم کیوں خریدے' وہ کہتی ہے کہ وہ زندہ رہے گی اور خدا کے انصاف کا انتظار کرے گی۔''

تائب کہتا ہوا اندر چلا گیا جبکہ آثم کا نوالہ حلق میں ہی اٹک گیا بے اختیار وہ کھانسنے لگا۔

پھر خود بھی وہاں سے اٹھ گیا' ہر وقت اس کے دل کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ایمن کے ساتھ بھی......؟ اور اس کے آگے سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر شاید وہ بھول گیا تھا کہ اس جیسے اور بھی شکاری ہیں جو اس کی طرح عورتوں کے شکار میں رہتے ہیں۔

بہت دنوں سے محلے کا ایک آوارہ لڑکا ایمن پر نظریں رکھے ہوئے تھا اور اس سب میں ایمن کا بہت بڑا ہاتھ تھا وہ اپنی اداؤں سے خود ہی اسے دعوت دیتی تھی۔

جہاں بھائی ایسا تھا وہاں بہن سے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی تھی وہ سب گمراہی کے راستے پر چل

باتیں دلوں سے کرو

زندگی لمحوں کا کھیل ہے اور لمحے گزرتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ یہ بات آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ ایک مقررہ وقت پر ہم سب نے اس دنیا فانی کو چھوڑ جانا ہے پھر بھی ہم اس دنیا کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے پرائے کا کوئی ہوش ہی نہیں آخر کیوں ہم اس فانی دنیا کے دیوانے ہورہے ہیں۔ آئیں اس بابرکت مہینے میں اس بات پر غور کریں ہمارے اردگرد ایسے بہت سے لوگ ہوں گے جن کو شاید ہماری وجہ سے کوئی پریشانی ہو۔ آپ سب ایک لمحے کے لیے اس بات کو ضرور سوچیں محسوس کریں۔ آخر یہ زندگی ختم ہوجائے گی۔ ہم سب نے اپنے رب کریم کے ہاں جانا ہے ہمارا رب غفور و رحیم ہے۔ وہ ہمیں اپنے فضل وکرم اور رحمت سے بخش دے گا۔ (انشاءاللہ) ہم سب مسلمان بھائی بھائی ہیں ہمیں ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کردینا چاہیے۔ ہم اگر دوسروں کا خیال کریں گے تو کوئی ہمارا خیال کرے گا۔ امید ہے کہ آپ میری ان باتوں کو بے معنی نہیں جانیں گے۔ (میری کوئی بات اگر بری لگی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں)

کاشف نصیر گوہل...... منظور آبادلیہ

☆☆☆

کیوں

سادہ سا چار حرفی لفظ
مگر
کبھی اسے سمجھنے میں
کبھی اسے سمجھانے میں
زندگی گزر جاتی ہے

ریحانہ سعیدہ...... لاہور

کر گمراہ ہو رہے تھے۔ اللہ نے یمنہ کو شاید ان پر رحم وتر اس کھا کر انہیں راستہ دکھانے کے لیے بھیجا تھا مگر وہ تو اس قابل ہی نہ تھے۔

ایمن کا رشتہ آیا تھا اور آثم کی ضد پر ماں باپ نے ہامی بھر لی تھی' آثم کہیں نہ کہیں دل میں خوف لیے پھرتا تھا کہ ایمن کے ساتھ بھی ایسا ویسا نہ ہو۔

ایمن کا رشتہ طے ہو گیا اور شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہو گئیں گھر والے شاپنگ کو چل دیئے' آثم کو خود کوئی کام تھا اس لیے وہ ایمن کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر تھوڑی دیر میں واپس آنے کا کہہ کر بائیک لے کر باہر نکل پڑا اور وہی شاید انصاف کا دن تھا۔

بلاول ایمن کو گھر میں اکیلا دیکھ کر اندر گھس آیا' مہنگے مہنگے تحفے تو وہ پہلے ہی اسے دیتا تھا مگر ایمن کو کیا پتا تھا آج اسے گھر میں داخل ہونے دینا کتنا مہنگا پڑے گا۔

کچھ دیر بعد آثم گھر لوٹا تو ایک قیامت اس کی منتظر تھی' گھر کے باہر کچھ لوگ جمع تھے آثم الجھتے ہوئے جونہی اندر داخل ہوا سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے سر پر ساتوں آسمان ٹوٹ پڑے۔ ایمن زندہ لاش کی طرح صحن میں پڑی تھی ٹھیک ویسے جیسے برہنہ حالت میں یمنہ اور مری حالت میں انا...... اس کا دماغ گھوم گیا' آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

آج پتا چلا تھا اسے کہ جب اپنی ہی عزت سر عام بازار میں لٹ جائے تو کیسا لگتا ہے؟ جن جن پر یہ قیامت ٹوٹتی ہے تو وہ بولنا کیوں بھول جاتے ہیں' مسکرانا تو بہت دور کی بات ہے ایسے لوگ خودکشی کر کے حرام موت گلے لگانے پر کیوں مجبور ہو جاتے ہیں۔''

آج آثم وہیں کھڑے کھڑے فنا ہو گیا تھا اسے احساس ہو رہا تھا کہ ان سب بہنوں کے بھائیوں پر کیا گزرتی ہو گی جو اُن حالات سے گزرے ہوں گے۔ غصے میں پاگل ہو کر وہ بھاگتا ہوا شہروز (اس کا دوست) کے پاس سے پسٹل لینا جا رہا تھا وہ اپنی بہن کے قاتل کو زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا اس کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ آگے پیچھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا تبھی سڑک کراس کرتے وقت بس نے اسے ٹکر ماری اور وہ اڑتا ہوا سڑک کی دوسری جانب جا گرا تھا اور ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکا تھا۔

❁......❁......❁

وہ گرمیوں کی تپتی دوپہر تھی' آگ اگلتا سورج گویا سر پر آ کھڑا ہوا تھا' وہ پسینے میں شرابور نماز کا وضو کرنے جونہی باہر نکلی اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''اس وقت کون ہے؟'' وہ سوچنے لگی بہت دن ہو گئے تھے تائب بھی نہیں آئے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے دروازہ کھولا' وہاں تائب ہی کھڑا تھا۔ میلے کچیلے کپڑے' بغیر دھلا منہ' مٹی سے اٹے اور بکھرے بکھرے بال' چہرے پر مکمل سنجیدگی لیے وہ بے حد کمزور لگ رہا تھا۔ یمنہ دنگ رہ گئی یہ وہ تائب نہیں لگ رہا تھا جسے یمنہ جانتی تھی یہ وہ غائب نہیں تھا جو یمنہ کا تائب تھا۔

''اندر نہیں آنے دو گی؟'' تائب نے بمشکل چہرے پر زخمی مسکراہٹ سجاتے ہوئے پوچھا۔

''آیئے نا۔'' وہ خجل ہو کر رہ گئی۔ تائب یمنہ کا ہاتھ پکڑے اندر لے آیا وہ حیران سی ہو گئی۔

''یمینہ......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا یمنہ بوکھلا گئی۔

"کیا ہوا تائب! کیوں رو رہے ہیں؟" یمنہ نے ہاتھوں سے اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے پوچھا۔

"یمنہ تمہاری آہیں ہمیں کھا گئیں...... تمہیں پتا ہے ان چند دنوں میں کیا کیا ہوا ہے؟ ایمن کے ساتھ پتا نہیں کیا ہوا اس دن ہمارے گھر آنے سے پہلے ہی وہ خودکشی کر چکی تھی اور...... اور جانتی ہو آثم نے ایک خطرناک حادثے میں اپنی دونوں ٹانگیں کھودیں' وہ اب چلنے پھرنے سے کیا بیٹھنے سے بھی قاصر ہوگیا ہے' کھانے پینے کا ہوش نہیں۔ امی ابو الگ سے ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں انہیں تمام حقیقت کا پتا چل گیا ہے وہ اور آثم آخری بار تم سے معافی مانگنا چاہتے ہیں۔ ہمارا ہنستا بستا گھر اجڑ گیا ہے' تم ٹھیک کہتی تھیں اللہ بُرے لوگوں کے ساتھ بُرا ہی کرتا ہے۔" تائب بچوں کی طرح رو رہا تھا' یمنہ ساکت و جامد بیٹھی رہ گئی۔

"نہیں تائب! اللہ اپنے بندوں سے بے حد محبت کرتا ہے وہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔ یہ آثم کے مقدر میں تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو آثم کبھی اللہ کی طرف نہ لوٹتا' ہمیشہ بھٹکتا ہی رہتا۔ میں نے کسی کو بددعا نہیں دی بس اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑا اور اللہ ہمارے ساتھ وہی کرتا ہے جو ہمارے لیے بہتر ہے۔" یمنہ نے کہا اور دو آنسو اس کی پلکوں کے بند کو توڑتے ہوئے اس کے عارض پر چمکنے لگے۔

"یمنہ تم بہت اچھی ہو' شکر ہے اللہ کا کہ اس نے مجھے تمہارے جیسی لڑکی......" تائب نے اس کے ہاتھ پکڑ کر کہا تھا اور یمنہ کے اشک اب مسلسل بہنے لگے' اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں گویا اس ذات باری تعالیٰ کا شکر ادا کر رہی ہوں۔

لغزش

عمر فاروق ارشد

اسلام دین فطرت ہے' جس میں انسان کے ہر مسئلے اور الجھن کا حل موجود ہے۔ خواہ وہ مسئلہ ذاتی ہو یا اجتماعی۔ اس نے جو چیزیں حلال اور حرام قرار دی ہیں۔ آج سائنسی تحقیق اس کے ہر پہلو پر بحث و مباحثہ کے بعد اسے درست قرار دینے پر مجبور ہے۔
شراب کے نشے میں رشتوں کا تقدس پامال کرنے والے نوجوان کا فسانۂ عبرت۔

"اس بار نئے اسٹوڈنٹ بہت کم آئے ہیں۔" وقار نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ دیکھو......!" اس نے ہاتھ میں پکڑا رنگ کا پیکٹ آگے کیا۔

"پچھلے سال مزید رنگ لانا پڑا تھا مگر اس دفعہ یہ بھی بچ گیا۔"

"ابے پریشان مت ہو۔" پاس بیٹھا ہوا فرقان بولا۔

"ابھی پورا دن باقی ہے۔"

میں دھوپ میں گھاس پر لیٹا ان کی نوک جھونک سن رہا تھا۔ یونیورسٹی میں نئے اسٹوڈنٹس کی آمد جاری تھی اور ہمارا گروپ پورے زور و شور سے ان کے استقبال کے لیے تیار تھا آج خلاف معمول کم طالب علم ہمارے ہاتھ چڑھے تھے اس لیے وقار دل کی بھڑاس نکال رہا تھا اچانک کچھ دیر تک ان کی آواز سنائی نہ دی تو میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ دونوں ایک نئی آنے والی لڑکی کو گھیرے ہوئے تھے چند دیگر لڑکے اور لڑکیاں بھی نیک کام میں شرکت کے لیے آن دھمکے تھے' میں سنگی بینچ کے ساتھ ٹیک لگا کر ادھر دیکھنے لگا لڑکی بیچاری گھبرائی ہوئی سی تھی اور اپنے آپ میں سمٹی جا رہی تھی۔ وقار نے رنگ والا پیکٹ کھولا چلو محترمہ آپ کو رنگ برنگا کر دیں۔ اسی دوران ایک لڑکے نے اس کے ہاتھ سے بیگ چھین کر تلاشی لینا شروع کر دی۔

"ارے باپ رے، یہ پستول کی گولیاں لیے پھرتی ہے۔" اس نے پہلے سے موجود اپنے ہاتھ میں کارتوس دکھاتے ہوئے کہا۔

"دہشت گرد، دہشت گرد۔" سب چلائے۔

"اس نے خودکش جیکٹ بھی پہنی ہوگی چلو تلاشی لو۔" فرقان بولا۔

لڑکی کا رنگ خوف سے سفید پڑ گیا اور اسی لمحے مجھ پر ایک انکشاف ہوا مجھے برسوں پہلے ٹریفک حادثے میں مرنے والی اپنی اکلوتی بہن کا چہرہ دکھائی دیا۔ یہ کیسا اتفاق تھا' کتنی مشابہت تھی میرے دل میں جیسے درد سا اٹھا۔

وہ بالکل ویسے ہی سہمی کھڑی تھی اس کی موٹی موٹی خوب صورت آنکھیں نروس انداز میں پھیلی ہوئی تھیں میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"رک جاؤ جانے دو اسے۔" میں نے دبنگ لہجے میں کہا۔ سب نے چونک کر میری طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

"کیا مصیبت ہے یار دانیال۔" وقار الجھ کر بولا



"کیوں جانے دیں۔"

"میں کہہ رہا ہوں جانے دو تو بس جانے دو۔" میرا لہجہ سرد ہو گیا۔ میں طلبا یونین کا صدر تھا۔ یونیورسٹی کے سرگرم اسٹوڈنٹس میں میرا شمار ہوتا تھا۔ تحریر و تقریر اور کھیل کے کئی میدانوں میں یونیورسٹی کو فاتح بنایا تھا اساتذہ و طلبا تقریباً سبھی سے مجھے ہمیشہ احترام ہی ملا تھا۔ وقار نے رنگ کا پیکٹ ایک طرف پھینک دیا۔ دوسرے لوگ بھی ادھر ادھر کھسکنے لگے۔ وہ دو قدم چل کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"شکریہ بھیا!" وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے ساتھ ہی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ تیزی سے مڑی اور دور ہوتی چلی گئی۔

"بھیا کہہ گئی وہ آپ کو محترم بھائی جان۔" وقار نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"یار دانی تجھے کیا ضرورت تھی شہزادہ سلیم بننے کی وہ تیری انار کلی نہیں بننے والی۔ فرقان نے بھی حصہ ڈالنا مناسب سمجھا مگر میں کہیں اور کھویا ہوا تھا۔

"بھیا۔" میں نے سرور بھرے انداز میں دہرایا۔

"کتنی اپنائیت اور مان ہے نا اس لفظ میں۔

ہائیں۔" وقار کا منہ کھل گیا۔

"ابے کاٹھ کے الو کیا بک رہا ہے تو؟"

"یار اس کی کوئی بہن نہیں ہے نا، تو ایسا کرا سے اپنی بہن دے دے فرقان نے اپنے مخصوص اسٹائل میں وضاحت کی۔ اس سے پہلے کہ وقار جوتا اتارتا وہ رفو چکر ہو چکا تھا۔

"یار دانیال! کیا ہو گیا ہے تجھے۔ سارا پلان خراب کر دیا۔" وقار پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ "بس میرے دوست، مجھ سے اس کی بے بسی نہیں دیکھی گئی مجھے اس لڑکی میں اپنی بہن کی صورت نظر آتی ہے۔"

"دھت تیرے کی۔" وقار اچھلا۔ "اللہ کو حاضر جان کر کہتا ہوں دانی تو بس کسی اچھے سے مینٹل اسپتال کا پتا کر تیرے علاج کا سارا خرچہ میں برداشت کروں گا۔" جواباً میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی شاید سیانے فرما گئے ہیں یا کسی نے بے پر کی اڑائی ہو گی کہ کمان سے نکلا تیر اور زبان سے نکلی بات کبھی واپس نہیں آتے۔ دور جدید کے مطابق ہم کمان اور تیر کی جگہ بندوق سے نکلی گولی بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال شام کو جب میں اسپتال پہنچا تو وقار اور فرقان نے پورے اہتمام کے ساتھ لڑکوں کو کہانی سنا رکھی تھی۔ سب سے پہلے صائم جھجکتا ہوا آیا۔

''دانیال بھائی...... آپ کی مسروقہ بہن مل گئی۔''
''مسروقہ بہن؟''میں نے اسے گھورا۔
''وہ وقار بھائی نے کہا، میرا مطلب ہے فوت شدہ بہن۔''
''صبح تمہاری تقریر ہے نا۔''میں نے پوچھا۔
''جی بھائی، تو پھر دفع ہو جاؤ اور تیاری کرو۔''میں دھاڑا وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا باہر دروازے پر کھڑے ہوئے لڑکوں کے قہقہے بلند ہوئے۔ میں دل ہی دل میں مسکرادیا رات کو جب سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو پھر اس کا معصوم چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ ایک مدہم سی سرگوشی ابھری۔
''شکریہ بھیا۔''وہ حیرت انگیز طور پر میری مرحومہ بہن کی ہم شکل تھی اور اس بات نے مجھے بے چین کر دیا تھا میں اس کے سر پر ہاتھ رکھنا چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔
ایک بھائی کے تمام تر جذبے اس پر لٹانے کی خواہش شدت سے ابھر رہی تھی اور پھر رات کے کسی پہر میری آنکھ لگ گئی، اگلی صبح نہایت روشن تھی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی اس لیے دھوپ بھلی لگنے لگی تھی۔ لیکچر کے بعد میں کرسی پر بیٹھا جھول رہا تھا کہ کوئی دھیرے سے پاس آ کر کھڑا ہو گیا میں نے حسب عادت بند آنکھوں سے ہی پوچھا۔
''چلو اب پھوٹ بھی پڑو کون ہو۔''
''السلام علیکم بھیا۔''دھیمی سی آواز آئی۔
میں چھپاک سے اٹھ کھڑا ہوا۔''وہ دراصل میں سمجھا تھا شاید......''مجھے فوراً کچھ نہ سوجھا کہ کیا کہوں۔
''کوئی بات نہیں بھیا آپ بیٹھیے پلیز۔''وہ بڑی متانت کے ساتھ بولی اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
''کیسے ہیں دانیال بھیا؟''
''اچھا ہوں، تو آپ نے میرا نام بھی معلوم کر لیا۔''میں نے شوخی سے کہا۔
''بھیا! یہاں ہر طرف آپ کا نام ہی تو ہے لیکن مجھے وقار بھائی نے بتایا۔''
''وقار نے......!''میں چونک پڑا۔
''جی وہ ملے تھے مجھے۔ کل کے لیے سوری کہہ رہے تھے۔''
''واہ۔''مجھے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔
''آپ نے میرا نام تو پوچھا نہیں۔''بڑے لاڈ سے شکوہ کیا گیا۔
''آپ نے تو میرے دوست سے پوچھ لیا اب میں آپ کی کوئی سہیلی دیکھتا ہوں۔''
''نہیں بھیا آپ خود پوچھیں۔''
''تو کیا پوچھے بنا نہیں بتاؤ گی؟''مجھے اسے چھیڑنے میں مزہ آ رہا تھا۔
''نہیں بھیا آپ پوچھیں نا۔''وہ بچوں کی طرح مچلی۔
''اچھا چلو بتاؤ آپ کا پیارا سا نام کیا ہے۔''میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
''مدیحہ۔''اس نے یوں معصومیت سے یوں کہا جیسے دھماکا کر رہی ہو جیسے اسامہ بن لادن کا نام بتا رہی ہو۔
''خوب صورت نام ہے۔''میں بے اختیار کہہ اٹھا۔
''بھیا! ایک بات پوچھوں۔''وہ اچانک سنجیدہ سی ہو گئی۔
''ضرور پوچھو۔''
''کیا میں واقعی آپ کی بہن کی طرح دکھتی ہوں۔''لہجے میں اشتیاق جھلک رہا تھا۔
''آپ کو کس نے بتایا؟''میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بھیا پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے دوبارہ آپ کہہ کر مخاطب مت کیجیے گا۔ دوسری یہ کہ آپ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں۔ میں نے بتایا تو ہے کہ وقار بھائی مجھے ملے تھے۔"

"اوہو، مجھے یاد نہیں رہا۔" میں نے گہری سانس خارج کی۔

"بتائیں نا کیا واقعی ایسا ہے۔" وہ دوبارہ مچلی۔

"ہاں ایسا ہی ہے۔" میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"مطلب میں آپ کی بہن ہوں' ہے نا بھیا۔" میں بہن ہوں نا آپ کی؟ اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ نیلم بھی مجھے ایسے ہی جھنجوڑا کرتی تھی۔

"ہاں مدیحہ تم میری بہن ہو۔" میرے حلق میں جیسے آنسوؤں کا گولہ اٹک گیا۔ نیلم کی وفات کے کتنا عرصہ بعد مجھے بہن کا لمس ملا تھا۔ میں کیسے مارا مارا پھرتا رہا تھا اور آج مدیحہ نے اس مقدس رشتے کے زنگ آلود دروازے پر پھر سے دستک دے دی تھی۔

"بھیا! آپ رو رہے ہیں۔" اس نے شکی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں مسکرایا۔

"ارے اتنی اچھی میری بہن میرے پاس ہو تو بھلا رونے کی کیا ضرورت ہے۔"

اور وہ واقعی بہت اچھی تھی۔ مدیحہ کیا آئی میری زندگی میں بہار آگئی۔ میں اسے اپنی والدہ سے ملوانے گھر لے آیا تو وہ بھی اسے دیکھ کر مبہوت رہ گئیں۔ جیسے اپنی بیٹی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں اس نے مجھے بہن کا اتنا پیار دیا کہ میں سرشار ہو کر رہ گیا۔ ہاسٹل میں سارے کام وہ آ کر کرنے لگی۔ کھانا بنانے سے لے کر جوتے پالش کرنے تک کی ذمہ داری مدیحہ نے یوں سنبھال لی گویا یہ سب اس کا اولین فرض ہو وہ ہر دوسرے دن میری والدہ سے ملنے جاتی اور گھنٹوں ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ پھر ایک دن...... سب کچھ ختم ہو گیا میں یہ سطور لکھ رہا ہوں' مجھے کراہت آ رہی ہے خود سے میں لکھنا نہیں چاہتا' مجھے بہت جلدی کہیں جانا ہے یہ لکھتے ہوئے تو بہت دیر ہو جائے گی مگر لکھنا ضرور ہے کہ اس طرح میری روح کو تسکین ملے گی جب پڑھنے والے مجھ پر تف کہیں گے' جب ہر شخص کی لعنت میرا تعاقب کرے گی جب مجھے شیطان درندہ اور کمینہ صفت کے نام سے یاد کیا جائے گا تو شاید مجھے کچھ سکون مل جائے۔ اس لیے لکھنا ضروری ہے۔

وہ جنوری کی سرد شام تھی۔ یونیورسٹی میں کوئی تقریب تھی میری طبیعت صبح سے کچھ عجیب سی ہو رہی تھی وقار اور فرقان وغیرہ مجھے لینے کے لیے آئے مگر میں نے انکار کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے الماری سے امپورٹڈ شراب کی بوتل نکالی' جو میں آج

اندھا شوہر اور بدصورت بیوی

لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی کی ایک لڑکی نہایت بدصورت تھی اور وہ جوان ہو گئی تھی۔ مال سامان کے باوجود کوئی اس سے نکاح کرنے کی رغبت نہیں کرتا تھا (بدصورت دلہن کے اوپر اعلیٰ ریشمی لباس بھی بُرا معلوم ہوتا ہے) الحاصل ضرورت کی وجہ سے مجبور ہو کر ایک اندھے کے ساتھ اس لڑکی کا نکاح کر دیا۔ کہتے ہیں کہ ایک مشہور حکیم ان ہی دنوں جزیرہ لنکا سے وہاں آیا تھا' جو اندھی آنکھوں کو اپنے علاج سے روشن کرتا تھا لوگوں نے اس آدمی سے کہا کہ تم بھی اپنے داماد کا علاج کرا لو۔ اس نے جواب دیا: میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بینا (دیکھنے والا) ہو کر میری بیٹی کو طلاق دے دے۔ (گلستان ص ۱۰۲)

فائدہ: دنیوی معاملات میں بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔
مرسلہ: شمع عندلیب...... حیدر آباد

ہی لے کر آیا تھا یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا کبھی کبھار چوری چھپے ایسا چلتا تھا میں نے نصف بوتل حلق سے نیچے اتاری اور بیڈ پر لیٹ گیا نشہ سر چڑھنے لگا' سرور میں دماغ گھوما تو بقیہ بوتل بھی خالی کردی اسی لمحے دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔

''ارے بھیا! آپ ادھر ہیں میں کہاں کہاں ڈھونڈتی آرہی ہوں آپ نے چلنا نہیں تقریب میں۔'' مدیحہ کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میرے کانوں میں جیسے گھنگھرو بج اٹھے۔ دین اسلام نے شراب کو ایسے نہیں حرام قرار دیا یہی اس چیز کی غلاظت ہے انسان کو حیوان بنادیتی ہے نجانے کہاں لے جاتی ہے۔ اپنے پرائے کی تمیز بھلا دیتی ہے اگلے لمحے دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا میں نے مدیحہ کو بھوکی نظروں سے دیکھا۔ سب رشتے ذہن سے نکل گئے تھے۔ وہ پہلے بھی میرے پاس آتی تھی میں اتنا گرا ہوا اور کمزور نہیں تھا میں نے بہن مانا تھا اسے مگر تب یہ ام الخبائث میرے پیٹ میں نہیں ہوتی تھی۔ آج اس کا نشہ مجھے گمراہیوں کے جہان میں لے گیا تھا۔ میں نے اسے شانوں سے پکڑا اور بیڈ پر گھسیٹ لیا مجھے کچھ دیا نہیں اس کی آنکھوں میں کیسا تاثر ہو گا وہ رشتوں کے اس روپ پر ہکا بکا رہ گئی ہوگی۔ وہ چیخی ہوگی۔ چلائی ہوگی مگر میں نے اسے نوچ ڈالا...... اعتماد کا خون کردیا یقین کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ بھروسے اور بھرم کے ٹکڑے کر ڈالے، وہ معصوم پری جس نے مجھے بھائی سمجھ کر اپنے دل کے سنگھاسن پر بڑی شان اور مان سے بٹھایا تھا مگر میں نے خود کو وہاں سے گرا دیا۔ بہکاوے کے چند لمحے تھے۔ جو سب کچھ بہا کر لے گئے۔ اپنے جرم کی سنگینی سے بے خبر نشے میں بے سدھ...... میں بستر پر پڑا تھا مجھے کسی نے زور سے ہلا کر جگایا تھا نشہ اتر چکا تھا آنکھ کھلی تو ایک دم سے سب یاد آ گیا۔ دل شدت سے دھڑکا جیسے ابھی پسلیوں سے باہر آ جائے گا۔ کمرہ طلبا سے بھرا ہوا تھا جس میں لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل تھے۔

پہلا خیال آیا تو کیا یہ سب مجھے سنگسار کرنے آئے ہیں؟ مجھ پر لعنت بھیجنے آئے ہیں؟ میرا گناہ سب نے جان لیا۔ میں نے بیڈ پر نظر دوڑائی چادر پر ایک شکن بھی نہیں تھی شراب کی بوتل غائب تھی میرے منہ سے بدبو کے بھبھکے اڑنے کی بجائے مجھے خوشبو سی محسوس ہوئی۔ میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا میں دھیرے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''دانی یار! کتنے بے ہوش ہو کر سوتے ہو تم، جلدی اٹھو مدیحہ نے خودکشی کرلی ہے۔'' وقار کی چلاتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''کیوں؟'' میں نے کہنا چاہا مگر زبان نے بولنے سے انکار کردیا بس ویران نظریں وقار کے چہرے تک پہنچ کر رک گئیں۔ وقار نے ترحم آمیز نگاہ سے مجھے دیکھا، دیگر لوگوں کے چہرے پر بھی ہمدردی کے آثار تھے وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید میں صدمے سے سنبھل نہیں پارہا اسی وقت مجھے اندازہ ہوا کہ کسی کو کچھ پتا نہیں، ورنہ وہ یوں مجھے ہمدردی اور پیار سے نہ دیکھ رہے ہوتے مگر پھر وہ شراب کی بوتل...... وہ بستر کی بری حالت کس نے سنواری، وقار نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔

اسی لمحے میری نظر تکیے کی طرف گئی۔ وہاں ایک کاغذ تہہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ میں بے ضمیر انسان...... اس کو منوں مٹی تلے دفن کر آیا۔ میرا پتھر دل لوگوں کی مختلف باتیں سنتا رہا اس معصوم لڑکی پر جسے میں نے اپنی بہن کہا تھا ہر کوئی اپنی مرضی سے تبصرے کر رہا تھا۔ میں منافق انسان...... اس کی ماں کو تسلیاں دیتا

رہا۔ کسی بے جان رشتے کی طرح ہمدردی کے دو بول بھی نہ کہہ پایا۔

پھر اپنے گھر پہنچ کر میں نے کسی چور کی طرح دروازہ اندر سے بند کیا کھڑکیوں کے پردے آگے کیے اور وہ کاغذ کھولا تحریر مدیحہ کی ہی تھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی۔

''دانیال بھائی خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے گا میری غلطی بہت بڑی ہے مجھے کیوں نہ پتا چلا کہ میرے بھیا شراب جیسی بری لت میں پڑ چکے ہیں میں نے اپنے بھیا سے غفلت برتی تو خدا نے مجھے اس کی سزا دی۔ بھیا آپ مجرم نہیں آپ میرے بھائی رہو گے۔ مجرم وہ شراب ہے جس نے آپ کو بہکایا۔ میں ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں تاکہ مجھے دیکھ کر میرے بھیا کو نظر نہ جھکانی پڑے اور ہاں بھیا میں نے پورے روم کی صفائی کر دی ہے آئندہ آپ شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے یہ میرا حکم ہے مجھے معاف کر دینا بھیا۔''

کاغذ میرے ہاتھ میں ہلکا سا لرزا آنسو تو بہت پہلے خشک ہو چکے تھے اور اب میں اپنی بہنا کے پاس جا رہا ہوں مجھے اس سے معافی مانگنی ہے یہ راز جب کھلے گا تو میں ان کے پاس پہنچ چکا ہوں گا۔ الوداع میرے دوستو، میں تم سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ میں وہ دانیال نہیں جو آپ کا دوست تھا الوداع دوستو......الوداع......!

☆......☆☆......☆

وقار نے سرد آہ بھر کر ڈائری ایک طرف رکھ دی اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

''عمر بھائی! یہ راز ہے مدیحہ اور دانیال کی یکے بعد دیگرے موت کا۔''

''یہ ڈائری تمہیں کہاں سے ملی؟'' مجھے اپنی آواز میں نمی سی محسوس ہوئی۔

''میرے بیگ سے پتا نہیں دانیال نے وہاں کب اور کیسے رکھی؟'' وقار نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

''تمہارے سوا کسی اور کو اس کا علم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی۔'' اس نے شکایتی انداز میں مجھے دیکھا۔ ''میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''تو پھر سنو، یہ ڈائری لکھنے کا مقصد دانیال کے نزدیک یہ ہوگا کہ لوگ اس کی غلطی سے سبق حاصل کر لیں ورنہ وہ کبھی اپنا یہ راز تحریر نہ کرتا اور اگر اس نے یہ بات راز رکھنا ہوتی تو وہ کبھی اس دنیا کو الوداع نہ کہتا میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔'' میں نے وقار کو تائیدی نگاہوں سے دیکھا مگر وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔

''میں اس راز کو کہانی کی شکل دوں گا۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھی تاکہ دانیال کی خواہش کے مطابق کوئی دوسرا اس جیسی غلطی نہ کرے۔

''جیسا آپ بہتر سمجھیں عمر بھائی۔'' وقار اٹھ کھڑا ہوا۔ ''دانیال بھائی کے بعد آپ ہی کو اس کی جگہ لینی ہے۔''

اور اس رات میں نے دانیال کو خواب میں دیکھا وہ مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہا تھا ''اے عمر، اللہ تیری عمر دراز کرے، تو نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔''

نظم قدرت

حسام بٹ

علم نجوم (ASTROLOGY) ایک حسابی سائنس ہے جو کسی بھی انسان کے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے اوسطاً ستر فیصد تک درست معلومات فراہم کرتا ہے کسی بھی معاملے کا صد فیصد درست علم صرف خالق کائنات کے پاس ہے۔ سورج، چاند، ستارے اور سیارے قدرت کے مقررہ کر راستوں پر اپنے اپنے مدار میں محو سفر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان اجرام فلکی کو انسان کی آزمائش پر مامور کر رکھا ہے۔ یہ اللہ کے حکم پر اپنی مخصوص گردش سے وقت کو سازگار اور ناسازگار بنا دیتے ہیں۔ علم نجوم اچھے اور برے وقت کی نشاندہی کرتا ہے وقت ہمیشہ آگے کی سمت سفر کرتا ہے اور گزرا ہوا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا اچھے وقت کی قدر کر کے اسے اپنے لیے مفید بنانا اور برے وقت سے بچاؤ کی منصوبہ بندی کر کے خود کو نقصان سے محفوظ رکھنا انسان کے اختیار میں ہے۔ اپنے اس اختیار کا بر محل استعمال ہی شیوہ انسانی ہے، بے شک انسان اشرف المخلوقات ہے۔

دکھ سکھ سے عبارت زندگی کی ایک کہانی، ماہر علم نجوم وسیم قریشی کی ڈائری سے ایک ورق، نئے افق کے قارئین کی تفریح طبع کے لیے۔

منگل کے روز جو شخص مجھ سے ملنے آیا اس نے سفاری سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ چالیس کے اریب قریب قائم کیا وہ متناسب قد و قامت کا مالک تھا جسم قدرے مائل بہ فربہی اپنی وضع قطع اور حلیے سے وہ کوئی بزنس مین دکھائی دیتا تھا لیکن ازاں بعد مجھے پتا چلا کہ وہ ایک میڈیکل اسٹور چلاتا تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا۔ ”جی فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میرا نام سجاد علی ہے۔“ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ”اور بابو بھائی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

”کون بابو بھائی؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”مشتاق بابو۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جو اسپیئر پارٹس کا بزنس کرتے ہیں اور جن کے چھوٹے بھائی اشفاق کو آپ نے ساؤتھ بھی بجھوایا تھا۔ میرا مطلب ہے ساؤتھ افریقا۔“

”اچھا..... وہ بابو بھائی۔“ مجھے یاد آ گیا کہ وہ کس بابو کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں کوئی ریکروٹنگ ایجنٹ نہیں ہوں میں نے بابو مشتاق کے چھوٹے بھائی کو ساؤتھ افریقا نہیں بجھوایا تھا۔“

”وہ جی.....!“ وہ گڑ بڑا گیا۔ ”مم..... میرا مطلب ہے وہ آپ کے مشورے کی روشنی میں ساؤتھ افریقا گیا تھا۔“



''ہاں، یہی درست ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔
''اشفاق کے پاس تین آپشن تھے ملائشیا، اٹلی اور ساؤتھ افریقا اس کے زائچے کے مطابق مجھے اس کا ساؤتھ افریقا جانا زیادہ سود مند نظر آیا لہٰذا میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ساؤتھ افریقا کا رخ کرے اس نے وہاں پہنچ کر مجھے فون بھی کیا تھا وہ ادھر جوہانسبرگ میں کام کر رہا ہے اور کافی خوش بھی ہے۔''
''خوش اور کامیاب جناب۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔
''آپ کے مشورے نے اس کی زندگی بنا دی ہے۔ میں بھی آپ کے پاس ایک مشورہ کرنے ہی آیا ہوں۔''
''اوہ اچھا۔'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''کیا آپ بھی پاکستان سے باہر جا کر اپنی قسمت آزمانا چاہتے ہیں؟''
''نہیں جناب، میرا مسئلہ دوسری نوعیت کا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔
''جی پلیز اپنے مسئلے کی نوعیت بتائیں؟'' میں سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''اور اس سے بھی اپنی تاریخ پیدائش نوٹ کرا دیں۔''
اس نے مجھے اپنی ڈیٹ آف برتھ بتائی پھر بولا۔
''قریشی صاحب میں اپنی بیوی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔''
''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''اپنی بیوی کا نام اور تاریخ پیدائش بھی نوٹ کرا دیں۔'' اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔
میں نے سجاد علی اور اس کی اہلیہ صوفیہ کے زائچے تیار کر کے ان کا پرنٹ آؤٹ اپنے سامنے رکھ لیا پھر گہری نظر سے دونوں کے زائچوں میں سیاروں کی پوزیشن اور نظرات کا جائزہ لینے لگا۔ چند لمحات کی اسٹڈی کے بعد میں نے کہا۔
''سجاد صاحب کیا آپ کی بیوی گہری سانولی رنگت کی ہے۔''
''جی، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
''صوفیہ کے طالع پیدائش (ASCENDANT) میں زحل اور یورنس براجمان ہیں۔'' میں نے بدستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کسی بھی زائچے کے طالع میں زحل کی موجودی رنگت کو دباتی ہے اور حامل زائچہ کو ایسی شخصیت عطا کرتی ہے۔ جس کے قریب جانے سے لوگ خائف رہتے ہیں۔ انہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شخص بہت مغرور ہوگا اور اگر انہوں نے اس سے میل ملاقات بڑھانے کی کوشش کی تو وہ انہیں دھتکار دے گا۔''
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''صوفیہ کی شخصیت کا کچھ ایسا ہی تاثر ہے نئے لوگ اس کے قریب آنے سے کتراتے ہیں۔''
''اور......اور......!'' میں نے صوفیہ کے زائچے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ''طالع میں اگر یورنس بیٹھا ہو تو وہ بے ڈھنگا موٹاپا بھی لاتا ہے اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ کی بیوی کا جسم اور وزن حدود و قیود کو پھلانگتا نظر آتا ہے۔''
''آپ بالکل غلطی پر نہیں ہیں جناب۔'' وہ قدرے جذباتی ہوگیا۔ ''آپ کا علم مجھے حیران کر رہا ہے۔ صوفیہ واقعی اسی من کی دھوبن دکھائی دیتی ہے۔''
''میرا علم کہتا ہے کہ صوفیہ کے ساتھ شوگر کا ایشو بھی ہے۔'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''اس کے زائچے کا چھٹا گھر واٹر سائن ہے یعنی آبی برج ہے اور وہاں زہرہ (VENUS) قابض ہے ایسی صورت حال میں حامل زائچہ کو شوگر لازمی ہو جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں صوفیہ کی صحت کے معاملات کی وجہ ہی سے آپ پریشان ہیں۔''

''قریشی صاحب آپ نے صوفیہ کے جن مسائل کی نشان دہی کی ہے میں ان سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ تھوڑا سا آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔ ''لیکن وہ جو میں نے شروع میں کہا کہ میں اپنی بیوی کی وجہ سے پریشان ہوں تو یہ کوئی دوسرا معاملہ ہے۔''

''دوسرا معاملہ۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''میں بتاتا ہوں جناب۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''صوفیہ نے میری زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا ہے میں اس سے جان چھڑانا چاہتا ہوں لیکن کوئی طریقہ، کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا، اگر میں مزید کچھ عرصہ اس عورت کے ساتھ رہا تو میں خودکشی کرلوں گا اور یا پھر اس کا گلا گھونٹ ڈالوں گا۔''

''اوہ......!'' میں تشویش بھری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''گویا صوفیہ آپ کو تنگ کرتی ہے؟''

''کوئی ایسا ویسا تنگ۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''آپ میری اذیت کا تصور نہیں کر سکتے۔''

''آٹھ سال۔'' اس نے بتایا۔

''آپ کے کتنے بچے ہیں؟''

''ایک بیٹا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کا نام کامران ہے۔ کامران کی عمر سات سال ہے۔''

''کیا صوفیہ کا ابتدا ہی سے آپ کے ساتھ یہ ناروا رویہ ہے یا وہ بعد میں ایسا سلوک کرنے لگی ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

میں سجاد علی سے سوال و جواب کے دوران ان دونوں میاں بیوی کے زائچوں پر بھی غور کر رہا تھا۔ اس نے بتایا۔

''قریشی صاحب، شروع میں تو سب ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے بیچ نوک جھونک کا سلسلہ چلتا رہتا تھا لیکن کبھی ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی کہ مجھے اس سے نفرت ہو جائے آپ یقین کریں میں بڑے مشکل حالات سے گزر رہا ہوں۔''

''مجھے بڑی حد تک آپ کی پریشانی کا اندازہ ہے سجاد صاحب۔'' میں نے اس کے زائچے کی اسٹڈی کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا شمسی برج جدی (CAPRICON) ہے جدی افراد بڑے اصول پسند اور نظم و نسق کے پابند ہوتے ہیں اور دوسروں سے بھی ایسے ہی رویے کی توقع کرتے ہیں لیکن جب سامنے والے سے انہیں متوقع مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے تو انہیں سخت کوفت ہوتی ہے علاوہ ازیں آپ کا قمری برج ثور (TAURUS) ہے۔ قمر کو ثور میں شرف حاصل ہوتا ہے جس کے سبب آپ بہت زیادہ رومانٹک اور شاعرانہ مزاج کے حامل شخص ہیں۔ اس نکتے نے آپ کی حساسیت میں بے پناہ اضافہ کر رکھا ہے۔ کوئی چھوٹی موٹی خلاف مزاج بات بھی بہت زور کی لگتی ہے جبکہ......!'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جبکہ صوفیہ کا شمسی برج سرطان (CANCER) ہے اس برج سے تعلق رکھنے والوں کی ہزاروں خوبیاں اپنی جگہ لیکن یہ لوگ زود رنج اور شکی مزاج بھی ہوتے ہیں صوفیہ کا قمری

برج......!"

"یہ کی نا آپ نے حق سچ بات۔" وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"قریشی صاحب اللہ آپ کا بھلا کرے صوفیہ کی شکی طبیعت نے ہی میری زندگی کو نمونہ جہنم بنا رکھا ہے وہ میرے کردار پر شک کرتی ہے اسے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ میں کسی اور عورت میں دلچسپی لے رہا ہوں اور اس عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور حقیقت کیا ہے سجاد صاحب۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"کک...... کیا مطلب......!" وہ گڑبڑا گیا۔

"میں نے کوئی راکٹ سائنس کا مشکل فارمولا آپ کے سامنے نہیں رکھ دیا؟" میں نے اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔"میں نے سیدھا یہ پوچھا ہے کہ کیا آپ دوسری شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں جناب۔" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"یہ محض صوفیہ کے ذہن کا فتور ہے۔"

"ذہن کا فتور یا سماعت کا جھول۔" میں نے زیر لب دہرایا۔"ان میں سے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں قریشی صاحب۔" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"سجاد صاحب اگر آپ نے تھوڑی دیر پہلے مجھے میری بات پوری کرنے دی ہوتی تو پھر آپ قطعاً ناسمجھی کا اظہار نہ کرتے۔"میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا"میں آپ کو صوفیہ کے ایک خاص وصف سے آگاہ کرنے جارہا تھا آپ نے میرا جملہ قطع کردیا تھا۔"

"آئی ایم ویری سوری قریشی صاحب۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔"میں تہہ دل سے معافی چاہتا ہوں آپ پلیز اپنی بات مکمل کریں۔"

"میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ صوفیہ کا قمری برج بادی خاصیت کا حامل ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا جب کسی شخص کا (MOON) کسی (AIR SIGN) میں ہوتا ہے تو اس کے مزاج میں بے حد تلون آجاتا ہے اور وہ کانوں کا کچا بھی ثابت ہوتا ہے مجھے لگتا ہے صوفیہ جو آپ پر شک کرتی ہے تو اس کے پیچھے کسی کی فیڈنگ بھی ہوسکتی ہے۔"

"ہوسکتی ہے نہیں بلکہ صد فیصد ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"کس کی فیڈنگ ہے؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"نگینہ بیگم کی۔" اس نے ترت جواب دیا۔

"کون نگینہ بیگم۔"

"میری ساس یعنی صوفیہ کی والدہ۔" اس نے بتایا۔

"اوہ......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی ساس کو آپ سے کیا مخاصمت ہے؟"

"نگینہ بیگم مجھے زیادہ پسند نہیں کرتی۔"

"پھر یہ شادی کیسے ہوگئی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"جہاں میری شادی کا تعلق ہے تو اس میں میرے مرحوم سسر صمد بخاری نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ویسے اگر حقیقت پسندی کی نگاہ سے دیکھا

جائے تو یہ شادی کم اور ایک کاروباری ڈیل زیادہ تھی۔''
''کاروباری ڈیل۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''سجاد صاحب میں کچھ سمجھا نہیں۔''
''میں سمجھتا ہوں جناب۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔
''آپ نے صوفیہ کا زائچہ بنایا ہے لہٰذا آپ اس کی شخصیت کے بارے میں اچھی طرح جان چکے ہوں گے ایسی لڑکی کے لیے رشتہ آسانی سے نہیں ملتا۔ موٹی، بھدی اور کالی لڑکیاں اچھے رشتے کے انتظار میں بیٹھی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ اگر میں صوفیہ کو اپنانے کے لیے تیار ہوا تھا تو یہ میرا اس پر کوئی احسان نہیں تھا کیونکہ اس شادی کے نتیجے میں میرا بھی ایک فائدہ ہونے والا تھا۔''
''کیسا فائدہ۔'' وہ رکا تو میں نے سوال داغ دیا۔
''میں شادی سے پہلے کسی دوسرے شخص کے میڈیکل اسٹور پر بطور سیلز مین کام کرتا تھا اور میری تنخواہ معمولی سی تھی گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا میں کیمسٹ اینڈ ڈرگسٹ کی فیلڈ کے تمام اسرار و رموز سے اچھی طرح آگاہ تھا اور میں نے بی فارمیسی کا کورس کر کے سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا تھا یعنی میں اپنا ذاتی میڈیکل اسٹور کھولنے کی پوزیشن میں آ گیا تھا لیکن بس ایک چیز سے مار کھا رہا تھا اور وہ چیز تھی پیسا میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ اپنا میڈیکل اسٹور کھول سکوں اور میری یہ مشکل صمد بخاری نے حل کر دی تھی۔''
وہ سانس ہموار کرنے کیلئے تھما تو میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا بلکہ بدستور اس کے چہرے پر نگاہ جمائے رکھی، وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔
''صمد بخاری صاحب نے میڈیکل اسٹور کھولنے کیلئے مجھے ایک دکان خرید کر دی اور اس کے بارے میں انہوں نے اپنے گھر میں کسی کو نہیں بتایا اور مجھے بھی صیغہ راز میں رکھنے کی تلقین کی تھی۔ ازیں علاوہ پانچ لاکھ کیش رقم میرے ہاتھ پر رکھی کہ میں کام شروع کر سکوں۔ بخاری صاحب کی اس نوازش کے بدلے میں مجھے ان کی بہتر جگہ سے ٹیڑھی صاحبزادی صوفیہ سے شادی کرنا تھی اور میں اس شادی کے لیے تیار ہو گیا۔''
''آپ نے بتایا کہ آپ کی شادی آٹھ سال قبل ہوئی تھی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
''کیا آپ کو نکاح کی تاریخ یاد ہے۔''
''جی بالکل یاد ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور تاریخ مجھے بتا دی۔
میں نے اپنے کمپیوٹر پر سجاد اور صوفیہ کے نکاح کا زائچہ تیار کر لیا پھر مذکورہ زائچے کا مطالعہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
''آپ نے بتایا کہ شادی کے بعد صوفیہ آپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا کرتی تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کے رویے میں تبدیلی آتی گئی اور اب حال یہ ہے کہ آپ کو اس کی شکل سے بھی نفرت ہو چکی ہے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس تبدیلی کا سبب کیا تھا؟''
''کوئی خاص سبب نہیں تھا جناب۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں جب تک صمد بخاری زندہ رہے صوفیہ میرے ساتھ نارمل سلوک کرتی رہی اور صمد بخاری کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ اپنی ماں کی پٹیوں پر چلنے لگی اور میری مخالفت پر اتر آئی پھر رفتہ رفتہ اس مخالفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔''
''کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ نگینہ بیگم اپنی بیٹی کا گھر

توڑنا چاہتی ہے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔
''نہیں۔'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔ ''نگینہ بیگم اپنی بیٹی کے گھر کو جوڑنا چاہتی ہیں۔''
''یہ کیا بات ہوئی سجاد صاحب میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اگر نگینہ بیگم صوفیہ کے گھر کو جوڑ کر رکھنے کی خواہش مند ہیں تو پھر صوفیہ آپ کے ساتھ برا سلوک کیوں کرتی ہے۔''
''جناب بات دراصل یہ ہے کہ نگینہ بیگم نے اپنے مقصد کے حصول کیلئے جو راہ اختیار کی ہے ساری خرابی اسی کے سبب ہو رہی ہے۔'' وہ گمبھیر انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔
''اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ صوفیہ جس شکل وصورت اور قامت وجسامت کی مالک ہے بغیر کسی بڑے لالچ کے کوئی شخص اس کے ساتھ زندگی گزارنے کو تیار نہیں ہو سکتا۔ میں بھی پیسوں اور دکان کے لالچ میں اس شادی کے لیے آمادہ ہوا تھا لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے۔''
''حالات میں کیا بدلاؤ آیا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔
''پچھلے آٹھ سالوں میں میں نے جان توڑ محنت کر کے اپنے کاروبار کو جما لیا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اب مجھے کسی سے مالی مدد لینے کی ضرورت نہیں اور یہی بات نگینہ بیگم کو کھلتی ہے کہ اب میں ان لوگوں کا محتاج نہیں رہا اس دوران میں، میں نے صمد بخاری سے لیا ہوا پانچ لاکھ کا قرض بھی اتار دیا ہے۔''
''جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن صمد صاحب کے انتقال کے بعد نگینہ نے کئی بار مجھے طعنہ دیا کہ اگر صمد مجھے وہ پانچ لاکھ نہ دیتا تو میں آج بھی کسی میڈیکل اسٹور پر نوکری کر رہا ہوتا صوفیہ نے بھی اٹھتے بیٹھتے مجھے یہ یاد دلانا اپنا فرض سمجھ لیا تھا کہ اگر اس کے باپ نے میرا ہاتھ نہ پکڑا ہوتا تو میں آج بھی زیرو ہی ہوتا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ ماں بیٹی دکان کی ملکیت والے راز سے واقف نہیں تھیں ورنہ میری مٹی پلید ہو جاتی۔ میں گھر کے ماحول کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے وہ پانچ لاکھ تھوڑے تھوڑے کر کے نگینہ بیگم کو لوٹا دیے پھر نگینہ بیگم نے پینترا بدلا اور ایک نئے انداز میں اپنی بیٹی کے کان بھرنے لگی۔''
''کون سا نیا انداز؟'' میں نے پوچھا۔
''نگینہ صوفیہ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو چکی ہے کہ میں اس میں دلچسپی نہیں لیتا بلکہ کسی دوسری عورت کے چکر میں ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''صوفیہ کے ذہن میں یہ بات نقش ہو چکی ہے کہ میں دوسری شادی کا منصوبہ بنا رہا ہوں اس سلسلے میں اس نے ایک کردار بھی نامزد کر دیا ہے۔''
''کردار...... کیا مطلب؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔
''شمائلہ نامی ایک عورت میرے اسٹور سے اکثر دوا لینے آتی ہے۔'' سجاد نے بتایا۔ ''صوفیہ کو یقین کی حد تک یہ شک ہے کہ میرا شمائلہ کے ساتھ کوئی سنجیدہ چکر چل رہا ہے اور عنقریب ہم شادی کرنے والے ہیں۔ ان من گھڑت قصے کو لے کر صوفیہ نے اپنا دماغ خراب کر رکھا ہے اور میری زندگی کو بھی سپرد عذاب کر دیا ہے گھر میں صبح وشام لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ اس ماحول کا ننھے کامران کے ذہن پر بھی برا اثر پڑ رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ صوفیہ کا کیا کروں، سمجھانے بجھانے اور صفائیاں پیش کرنے کی تمام حدود کو میں عبور کر چکا ہوں اب تو یہی جی چاہتا ہے

کہ......!“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا ”کیا جی چاہتا ہے آپ کا؟“

”یہی کہ...... بد سے بدنام برا...... جہاں ستیا ناس وہاں سوا ستیا ناس۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”ایک بے بنیاد بات پر صوفیہ نے گھر کی فضا کو نمونہ جہنم بنا رکھا ہے تو کیوں نہ میں اس کے شک کو حقیقت کا لباس پہنادوں۔“

”مطلب دوسری شادی۔“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی بالکل۔“ وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔

”یعنی۔“ میں نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔ ”شمائلہ سے۔“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اپنے دل و دماغ میں شمائلہ کے لیے اچھی خاص اسپیس رکھتا تھا۔

”شمائلہ سے بھی ہوسکتی ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”ویسے بھی وہ بے چاری بہت مظلوم اور دکھی عورت ہے اسے سہارا دینا کار ثواب ہوگا۔“

”یعنی آپ شمائلہ سے شادی کے لیے ذہن بنا چکے ہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”بس ہلکے پھلکے فتوے کی ضرورت ہے۔“

”آسٹرولوجیکل فتویٰ۔“ وہ رازدرانہ انداز میں بولا ”میں اسی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ ذرا میرا زائچہ دیکھ کر بتائیں کہ دوسری شادی میرے لیے کیسی رہے گی۔“

ابتدا میں جب میں نے اس سے پوچھا تھا تو اس نے بڑی شدت کے ساتھ دوسری شادی سے انکار میں گردن ہلائی تھی لیکن اب آہستہ آہستہ اس کے

عزائم کھل کر سامنے آرہے تھے۔ میں نے اسے شرمندہ کرنا مناسب نہ سمجھا تاہم غیر محسوس طریقے سے اس کی گھسائی، منجھائی اور دھلائی جاری رکھی، میں نے ذو معنی انداز میں استفسار کیا۔

''صرف دوسری شادی یا شمائلہ سے شادی؟''

اس کی باچھیں کھل گئیں مسرور لہجے میں بولا۔ ''چلیں جی شمائلہ ہی کا بتادیں۔''

''شمائلہ کے بارے میں لب کشائی کرنے کے لیے بھی اس کا زائچہ بنانا پڑے گا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس مقصد کے لیے مجھے اس کی تاریخ پیدائش، جائے پیدائش اور وقت پیدائش کی ضرورت ہوگی۔''

''پیدا تو وہ کراچی ہی میں ہوئی تھی اور اس کی ڈیٹھ آف برتھ بھی مجھے معلوم ہے۔'' اس نے بتایا ''لیکن ٹائم آف برتھ میں ابھی اس سے پوچھ کر بتاتا ہوں آپ کو۔''

بات کے اختتام پر اس نے سیل فون پر کوئی نمبر پنچ کیا پھر فون کو کان سے لگالیا اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اس وقت شمائلہ سے رابطہ کر رہا تھا گویا شمائلہ کے ساتھ اس کے معاملات گہری نوعیت کے تھے لہٰذا اس حوالے سے اس کی بیوی کا شک غلط نہیں تھا۔ میں اگرچہ سجاد کی حالیہ غیر نصابی سرگرمیوں کی تہہ میں اتر چکا تھا لیکن میں نے اسے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا جس سے وہ خفت محسوس کرے۔

میرا پیشہ اس نوعیت کا ہے کہ میرے پاس آنے والے لوگ اپنی زندگی کے اہم پہلوؤں پر مجھ سے ڈسکس کرتے ہیں میں ان کے رازوں کا امین ہوتا ہوں چنانچہ بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو اسٹریٹ فارورڈ اپنا مسئلہ بیان کریں اکثر رفتہ رفتہ کھلتے ہیں جیسا کہ سجاد کھل رہا تھا مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کوئی سیدھی بات کر رہا ہے یا گھما پھرا کر اپنا معاملہ بیان کر رہا ہے جب کسی کا زائچہ میرے سامنے آتا ہے تو میں اس کی زندگی کے تمام گوشوں سے آشنائی حاصل کر لیتا ہوں۔

سجاد نے یقیناً دوسری جانب شمائلہ سے بات کی ہوگی۔ اس نے مجھے شمائلہ کے وقت پیدائش کے بارے میں بتایا تو میں نے فوراً شمائلہ کا زائچہ بنا ڈالا پھر میں نے بولنا شروع کر دیا۔

''کیا شمائلہ کا تعلق میڈیکل کے شعبے سے ہے؟''

''جی بالکل۔'' اس نے تصدیق کی۔ ''وہ ادھر ناظم آباد کے ایک اسپتال میں نرس ہے۔''

میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا شمائلہ کی شادی ہو چکی......؟''

میری تشویش کو اس نے فوراً پک کر لیا لہٰذا میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا مجھ سے پوچھ لیا۔

''آپ نے شمائلہ کی شادی کے بارے میں کیوں پوچھا۔''

''ایک خاص وجہ سے۔'' میں نے شمائلہ کے زائچے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ہارو اسکوپ میں ایک خطرناک نظر ہے۔''

''خطرناک نظر؟'' وہ پریشان ہوگیا۔ ''ذرا وضاحت کریں۔'' میں نے اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے بتایا۔ ''شمائلہ کے زائچے کا سات واں اور آٹھ واں گھر بری طرح متاثر ہیں کسی بھی خاتون کے زائچے کا آٹھواں گھر شادی کے حوالے سے بہت اہم ہوتا ہے۔''

''آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں کھل کر کہیں قریشی صاحب۔'' وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

''میرے علم کے مطابق، شمائلہ کی زندگی میں بیوگی کا دکھ لکھا ہوا ہے۔'' میں نے نپے تلے الفاظ میں کہا ''مطلب یہ کہ شمائلہ جس بھی شخص سے شادی کرے گی وہ حادثاتی موت کا شکار ہو جائے گا۔''

''یہ تو ہو چکا قریشی صاحب۔'' اس نے بتایا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

''شمائلہ کی شادی ہوئی تھی اور کچھ عرصہ پہلے اس کے شوہر الیاس کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ اپنے کسی رشتے دار سے مل کر واپس آ رہا تھا کہ ایک تیز رفتار ٹرک نے اس کی موٹر سائیکل کو ٹکر ماردی الیاس موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا تھا کیونکہ اس حادثے میں اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی تھی۔''

''کیا الیاس کسی قسم کا کوئی نشہ بھی کرتا تھا؟''

''جی وہ شراب نوشی کا عادی تھا۔'' سجاد نے بتایا۔ ''وقوعہ کی رات بھی وہ اپنے جس رشتے دار کے پاس گیا تھا وہاں اس نے شراب پی تھی لہٰذا واپسی پر وہ مکمل طور پر اپنے حواس میں نہیں تھا کچھ شراب کا نشہ اور کچھ ٹرک والے کی بے احتیاطی نتیجہ الیاس کی موت کی صورت ظاہر ہوا۔''

''اس نوعیت کے معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''شمائلہ کے زائچے میں آٹھویں کا حاکم سات دیں گھر پر قابض ہے اور بارہویں گھر میں شمش، مریخ اور زحل بیٹھے ہیں۔ ایسی صورت میں شوہر کا نشے باز ہونا اور اس کی اچانک حادثاتی یا پرتشدد موت کو ظاہر کرتا ہے۔''

''آپ کا علم سچا ہے قریشی صاحب۔'' وہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جیسا آپ نے فرمایا ویسا ہو چکا اب تو شمائلہ سیاروں کی اس نحوست سے نکل آئی ہے نا۔'' اس نے آخری جملہ بڑی آس امید سے ادا کیا تھا جیسے اس کی خواہش ہو کہ میں شمائلہ کے سلسلے میں اسے کلین چٹ دے دوں لیکن میں اپنی جگہ مجبور تھا۔ میرے پیشہ ورانہ تقاضے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سجاد علی کو شمائلہ کے حوالے سے کسی اندھیرے میں نہ رکھوں لہٰذا میں نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔

''سجاد صاحب کسی بھی انسان کی زندگی کے حالات و واقعات کے بارے میں جاننے کیلئے دو قسم کے زائچے بنائے جاتے ہیں۔ ایک پیدائشی زائچہ اور دوسرا وقتی زائچہ، وقتی زائچہ میں سیاروں کی پوزیشن اور اثرات وقتی یعنی عارضی ہوتے ہیں جب کہ پیدائشی زائچے کے معاملات فکس ہوتے ہیں اور ان میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ آپ اسے ''بلٹ ان'' سمجھ لیں میں نے شمائلہ کے بارے میں آپ کو جو کچھ بتایا ہے وہ اس کے پیدائشی زائچے کو دیکھ کر بتایا ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد دکھ اور افسوس ہو رہا ہے کہ شمائلہ کو ازدواجی خوشیاں بھی راس نہیں آئیں گی جو بھی شخص اس سے شادی کرے گا جلد یا بدیر وہ پرتشدد حادثات موت کا شکار ہو جائے گا لہٰذا آپ کی بچت اور سلامتی اسی میں ہے کہ شمائلہ سے شادی کے خیال کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیں۔''

''آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔'' وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں اپنے علم کی روشنی میں حقائق بیان کر رہا ہوں اگر میری باتیں آپ کو اچھی نہیں لگ رہیں تو آپ اپنی زندگی کی کاسٹ پر یہ رسک لے سکتے ہیں۔'' وہ بجھ سا گیا۔ تھوڑی دیر پہلے شمائلہ کے ذکر پر میں نے اس کی

آنکھوں میں جگنو سے چمکتے دیکھے تھے لیکن اب انہی آنکھوں میں خوف و ہراس خیمہ زن تھے اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی جس نے اس کی آواز میں مردنی بھر دی تھی۔

وہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچے بیٹھا تھا اس کے چہرے پر تفکر کے سائے منڈلا رہے تھے۔ مریل سی آواز میں بولا۔

''تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں شمائلہ سے شادی نہ کروں۔''

''میں آسٹر کنسلٹنٹ ہوں۔'' میں نے بے لاگ انداز میں کہا۔ ''میں اپنے علم آسٹرولوجی کی روشنی میں صرف آپ کو مشورہ ہی دے سکتا ہوں اس مشورے پر عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کا اختیار ہے میں آپ کو فورس نہیں کر سکتا۔''

''اچھا یہ بتائیں۔'' وہ گفتگو کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا زائچہ دوسری شادی کے حوالے سے کیا کہتا ہے؟''

''آپ کا شمسی برج جدی اور قمری برج ثور ہے۔'' میں نے اسے یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا ''یہاں تک تو دوسری شادی کے حوالے سے کوئی امکان نظر نہیں آتا لیکن......!'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولا ''لیکن کیا قریشی صاحب۔''

''لیکن......ایک معاملہ پکا ہے۔''

''کون سا معاملہ؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ کی دوسری شادی ضرور ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی قریشی صاحب۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں متفسر ہوا۔ ''پہلے آپ نے کہا کہ دوسری شادی کا امکان نظر نہیں آتا اب فرما رہے ہیں کہ دوسری شادی لازمی ہوگی یہ کیا چکر ہے جناب؟''

''کوئی چکر نہیں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''دوسری شادی کے امکان نظر نہ آنے کی بات میں نے آپ کے شمسی برج (Sun Sign) اور قمری برج (Moon Sign) کی بنیاد پر کی ہے جبکہ دوسری شادی کے ہونے کی بات میں نے زہرہ اور مریخ کی برج سنبلہ میں موجودگی کے پیش نظر کی ہے کسی بھی شخص کے پیدائشی زائچے میں زہرہ (VENUS) اور مریخ (MARS) کا قران اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ حامل زائچہ کی ایک سے زیادہ شادیاں ہوں گی اور آپ کے زائچے میں زہرہ اور مریخ کا قران برج سنبلہ (VIRGO) میں ہے جو کہ ایک زوجسدین (DOUBLE BODY) برج ہے لہٰذا دو شادیاں پکی ہیں۔''

''آپ نے مجھے بری طرح الجھا دیا ہے قریشی صاحب۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ''ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ اگر میں نے شمائلہ سے شادی کی تو جان سے جاؤں گا اور دوسری جانب آپ فرماتے ہیں کہ دوسری شادی پکی ہے میں جاؤں تو کہاں جاؤں میں کروں تو کیا کروں۔''

''کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''آپ ادھر کراچی ہی میں رہیں میں نے شمائلہ سے شادی کے ذیل میں پیش آمدہ خطرات سے آپ کو آگاہ کیا ہے یہ نہیں کہا کہ آپ دوسری شادی ہی نہ کریں۔ دنیا میں صرف ایک شمائلہ ہی تو نہیں رہ گئی۔''

''تو پھر کس سے ہوگی میری دوسری شادی۔'' وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

''یہ بتانا ناممکن کی حد تک مشکل ہے کہ آپ کی

دسمبر 2015ء کے شمارے کی ایک جھلک

موم کی محبت
ٹوٹا ہوا تارا
شب ہجر کی پہلی بارش
تیرے عشق نچایا

راحت وفا کا سلسلے وار ناول
سمیرا شریف طور کا سلسلے وار ناول
نازیہ کنول نازی کا نیا سلسلے وار ناول
نگہت عبداللہ کے قلم سے خوب صورت ناولٹ

نادیہ احمد، نزہت جبین ضیاء، نظیر فاطمہ، سویرا فلک، ندا حسنین، سیما بنت عاصم، بینا عالیہ

ام اقصیٰ، سلمیٰ غزل، عنبرین ولی کی تحریریں



مستقل سلسلوں میں پڑھیے

آپ کی صحت، ڈش مقابلہ، بیوٹی گائیڈ، غزلیں
نظمیں، بیاض دل، دوست کے پیغام آئے ودیگر

women.magazine
womenmagazine
aanchalpk.com

دوسری شادی کس خاتون سے ہوگی۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا" ہاں البتہ اس سلسلے میں میں ایک نام تجویز کرسکتا ہوں۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "جی بتائیں"

"اس خاتون کا نام ہے صوفیہ بنت صمد بخاری۔" میں نے ایک ایک لفظ زور دیتے ہوئے کہا۔

"یہ...... آپ...... کیا کہہ رہے ہیں!" اسے گیارہ ہزار وولٹ کا شاک لگا۔

"صوفیہ تو میری بیوی ہے میں اس سے دوبارہ کیسے شادی کرسکتا ہوں۔"

"بالکل ویسے ہی جیسے پہلے کی تھی۔" میں نے کہا۔ "صرف نکاح کا پروسس نہیں ہوگا۔"

"قریشی صاحب آپ کی باتیں مجھے پاگل بنادیں گی۔" وہ دیوانوں کی مانند گردن کو دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے بولا۔ "میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔"

"میری بات دھیان سے سنیں سجاد صاحب۔" میں نے اس کے پلے میں کچھ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کے، آپ کی اہلیہ کے اور آپ دونوں کی شادی کے زائچوں کو بڑی توجہ سے دیکھا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ دونوں کے زائچے ایک دوسرے کے زیادہ خلاف نہیں ہیں۔ یہ آئیڈیل میچ بھی نہیں اور مخالف میچ بھی نہیں ہے۔"

"اگر یہ مخالف میچ نہیں تو پھر صوفیہ نے میری زندگی کو جہنم کیوں بنایا ہوا ہے۔" میری بات پوری ہونے سے پہلے وہ پھٹ پڑا۔

"اگر آپ مجھے بات مکمل کرنے دیتے تو پھر آپ کے ذہن میں یہ سوال سر نہ اٹھاتا۔" میں نے ہلکی سی سرزنش کی۔

"سوری قریشی صاحب۔" وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ "میں اب خاموشی سے سنوں گا۔ ایک فرمائیں۔"

میں نے فرمایا۔ "شادی ہو یا کوئی بھی زندگی کا بڑا مرحلہ اس کی شروعات کی بہت اہمیت ہوتی ہے جیسا کہ کسی بھی عمارت کی تعمیر میں پہلی اینٹ کی خاص اہمیت ہوتی ہے آسٹرولوجی اس سلسلے میں رہنمائی کرتی ہے کوئی بھی نیا کام کرنے جائیں کسی بھی بڑے منصوبے کی بنیاد رکھیں تو اس کے لیے قمر کی پوزیشن کو دیکھنا ضرور ہوتا ہے چاند کا پہلا ہفتہ اور آخری ہفتہ کم زور ہوتا ہے دوسرا اور تیسرا ہفتہ طاقت ور ہوتا ہے خاص طور پر چاند کی نو سے اٹھارہ تک کی تاریخیں زیادہ مناسب ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ قمر کس برج میں ہے یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ سرطان، قوس، حوت اور ثور میں قمر کی موجودگی نہایت ہی عمدہ اور سود مند ثابت ہوتی ہے جبکہ حمل، اسد، میزان میں بھی مناسب سمجھی جاتی ہے لیکن جوزا، سنبلہ، عقرب، جدی اور دلو میں قمر کی موجودگی کے احتیاط برتنا چاہیے خاص طور پر قمر در عقرب تو بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ بے ضمیر اور شیطاف صفت عامل قمر کی عقرب میں موجودگی کے وقت گندے سفلی اعمال کرتے ہیں۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"آپ دونوں کی شادی بڑے خراب وقت میں ہوئی تھی اس وقت قمر عقرب میں تھا اور دیگر سیارے بھی یا تو زوال پذیر تھے اور یا پھر خواب حالت میں تھے۔ اگر آپ اپنی شادی کی تقریب کو دوبارہ منعقد کرنا چاہیں تو میں اس نیک کام کے لیے کوئی سعد تاریخ آپ کو نکال دوں گا۔ اس تقریب میں صرف نکاح کا پروسس نہیں ہوگا باقی ہر مرحلہ ویسا ہی ہوگا جیسا کہ عموماً شادی میں ہوتا ہے۔"

"قریشی صاحب آپ کی تجویز عجیب وغریب ہی نہیں بلکہ نا قابل عمل بھی ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اگر مجھے دوسری شادی ہی کرنا ہے تو میں ہرگز ہرگز صوفیہ سے نہیں کرنا چاہوں گا۔" اپنی بات کے اختتام پر اس نے یہ شعر پڑھا۔

ایک تجربہ کافی ہے
باقی عمر اضافی ہے

میں نے فراخ دلی سے کہا "یو آر رائٹ یور لبرٹی"

وہ چند لمحات تک مزید میرے پاس بیٹھا پھر سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

نئے افق کے معزز قارئین آپ کو یہی محسوس ہو رہا ہوگا کہ میں نے سجاد علی سے کوئی مذاق کیا تھا۔ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں میں نے جو کچھ کہا وہ اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر کہا تھا۔ خراب وقت میں جب بھی کوئی اچھا کام کیا جائے تو اس کے سودمند نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ سجاد اور صوفیہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ان کی شادی انتہائی نامناسب وقت پر ہوئی تھی میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا کہ اگر ان کی شادی مناسب وقت پر ہو جاتی تو وہ دنیا کا "مثالی جوڑا" ثابت ہوتے لیکن کم از کم یہ ضرور ہو جاتا کہ انہیں ایک دوسرے کی شکل سے نفرت نہ ہوتی اور وہ اوسط شادی شدہ جوڑوں کے مانند زندگی بسر کرتے میں اس قسم کا ایک تجربہ پہلے بھی کر چکا تھا جس کے خاصے مثبت اور حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے تھے لیکن مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ سجاد کے لیے میری تجویز پر عمل کرنا تقریباً ناممکن ثابت ہوگا کیونکہ صوفیہ کسی بھی قیمت پر ایسے تجربے کے لیے راضی نہیں ہوگی، ہماری معاشرتی روایات کچھ اس نوعیت کی ہیں کہ اس قسم کے تجربات کی سوسائٹی میں گنجائش نہیں نکلتی۔ پھر بعض مذہبی لوگ اسے شرعی مسئلہ بھی بنا ڈالیں گے۔

الغرض، زہر زندگی کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی بڑی سفاک حقیقت ہے زندگی بچانے والی اکثر ادویات مختلف قسم کے زہروں سے ہی تیار کی جاتی ہیں۔ اگر انسانیت کی بنیادوں پر سوچا جائے وہ انسانی زندگی ہر نوعیت کی معاشرتی قدروں، مذہبی و شرعی معاملات سے بالاتر ہے۔ اگر کسی انسان کی زندگی بچانا مقصود ہو تو میرے خیال میں ہر قانونی، معاشرتی اور شرعی حدود کو توڑا جا سکتا ہے اور میرا یہ معصوم سا خیال اس وجہ سے ہے کہ میں محمد ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن بنو ہاشم بن عبدالمناف...... کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو کائنات کے ہر اصول سے وہ معتبر، مصدق، محترم اور مقدس جانتا ہوں۔ مولوی صاحب کے معاملات مولوی صاحب جانیں میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے۔ جس نے ایک انسان کی جان بچائی اس نے پوری انسانیت کو بچایا اور جس نے ایک انسان کی جان لی اس نے پوری انسانیت کو قتل کیا۔

میں نے سجاد کو کوئی چکر نہیں دیا تھا صوفیہ اور شمائلہ کے زائچوں نے میری جو راہ نمائی کی وہ میں نے اس کے گوش گزار کر دی تھی۔ میرے مشورے پر عمل کرنا یا نہ کرنا اس کا کام تھا اور میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ میری تجویز پر عمل نہیں کرے گا۔ انگریزی کے حرف S سے شروع ہونے والا نام بڑے ضدی اور خود سر ہوتے ہیں اور اتفاق سے سجاد، صوفیہ اور شمائلہ تینوں کے نام S ہی سے شروع ہوتے تھے۔

انسانی زندگی عجیب گورکھ دھندہ ہے اس میں آپ کی سرگرمی کی بڑی اہمیت ہے اگر انسان کے پاس کرنے کو کوئی کام نہ ہو تو وقت کا دریا سست رفتاری سے بہتا محسوس ہوتا ہے لیکن اگر آپ کی زندگی میں

مصروفیت کا عمل دخل ہے تو یہی وقت پر لگا کر اڑ جاتا ہے ایک یہ چیز بھی میرے تجربے میں آئی ہے کہ مصروف انسان کی یادداشت کی رفتار قدرے سست ہوجاتی ہے اور چونکہ وہ اپنے کسی خاص مشن میں مگن ہوتا ہے اس لیے اسے کوئی خاص بات یاد کرنے کے لیے ذہن پر اچھا خاصا زور دینا پڑتا ہے جب کہ ایک فارغ شخص کی یادداشت ایسی برق رفتاری سے کام کر رہی ہوتی ہے کہ اس کے ذہن سے وہ، وہ چیزیں بھی نکل کر سامنے آجاتی ہیں جن کی دور دور تک کوئی ضرورت ہوتی ہے نہ ہی اہمیت، میں بھی ایک مصروف انسان ہوں لہٰذا کچھ ہی دنوں میں سجاد علی کو میں بھول بھال گیا وہ میرے معمولات سے نکل گیا۔

ایک ماہ کے بعد اس نے مجھے فون کیا اپنا تعارف کرانے کے بعد اس نے کہا ”قریشی صاحب آپ نے مجھے پہچانا۔“

وہ چونکہ اپنے نام اور کام کا حوالہ دے چکا تھا لہٰذا اسے پہچاننے میں مجھے کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا میں نے کہا۔

”جی سجاد صاحب آپ کا۔ کامران میڈیکل اسٹور کیسا چل رہا ہے۔“

کامران اس کے سات سالہ بیٹے کا نام تھا اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”اللہ کا شکر ہے اسٹور رواں دواں ہے۔“

”اور زندگی کی گاڑی۔“

”زندگی کی گاڑی کو میں نے آٹو پر ڈال دیا ہے۔“ وہ زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”چلی جارہی ہے...... ماں کی دعاؤں سے اور...... اللہ کے کرم سے۔“

”گویا آج موڈ اچھا ہے آپ کا۔“ میں نے کہا۔ ”کافی مطمئن اور خوش محسوس ہورہے ہیں۔“

”قریشی صاحب جب انسان کسی فیصلے پر پہنچ جاتا ہے تو اسے اطمینان قلب حاصل ہوجاتا ہے۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”اندر کی ساری بے چینی و بے قرار خود بہ خود غائب ہوجاتی ہے۔“

”آپ درست فرما رہے ہیں، سجاد صاحب۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا۔

”کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ کس فیصلے پر پہنچ گئے ہیں۔“

”میں نے صوفیہ کو طلاق دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔“ وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔

”اوہ......!“ میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

”قریشی صاحب زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”انسان کو چاہیے کہ اسے ہنس کھیل کر گزارے میں نے بھی خوش رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ صوفیہ کے ساتھ گھٹ گھٹ کر حرام موت مرنے سے بہتر ہے کہ میں اسے اپنی زندگی سے کک آؤٹ کردوں۔“

”یہ سراسر آپ کا ذاتی معاملہ ہے سجاد صاحب۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو اس کام سے روک نہیں سکتا لیکن......“

”لیکن میری قریشی صاحب؟“ میرے ادھورے جملے کے جواب میں اس نے استفسار کیا۔

”لیکن کیا آسٹرولوجی کہتی ہے کہ یہ کام آپ کے لیے آسان ثابت نہیں ہوگا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”صوفیہ سرطانِ (Cancer) ہے۔ یہ لوگ جس چیز سے چمٹ جائیں آسانی سے اس کی جان نہیں چھوڑتے میرے اس تبصرے کا مثبت پہلو یہ ہے کہ سرطان افراد نہایت ہی جذباتی اور بے انتہا محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس برج

سے تعلق رکھنے والے افراد میں وفا کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ آپ کو دانتوں پسینا آجائے گا سجاد صاحب۔''

''کاش...... وفا پرست یہ سرطان افراد معقولیت کا مظاہرہ بھی کریں۔'' وہ تلخی آمیز لہجے میں اپنا تجزیہ بیان کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے صوفیہ سے زیادہ خودغرض اور مطلب پرست اپنی زندگی میں اور کوئی نہیں دیکھا۔''

''اپنے اپنے تجربے کی بات ہے سجاد صاحب۔'' میں نے کہا۔

''دراصل، آپ کا تعلق برج جدی سے ہے اور یہ برج، برج سرطان کے بالمقابل یعنی 180 ڈگری پر واقع ہے آمنے سامنے کے بروج میں تو تکرار اور نظریات کا اختلاف ہمیشہ موجود رہتا ہے اینی ہاؤ...... میں آپ کے لیے دعا کروں گا۔''

''صرف دعا پر نہ ٹرخائیں قریشی صاحب۔'' وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ''آپ کو میرے لیے اس سے بڑھ کر بھی کرنا ہے۔''

''مثلاً! کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ نے میری دوسری شادی کی کوئی اچھی سی تاریخ نکالنے کا ذکر کیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''فی الحال آپ میرے لیے طلاق کی کوئی مناسب سی تاریخ تجویز کریں۔ کوئی بھی ایسی تاریخ کہ جب میں اسے طلاق دوں تو کوئی بدمزگی یا پیچیدگی پیدا نہ ہو آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔''

''جی سجاد صاحب میں آپ کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہوں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''لیکن آئی ایم ریئلی ویری سوری میں آپ کے لیے کام نہیں کر سکوں گا۔''

''قریشی صاحب اس کام کے لیے آپ کی پوری فیس ادا کروں گا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔''

''سجاد صاحب میں اپنی فیس کے لیے کبھی فکرمند نہیں ہوا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''آپ کے کام سے انکار کا سبب اصولی ہے اور میں اپنے اصولوں کو توڑ نہیں سکتا۔''

''آپ اپنے کس اصول کی بات کر رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس اصول کی کہ میں ہمیشہ تعمیری کام کرتا ہوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''طلاق کا مطلب کسی گھر کو توڑنا ہے یعنی یہ ایک تخریبی عمل ہے لہٰذا میں اس عمل کو بروئے کار لانے کے لیے آپ کی کوئی آسٹرولوجیکل ہیلپ نہیں کر سکتا۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' وہ قدرے مایوسی سے بولا۔

''ہاں البتہ......!'' میں نے کہا ''اگر آپ کا دوسری شادی کا پروگرام بن جائے تو میری آسٹرولوجیکل خدمات حاضر ہیں۔ میں اس نیک کام کے لیے آپ کو عمدہ قسم کی کوئی سعد تاریخ نکال دوں گا۔''

''جب کی جب دیکھی جائے گی۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔ ''خدا حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اس دنیا میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں لہٰذا افراد کی مختلف عادات واطوار، مزاج اور انداز کا شکوہ نہیں کرنا چاہیے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ کی کہی ہوئی بات سامنے والے کو پسند آجائے اور اگر آپ کی بات کھری اور سچی ہے تو پھر اس کی قبولیت کے

امکانات صفر کے برابر ہو جاتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ حق گوئی کو ترک کر کے دنیا والوں کے ساتھ دنیا والوں جیسا ہو جائیں۔ دنیا والوں کی خوشنودی حاصل کرنا کوئی فخر کی بات نہیں انسان کا کیا ہے یہ تو روٹھتے اور منتے ہی رہتے ہیں۔ انسان کو اپنے حقیقی مالک اور خالق کی ناراضی سے ڈرنا چاہیے اور اس کا سب سے بہترین اور موثر طریقہ یہی ہے کہ خود بھی سچائی کی راہ پر چلو اور ہمیشہ صراط مستقیم پر چلنے والوں کا ساتھ بھی دو چاہے اس کام کے لیے کتنا بھاری نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

سجاد سے ٹیلی فونک بات کو چند دن گزرے تھے کہ میری سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ کوئی صوفیہ صاحبہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ میں فی الحال صرف ایک ہی صوفیہ کو جانتا تھا اور وہ تھی سجاد کی بیوی ڈیوٹی اہلیہ صوفیہ بنت صمد بخاری اور صوفیہ سے یہ جان پہچان بھی سجاد کے توسط سے محض زبانی کلامی ہی تھی عین ممکن تھا کہ اس وقت مجھ سے بات کی خواہش مند کوئی اور صوفیہ ہو لہٰذا میں نے اپنی سیکرٹری سے کہا۔

”ٹھیک ہے آپ لائن ٹرانسفر کر دیں۔“

”او کے۔“ سیکرٹری نے کہا۔

اگلے ہی لمحے صوفیہ لائن پر تھی اس کی مہین سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”آپ وسیم قریشی بات کر رہے ہیں۔“

”جی بالکل میں وسیم قریشی ہی ہوں۔“ میں نے تصدیقی انداز میں کہا۔

”قریشی صاحب میری معلومات کے مطابق آپ کوئی وکیل ہیں لیکن آپ کی سیکرٹری نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ آپ آسٹرولوجسٹ ہیں۔“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”میری سیکرٹری نے آپ کو بالکل درست بتایا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں آسٹرولوجسٹ ہی ہوں۔ آپ کی معلومات ناقص ہیں آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں کوئی وکیل ہوں؟“

”کہا تو کسی نے نہیں۔“ وہ گڑبڑائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”یہ میرا اندازہ ہے۔“

”آپ نے میرا رابطہ نمبر کس سے حاصل کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”میرے شوہر کی ڈائری میں آپ کا نمبر لکھا ہوا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”میرا شوہر آج کل وکیلوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے اس لیے میں سمجھی کہ آپ کوئی وکیل ہوں گے۔“

”اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ سجاد علی کی بیوی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”جی ہاں۔“ اس نے بڑی سرعت سے جواب دیا۔ ”کیا آپ میرے شوہر کو جانتے ہیں؟“

”اگر آپ کامران میڈیکل اسٹور والے سجاد کی اہلیہ ہیں تو پھر میرا جواب ہاں میں ہے۔“ میں نے کہا آپ کے شوہر سے میری ایک آدھ ملاقات ہو چکی ہے۔“

”کس سلسلے میں وہ آپ سے ملنے آیا تھا۔“ اس نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”میں آپ کے اس سوال کا جواب بھی ضرور دوں گا۔“ میں نے کہا ”لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔“

”کیسی شرط قریشی صاحب۔“ اس نے پوچھا۔

”آپ کا شوہر آج کل وکیلوں کے چکر میں کیوں پڑا ہوا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”اس نے مجھے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ صوفیہ نے بتایا۔

”لیکن میں اس کو اس مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“

صوفیہ کی مہین آواز میں کافی غم و غصہ پایا جاتا تھا میں نے کہا ”اگر وہ آپ کو اپنی زندگی سے باہر نکالنے کا فیصلہ کر چکا ہے تو پھر آپ اسے کیسے روکیں گی۔“

”اس بات کا فیصلہ وقت کرے گا۔“ وہ بڑے پر عزم لہجے میں بولی پھر کہا۔”میں نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا۔ اب آپ میرے سوال کا جواب دیں۔“

”آپ کا شوہر جب میرے پاس ملاقات کے لیے آیا تو اس نے آپ کے حوالے سے چند باتیں کی تھیں۔“ میں نے محتاط اور بے ضرر الفاظ میں صوفیہ سے ایفائے عہد کے تقاضے پورے کرتے ہوئے کہا۔ ”مثلاً یہ کہ آپ اس کے ساتھ بہت برے انداز میں پیش آتی ہیں اس سے لڑائی جھگڑا کرتی ہیں اس کی انسلٹ کرتی ہیں اور اس کے کردار پر شک کرتی ہیں کہ اس کے کسی شمائلہ نامی عورت کے ساتھ تعلقات ہیں......وغیرہ۔“

”سجاد نے آپ کو جو کچھ بتایا، وہ صد فیصد سچ ہے، سوائے ایک بات کے۔“

”کون سی بات؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بات کہ...... مجھے سجاد کے کردار پر شک نہیں بلکہ یقین ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”ہمارا گھر میڈیکل اسٹور کے بہت قریب ہے اور شمائلہ کی رہائش بھی ادھر ہی ہے۔ میرے ہمدرد اور خیر خواہ افراد نے مجھے بتایا کہ شمائلہ اکثر سجاد کے اسٹور پر کھڑی رہتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ پیشے کے لحاظ سے ایک نرس ہے لہٰذا میڈیکل اسٹور سے اس کا رشتہ تعلق بنتا ہے لیکن وہ حرافہ سجاد سے رشتہ جوڑنے کے چکر میں ہے پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ شمائلہ کے شوہر الیاس کی موت کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا جہاں تک میرا خیال ہے ابھی تو شمائلہ کی عدت بھی پوری نہیں ہوئی اور وہ بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی سے میرا گھر اجاڑنے کے لیے کمر بستہ دکھائی دیتی ہے۔“

یہ بات سجاد کی زبانی مجھے معلوم ہو چکی تھی کہ وہ شمائلہ میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کا سبب صوفیہ کا رویہ ہو یا شمائلہ کا جھکاؤ لیکن یہ طے تھا کہ سجاد، شمائلہ کو اپنانے کے سلسلے میں کافی سنجیدہ نظر آتا تھا۔ مزید تصدیق کے لیے میں نے پوچھ لیا۔

”صوفیہ جی یہ تو آپ نے ایک طرف کی صورت حالات بیان کی ہے کیا میں جان سکتا ہوں کہ سجاد بھی اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔“

”جب تک مرد کی طرف سے گرین، سگنل نہ ہو، عورت کی ہمت یا مجال نہیں ہوتی کہ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھے۔“ وہ بڑے وثوق سے بولی اور مجھے اسی بات کا دکھ ہے کہ سجاد بری طرح اس بے غیرت عورت پر مرمٹا ہے اور مجھے طلاق دینے کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہا ہے لیکن تھوڑا بہت قانون قاعدہ میں بھی جانتی ہوں میں اس کی کوشش کو بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“

مجھے صوفیہ کی باتوں میں کافی دلچسپی محسوس ہوئی میں نے پوچھا۔ ”مثلاً آپ اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے کس قسم کی روک تھام کریں گی۔“

”وسیم صاحب۔“ وہ محتاط انداز میں بولی۔ ”کیا میں مطمئن رہوں کہ آپ سے جو کچھ کہوں گی وہ آپ ہی تک محدود رہے گا اور آپ کسی تھرڈ پرسن سے میری باتوں کو شیئر نہیں کریں گے۔“

”میرا یہ اصول ہے کہ میں اپنے کلائنٹس کے رازوں کو ایک مقدس امانت سمجھتا ہوں۔“ میں نے

ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہر کلائنٹ کا اکاؤنٹ دوسرے سے الگ ہے لیکن بے حد معذرت کے ساتھ میں فی الحال آپ سے رازداری کا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔"

"کیوں...... کیوں وعدہ نہیں کرسکتے؟" وہ تیز مگر باریک تیکھی آواز میں مستفسر ہوئی۔

"اس لیے کہ......!" میں نے بڑے رسان سے جواب دیا "آپ میری کلائنٹ نہیں ہیں۔"

"اوہ۔" اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا "تو آپ کی کلائنٹ بننے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"آپ میری سیکرٹری سے اپائنمنٹ لے کر میرے آفس تشریف لے آئیں۔" میں نے کہا۔ "پھر روبرو بیٹھ کر بات ہوگی۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔

میں نے کہا۔ "میں کال اپنی سیکرٹری کو دے رہا ہوں آپ اس سے بات کرلیں۔"

میں اگر چاہتا تو اسی وقت صوفیہ سے تفصیلی بات کرسکتا تھا لیکن میں نے دانستہ اس سے بالمشافہ ملاقات کے لیے اپائنٹ منٹ لینے کو کہا تھا میرا یہ تجربہ ہے کہ آپ کی پراڈکٹ چاہے کتنی بھی قیمتی کیوں نہ ہو اور آپ کی سروس چاہے کتنی بھی مفید کیوں نہ ہو اگر یہ دونوں چیزیں یا ان میں سے کوئی ایک آپ کسی کو مفت میں مہیا کردیں تو اس کی قدر نہیں کی جاتی۔ انسان نے جس شے کے لیے کچھ رقم خرچ کی ہوتی ہے اس شے کو وہ اہمیت دیتا ہے صوفیہ اگر میری فیس ادا کرنے کے بعد میرے سامنے بیٹھی تو میری باتیں اور مشورے زیادہ بہتر انداز میں اس پر اثرات مرتب کرسکتے تھے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں پیسا خرچ کرکے اچھی سروس اور مفید پراڈکٹ مل جاتی ہے ورنہ میرے پیشے اور اس سے ملتے جلتے پیشوں میں نام نہاد ماہرین قلم وفن کی تعدا کچھ کم نہیں ہے۔ جن کی وجہ سے مخلص اور قابل کنسلٹنٹس بھی بدنام ہوجاتے ہیں۔ رہے نام اللہ کا...... باقی سب ہوس۔

آئندہ روز صوفیہ میرے سامنے موجود تھی۔

میں صوفیہ سجاد، ان کی شادی اور شمائلہ کے زائچے تو آل ریڈی بنا ہی چکا تھا لہٰذا میں ڈائریکٹ اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

صوفیہ کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ بلاشبہ، وہ عمر میں سجاد سے کئی قدم آگے دکھائی دیتی تھی اور یہی حال صحت کا بھی تھا۔ سجاد متناسب قد اور مناسب جسم کا مالک تھا جبکہ صوفیہ پستہ قامت اور کنگ سائز بدن کی حامل تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کا وزن کسی بھی طور نوے کلوگرام سے کم نہیں تھا اس قد وقامت اور جثے پر گہرا سانولا رنگ اور بھدے نقوش بھی اس کی شخصیت کے تاثر کو آٹھ چاند لگارہے تھے۔ اس بھاری بھرکم ڈیل ڈول کے ساتھ باریک اور تیکھی آواز اس محاورے کو ذہن میں تازہ کردیتی تھی کہ موٹی مرغی ہمیشہ چھوٹا انڈہ دیتی ہے۔ سجاد اگر پچھلے آٹھ سال سے اس کے ساتھ گزارہ کررہا تھا تو کمال کررہا تھا نوبل نہ سہی مگر اسے کوئی نہ کوئی انعام یا ایوارڈ تو ملنا ہی چاہیے تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "صوفیہ جی میرے اور سجاد کے درمیان کیا باتیں ہوئی وہ ایک الگ اکاؤنٹ ہے لہٰذا ہم اس پر گفتگو نہیں کریں گے۔ ہمارے بیچ ایک نیا اکاؤنٹ کھل رہا ہے چنانچہ آپ مطمئن ہوجائیں کہ یہ باتیں کسی تیسرے شخص تک نہیں پہنچیں گی۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ فون پر بتا رہی تھیں کہ آپ بھی قانون قاعدے جانتی ہیں لہٰذا سجاد کو طلاق والے معاملے میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دیں گی آپ کے ذہن میں کیا ہے اس بارے میں مجھے کچھ بتائیں گی۔''

''قریشی صاحب۔ اس بات کا تو مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ مجھے زبانی کلامی طلاق نہیں دے گا۔'' وہ اپنی مخصوص بالعکس جثہ آواز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر اس نے ایسا کرنا ہوتا تو اب تک کر چکا ہوتا میں سمجھتی ہوں وہ یہ کام کسی وکیل کی مدد سے کرے گا جس کا ایک قانونی پروسس ہے اس قسم کی قانونی کارروائی کے دوران میں میری شمولیت اور موجودگی ضروری ہے۔ اگر میں تعاون نہیں کروں گی یعنی کورٹ کے احکامات کو وصول نہیں کروں گی اور عدالت میں پیش نہیں ہوں گی تو سجاد کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکے گی۔''

''میں آپ کی طرح بہت زیادہ قاعدے اور قانون تو نہیں جانتا لیکن......!'' میں نے اس پر جلال ہیوی ڈیوٹی خاتون کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھے معلوم ہے کہ اگر آپ نے کورٹ کے ارسال کردہ سمن کو وصول نہ کیا اور عدالت کی آواز پر لبیک نہ کہا تو عدالت اس معاملے کو یونین کونسل کے سپرد کر دے گی پھر یونین کونسل سے آپ دونوں میاں بیوی کا بلاوا آ جائے گا اور کونسلر پہلے تو آپ دونوں میں مصالحت کرانے کی سعی کرے گا اور جب کسی بھی طور بات نہ بن پائی تو پھر وہ سجاد کی خواہش اور درخواست کے مطابق آپ کے خلاف یعنی سجاد کے حق میں فیصلہ دے دے گا اور اگر آپ کورٹ کی طرح یونین کونسل کے بلاوے کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیں گی اور یونین کونسل کے آفس حاضر ہونے کی زحمت گوارا نہیں کریں گی تو اس صورت میں بھی طلاق موثر ہو جائے گی۔''

اس کے چہرے پر تشویش ابھر آئی قدرے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ نے میرا اور سجاد کا زائچہ بنایا ہے ہمارے ستارے اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟'' میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ان جان بن کر پوچھ لیا۔

''کس سلسلے میں؟''

''یہی کہ...... آیا سجاد اپنے منصوبے میں کامیابی حاصل کر پائے گا یا نہیں۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

میں ڈھکے چھپے الفاظ میں سجاد پر یہ واضح کر چکا تھا کہ وہ صوفیہ کو طلاق نہیں دے سکے گا اور یہ بات میں نے خوامخواہ ہی نہیں کہہ دی تھی اس کے پیچھے صوفیہ کے زائچے کے بعض اہم نظرات تھے اسی آسٹرولوجیکل فضائیں، میں نے صوفیہ سے کہا۔

''آپ کے سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ سجاد کو طلاق والے منصوبے میں کامیابی نہیں ہوگی، اس کا یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔''

''آپ یہ بات محض مجھے خوش کرنے کیلئے تو نہیں کہہ رہے؟'' اس نے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''اگرچہ اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ آپ کی صحت کے معاملات کے پیش نظر آپ کو زیادہ سے زیادہ خوش رہنا چاہیے لیکن اس وقت میں جو بھی عرض کر رہا ہوں اس کا تعلق آپ کے پیدائشی زائچے میں سیاروں کی مخصوص پوزیشن سے ہے۔'' میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''میری آسٹرولوجی کے مطابق آپ کو زندگی میں اپنے لیے کبھی ''مطلقہ'' کا لفظ نہیں سننا پڑے گا۔''

''شکر ہے۔'' اس نے ایک طویل آسودگی بھری سانس خارج کی۔

اس کے بعد مزید آدھے گھنٹے تک ہمارے بیچ زندگی کے مختلف زاویوں پر بات ہوتی رہی جس میں سرفہرست اس کی صحت کے معاملات تھے وہ شوگر اور دیگر نسوانی امراض میں مبتلا تھی اس پر موٹاپا (OBESITY) بھی ایک جان کا عذاب تھا میں نے مختلف مسائل کے سلسلے میں اسے مفید طبی مشورے بھی دیے اور تاکید کی کہ وہ اپنے جملہ امراض کے حوالے سے میری فیس بک کو ضرور وزٹ کریں میں اپنے ٹائم لائن پر بہت نادرالوجود قسم کی ٹپس دیتا رہتا ہوں۔

رخصت ہونے سے پہلے اس نے ایک عجیب سا سوال کیا۔

''قریشی صاحب انسان اپنی ضرورت تک محدود کیوں نہیں رہتا اس کی طلب ختم ہونے کا نام کیوں نہیں لیتی؟''

میں نے اس کے سوال کے جواب میں ایک شعر پڑھ دیا۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

''میں کچھ سمجھی نہیں قریشی صاحب۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے بڑے رسان سے کہا ''ایک انسان کی بنیادی ضرورت تین چیزوں پر مشتمل ہے نمبر ایک پیٹ بھر کر کھانا، نمبر دو تن ڈھانپنے کے لیے صاف ستھرا کپڑا، نمبر تین نیند پوری کرنے کے لیے محفوظ اور آرام دہ جگہ۔''

''یعنی روٹی کپڑا اور مکان۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

''جی بالکل۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا ''ان تین بنیادی ضروریات سے آگے کی طلب عیش کہلاتی ہے اور جب اس عیش میں ہوس شامل ہو جائے تو پھر اسے عیاشی کہا جاتا ہے سارا چکر انسان کی طلب کا ہے۔''

''کیسا چکر قریشی صاحب۔'' اس نے سوال اٹھایا۔

''دنیا میں تین قسم کی طلب ہوتی ہیں یا یوں سمجھ لیں کہ انسانوں میں تین طرح کے طالب ہوتے ہیں۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا اول طالب دنیا، دوم طالب آخرت سوم طالب مولا۔''

''تھوڑی وضاحت فرمائیں گے۔'' اس نے درخواست کی۔

''جی کیوں نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''طالب دنیا افراد کو آخرت یعنی جنت، دوزخ اور مولا یعنی اللہ کی کچھ زیادہ پروا نہیں ہوتی، یہ ہوس پرست انسانوں کا ایک گروہ ہے جو دنیا کے عیش و آرام اور عیاشی کا طلبگار ہوتا ہے اور اس کے حصول کی خاطر تمام اخلاقی حدود کو بھی پار کر جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز کی پہچان کھو بیٹھتا ہے۔ انہی افراد کے بارے میں بڑی حسرت سے کہا جاتا ہے پتا نہیں انہوں نے مرنا بھی ہے یا نہیں اگر مرنا ہے تو مر کر اللہ کو کیا جواب دیں گے، اپنے پروردگار کے سامنے کس منہ سے جائیں گے۔''

میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو اس نے پوچھا۔ ''اور طالب آخرت کون لوگ ہیں؟''

''انسانوں کے اس قبیلے میں عابد، زاہد پرہیزگار لوگ آتے ہیں۔'' میں نے کہا ''یہ لوگ دنیا سے زیادہ

دل نہیں لگاتے بس بنیادی بشری ضروریات تک محدود رہتے ہیں ان کی نگاہیں آخرت پر لگی ہوتی ہیں ان کی خواہش اپنے مالک اور خالق کو خوش کرنا ہوتی ہے تاہم ان کے پیش نظر بھی ایک خاص مقصد ہوتا ہے یا تو وہ اپنی اس عبادت، ریاضت اور زہد و تقویٰ کے صلے میں جنت کے طلبگار ہوتے ہیں اور یا پھر جہنم کے بچنے کے خواستگار، اپنی ہاؤ جنت کی چاہت اور جہنم کے خوف سے اگر کوئی عمل صالح کیا جائے تو میری نگاہ میں یہ لالچ کے زمرے میں آتا ہے۔ برائے مہربانی، میری بات کو غلط انداز میں نہیں لیجیے گا میں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔"

"نہیں قریشی صاحب میں آپ کی بات کو سمجھ رہی ہوں۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولی "آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"میں فکر مند نہیں محتاط ہوں۔" میں نے راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے یہاں کی فضا بڑی زہریلی ہے یوں سمجھیں کہ ہم بارود کے ایک ڈھیر پر بیٹھے ہیں اور ہمارے مخالفین مفتیان کے ہاتھ میں کھلی ہوئی ماچس ہے۔ ادھر انہوں نے تیلی پھینکی، ادھر ہمارا کام تمام بڑی خطرناک صورت حال ہے صوفیہ جی۔ جس شخص کو آپ کی بات پسند نہ آئے وہ کسی نہ کسی مفتی سے آپ کے خلاف فتویٰ لے کر آ جاتا ہے جس کے مطابق آپ کو یا تو را کا ایجنٹ یا یہودیوں کا آلہ کار یا منکر خدا یا توہین رسالت کا مرتکب قرار دے دیا جاتا ہے۔ کسی سیاست داں کے بارے میں کوئی سچ بیان کر دیں تو جمہوریت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے عدالتی نظام کی بے ضابطگیوں پر بات کریں تو عدل و انصاف کے خلاف سازش شمار ہوتی ہے کسی یونیفارم والے کی زیادتی کا ذکر کرنے سے ملکی سالمیت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور اگر آپ نے دودھ کے دھلے ہوئے کسی مولوی صاحب کو کچھ کہہ دیا تو سمجھو پھر تو دین کی ناؤ منجدھار میں آ گئی۔"

"واقعی یہ سب دل پکانے اور خون جلانے والی حقیقتیں ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "آپ تیسری قسم کے طالب کے بارے میں کچھ بتائیں۔"

"طالب مولا یعنی اللہ کا طلبگار۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "انسانوں کے اس گروہ میں بہت کم افراد ہوتے ہیں جنہیں مختلف درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مثلاً مجذوب، غوث، قطب، ابدال، قلندر...... یہ سب ولی اللہ یعنی اللہ کے دوست ہوتے ہیں انہیں نہ تو طلب دنیا ہوتی ہے اور نہ ہی طلب آخرت یہ اپنے مولا اپنے اللہ کے ساتھ رل مل کر اسی ذات کا پرتو بن جاتے ہیں آپ انہیں انسانی شکل میں خدا کہہ سکتے ہیں۔ ایسی نابغہ روزگار لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے پارہ گیارہ سورۂ یونس کی آیات نمبر باسٹھ، تریسٹھ میں ارشاد فرمایا ہے "یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور پرہیز گار رہے۔"

"قریشی صاحب۔ آپ آسٹرولوجی کب سے کر رہے ہیں۔" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"کم و بیش بیس سال سے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس سے پہلے کیا کرتے تھے۔" اس کے سوال میں خاصی تیزی تھی۔

"اپنی تعلیم مکمل کرنے میں لگا ہوا تھا۔" میں نے بتایا۔ "جو شاید میری خوش فہمی تھی اب محسوس ہو رہا ہے

کہ انسان کی تعلیم کبھی مکمل نہیں ہوتی وہ گود سے گور تک ہر لحہ سیکھنے کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔"

"اور آسٹرولوجی کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے۔" اس نے میری سنی ان سنی کرتے ہوئے ایک خاص کیفیت میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا "بس، اب تو آسٹرولوجی ہی میرا اوڑھنا اور بچھونا ہے۔"

"میں آپ کو آپ کے اوڑھنے اور بچھونے سے دور نہیں کرنا چاہتی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی، "آپ اپنا آسٹرولوجی کا کام جاری رکھیں لیکن اس کے ساتھ ہی آپ سے میری ایک درخواست ہے۔"

"کیسی درخواست؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ ٹی وی پر یا کسی آڈیٹوریم میں لیکچر دینا بھی شروع کردیں۔" وہ خلوص بھرے لہجے میں بولی۔ "عجیب وغریب کلیوں والے زرق برق ریشمی مضحکہ خیز لباسوں میں ملبوس نام نہاد اسکالروں کے منافقت بھرے بھاشن سن سن کر جی اوب گیا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اگر میں الفاظ کی ترتیب میں کوئی غلطی نہیں کر رہا تو فرمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے کہ "ایک ایسا دور بھی آئے گا جب نالائق اور نا اہل افراد مسند اقتدار پر براجمان دکھائی دیں گے اور بے کردار افراد خود کو مبلغ دین کے طور پر متعارف کرائیں گے۔ افسوس دکھ اور بربادی کی بات یہ ہوگی کہ عوام الناس کی اکثریت ان معاشرتی ناسوروں کو یہ اہمیت اور عزت دے گی۔ پس، جب ایسا ہو تو سمجھ لو کہ آخری وقت کا آغاز ہو چکا ہے اور......!" میں نے ذرا تھم کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"جہاں تک آپ کی تجویز کا تعلق ہے تو یہ بتائیں آپ کو مجھ سے کیا دشمنی ہے؟" وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی "نہیں قریشی صاحب مجھے تو آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے آپ نے ایسا کیوں کہا؟"

"آپ نے جس تناظر میں مجھے لیکچر دینے کو کہا ہے اس میں صد فیصد سچ بولنا اور عوام الناس کو حقائق سے آگاہ کرنا لازمی ہے۔" میں نے کہا "آپ بتائیں لازمی ہے یا نہیں۔"

"بالکل لازمی ہے۔" اس نے پرزور تائید کی۔

"ورنہ بات کرنے کا فائدہ کیا۔ منافقت کا بازار تو چاروں طرف گرم ہے۔"

"میں یا کوئی بھی شخص اس عوام کے سامنے ملاوٹ سے پاک حق سچ کی بات کرے گا وہ اپنی موت کو دعوت دے گا ایسی بات زبان سے نکالنے کے بعد وہ خود بعد میں گھر پہنچے گا اس کی آمد سے پہلے اس کے گھر بار کو بیوی بچوں سمیت جلا کر خاکستر کر دیا جائے گا۔"

"تو کیا انسان سچ بولنا چھوڑ دے؟" اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"سچ بولنا اور سچے لوگوں کا ساتھ دینا بلاشبہ ایک تحسن عمل ہے۔" میں نے کہا "لیکن اس نیکی کی قیمت چکانے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر۔"

ہمارے درمیان مزید تھوڑی دیر تک اس حساس موضوع پر بات ہوتی رہی پھر وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگئی۔

چند روز کے بعد صوفیہ نے مجھے فون کیا اور بڑے فخر سے بتایا۔

"بیگ صاحب میں نے سجاد اور اس کے وکیل کی ایسی کم تیسی کردی ہے۔"

اس دوران میں سجاد نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ آخری مرتبہ میری اس سے ٹیلی فونک بات ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ غائب تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آج کل اس کے ذہن میں کیا چل رہا ہوگا۔ صوفیہ کے لہجے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا میں نے تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں، سجاد اور اس کا وکیل کیا مطلب ہے آپ کا۔"

"میں تفصیل سے بتاتی ہوں۔" اس نے کہا پھر پوچھا۔ "آپ بزی تو نہیں ہیں؟"

سچی بات تو یہ کہ میں اس وقت فری ہی تھا اگر مجھے فراغت نہ بھی ہوتی تو میں صوفیہ کی بات سننے کے لیے تھوڑا وقت ضرور نکال لیتا اس نے میرے تن بدن میں سنسنی سی دوڑا دی تھی۔

"اٹس اوکے..... نو ایشو۔" میں نے کہا۔ "آپ اطمینان سے بات کریں۔"

"کل سہ پہر میں ایک سوٹڈ بوٹڈ اجنبی ہمارے دروازے پر آیا۔" وہ بتانے لگی۔ "میں دروازے پر گئی تو اس شخص نے اپنا نام سلیم فاروقی بتایا اور کہا کہ وہ مجھ سے ملنے آیا ہے میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"کام بہت اہم ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ میں موجود بریف کیس کو تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا گلی میں کھڑے بات کرنا مناسب نہیں ہوگا میرا خیال ہمیں گھر کے اندر بیٹھنا چاہیے۔"

"میرا شوہر گھر پر نہیں ہے۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا "میں اس کی غیر موجودی میں آپ کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

"میں جانتا ہوں سجاد صاحب اس وقت اپنے اسٹور پر ہیں۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "میں ابھی ان سے مل کر آرہا ہوں انہوں ہی نے مجھے گھر میں بیٹھنے کے لیے کہا ہے تھوڑی دیر میں وہ بھی آرہے ہیں۔"

میں نے ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے اس شخص کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

"میں ایک وکیل ہوں۔" سلیم فاروقی نے جواب دیا۔ "سجاد صاحب نے میری خدمات حاصل کی ہیں میں آپ سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔"

یہ بات تو میری علم میں آچکی تھی کہ سجاد مجھ سے جان چھڑانے کیلئے وکیلوں کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ پتا نہیں، میرے ذہن میں کیا آئی کہ میں نے سلیم فاروقی کو اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بٹھا لیا شاید میرا یہ عمل اندرونی تجسس کا عکس تھا میں جاننا چاہتی تھی کہ سلیم فاروقی مجھ سے کیا بات کرنے آیا ہے۔

میں نے وکیل کے سامنے ٹھنڈے پانی کا گلاس رکھا اور ایک صوفے پر اس کے روبرو بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جی، آپ بتائیں آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"وہ بات دراصل یہ ہے کہ سجاد صاحب نے مجھے آپ کو سمجھانے کا فرض سونپا ہے۔" وہ اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے بولا۔

"کیا میں کوئی ننھی بچی ہوں جو آپ مجھے سمجھانے چلے آئے ہیں۔" میں نے تڑک کر کہا "اور یہ بھی بتائیں کہ آخر آپ مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔"

"سجاد صاحب بہت ٹینس رہتے ہیں۔" وہ ہمدردی بھرے لہجے میں بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ان کی ٹینشن دور ہوجائے۔"

"اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سجاد کی ٹینشن کا سبب

میں ہوں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے مجھے سمجھانے چلے آئے ہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے آپ مجھے غلط نہ سمجھیں میں آپ دونوں کا بھلا چاہتا ہوں۔'' وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً آپ بھی بہت ٹینس ہوں گی اور آپ دونوں کے بیچ تناؤ کے باعث آپ کا بچہ بھی ڈسٹرب ہوگا کامران کے ذہن آپ دونوں کی لڑائی سے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ ہوجانا چاہیے۔''

''تو گویا آپ ہمارے مسئلے کو حل کرنے آئے ہیں؟'' میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔

''جی ایسا ہی سمجھ لیں۔'' وہ سرسری لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے سجاد آجائے تو بات کرلیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''سجاد صاحب بھی آجائیں گے۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت تک ہم کچھ ضروری باتیں کرلیتے ہیں۔''

''جی فرمائیں۔'' میں نے کہا ''میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''دیکھیں جی، اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ آپ میاں بیوی کے درمیان کب سے جھگڑا ہے؟ جھگڑے کی نوعیت کیا ہے اور اس فساد کا ذمہ دار کون ہے؟'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو حل ہوجانا چاہیے اور یہ کام آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔''

''آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ کے سامنے میں دو آپشنز رکھوں گا۔'' اس نے اپنے بریف کیس میں سے چند کاغذات باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ''ان میں سے آپ کو ایک آپشن کا انتخاب کرنا ہوگا۔''

''اور وہ دونوں آپشنز کیا ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے دونوں آپشنز کے حوالے سے کاغذات تیار کرلیے ہیں۔'' وہ بتانے لگا۔ ''پہلا آپشن یہ ہے کہ سجاد صاحب آپ کی موجودگی میں دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں اگر آپ اپنی رضامندی سے سجاد صاحب کی دوسری شادی کے ''اجازت نامے'' پر دستخط کردیں گی تو یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔''

سلیم فاروقی کی بات سن کر میرے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی لیکن میں نے حواس کو قابو میں رکھا اور کسی قسم کا شدید ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے روکھے لہجے میں پوچھا۔

''اور دوسرا آپشن کیا ہے؟''

''دوسرا آپشن۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا پھر بولا۔ ''دوسرا آپشن یہ ہے کہ اگر آپ نے سجاد صاحب کو بہ رضا و رغبت دوسری شادی کی اجازت نہیں دی تو وہ آپ کو طلاق دے دیں گے۔'' پھر وہ چند کاغذات کو میری نگاہ کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔ ''طلاق کے پیپرز تیار ہیں۔''

''سجاد ابھی تک نہیں پہنچا تھا مجھے یہ سمجھنے میں دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ آنے میں دانستہ تاخیر کررہا ہے تاکہ اس کا وکیل مجھے اچھی طرح سمجھا دے اور یہ وکیل اپنے موکل کی بھرپور وکالت کررہا تھا اور اس کی وکالت ہی نے مجھے بتایا کہ اسے بھی کچھ سمجھانا ہوگا اگرچہ سلیم فاروقی کی باتوں نے میرے بھیجے کا درجہ حرارت بہت بلندی پر پہنچادیا تھا لیکن میں نے نارمل انداز میں کہا۔

''وکیل صاحب کیا میں ان دونوں آپشنز کے کاغذات کا مطالعہ کرسکتی ہوں۔''

''جی ضرور۔'' وہ جلدی سے بولا پھر مذکورہ کاغذات میری جانب بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''یہ تو آپ کا حق ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذات لیے اور اپنے حق کا استعمال کرتے ہوئے بغیر پڑھے ان کاغذات کو فرش پر پھینکا پھر اپنی سینڈل اتار کر کاغذات پر جوتا کاری کرنے کے بعد کاغذات کو اٹھا کر وکیل کو دکھاتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔

''لیں وکیل صاحب میں نے دونوں آپشنز کے کاغذات پر اپنے دستخط بھی کر دیے اور سینڈل اسٹیمپ بھی لگا دی۔ اب میں انہیں پوسٹ کرنے جا رہی ہوں۔''

میں نے بات ختم کی اور ان تمام کاغذات کو تہہ در تہہ پھاڑ کر لاتعداد پرزوں میں تبدیل کر دیا پھر کاغذ کے وہ ان گنت ٹکڑے وکیل کے منہ پر مارتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

''اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ، اگر آئندہ کبھی میرے دروازے پر آئے تو تمہارا بھی وہی حشر کروں گی جو تمہارے آپشنز کا کیا ہے بڑا آیا مجھے طلاق دلوانے والا۔''

سلیم فاروقی اپنی بچی کھچی عزت کو لپیٹ سمیٹ کر اس طرح میرے گھر سے رخصت ہوا جیسے اگر وہ ایک لمحہ بھی وہاں رکا تو میں اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے میں کسی سستی یا تاخیر سے کام نہیں لوں گی۔''

صوفیہ کی بات مکمل ہوئی تو میں نے پوچھا ''کیا اس دوران میں سجاد گھر نہیں پہنچا تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''سجاد تھوڑی دیر کے بعد گھر آیا تھا۔''

''پھر اس نے گھر آ کر آپ سے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔ ''یقیناً سلیم فاروقی نے واپسی پر سجاد کو اس واقعے کے بارے میں تو بتایا ہی ہوگا۔''

''سجاد نے گھر آ کر مجھ سے بہت جھگڑا کیا۔'' صوفیہ نے بتایا۔ ''میں نے بھی اس معاملے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہمارے بیچ خوب جنگ ہوئی اور...... اور......!'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔ پھر مجھ سے مستفسر ہوئی۔

''قریشی صاحب ایک بات تو بتائیں۔''

''جی پوچھیں۔'' میں نے کہا۔

''اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو ''میری ماں'' کہہ دے تو ایسا کہہ دینے سے طلاق تو نہیں ہو جاتی۔''

''میں کوئی مفتی اعظم تو ہوں نہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''لیکن میرا خیال ہے اس قسم کے الفاظ ادا کرنے سے طلاق نہیں ہوتی۔'' لحاتی توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

''آخر ہوا کیا ہے؟''

اس نے بتایا ''جب ہمارا جھگڑا عروج پر تھا اور میرے سامنے ساجد کی کوئی پیش نہیں چل رہی تھی اس پر مستزاد یہ کہ ہماری جنگ میں کامران نے بھی رونا دھونا شروع کر دیا تھا تو سجاد نے بے بسی کے عالم میں دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا تھا بس کر دو میری ماں میں ہارا، تم جیتیں آج کے بعد میں دوسری شادی کا نام لوں گا اور نہ ہی تمہیں کبھی طلاق دینے کی بات کروں گا۔''

''بس تو پھر آپ مطمئن ہو جائیں کہ آپ کا نکاح لوہالاٹ برقرار ہے۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''سجاد کے میری ماں کہہ دینے آپ کو ہرگز ہرگز طلاق نہیں ہوئی کیونکہ اس نے اپنی بات کے اختتام پر یہ واضح کر دیا ہے وہ آپ کو کبھی طلاق دینے کی بات

نہیں کرے گا۔"

"ٹھیک ہے قریشی صاحب۔" وہ تشکر آمیز لہجے میں بولی۔

"اس وضاحت کا بہت شکریہ۔"

"تازہ ترین صورت حالات کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سجاد کے رویے کے بارے میں کچھ بتائیں۔"

"سجاد شانت ہے اور گھر میں سب امن و امان ہے۔" اس نے بتایا۔

"وہ مجھ سے زیادہ بات نہیں کر رہا تاہم بات چیت کا سلسلہ منقطع بھی نہیں ہے وہ سارا دن حسب معمول میڈیکل اسٹور پر گزارتا ہے پھر رات میں گھر آ کر سو جاتا ہے کوئی ضروری بات ہو تو کر لیتا ہے۔"

"چلیں، میری طرف سے مبارک باد وصول کریں۔" میں نے کہا۔ "آپ کے کمانڈو ایکشن نے سجاد کو صراط مستقیم دکھا دی ہے۔"

"صرف سجاد ہی کو نہیں بلکہ اس وکیل کے بچے کو بھی۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کیا اس روز وہ وکیل صاحب اپنے بچے کو بھی ساتھ لائے تھے۔"

"آپ مذاق بہت اچھا کرتے ہیں قریشی صاحب۔" وہ ستائشی لہجے میں بولی۔

"آپ نے وکیل کے بچے کو صراط مستقیم دکھانے کی بات کی تو میں یہی سمجھا کہ......!"

"میرا اشارہ سلیم فاروقی کی جانب تھا۔" وہ میرے مذاق سے محظوظ ہوتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "اب وہ بھول کر بھی کسی بیوی سے دوسری شادی کے اجازت نامے پر دستخط کرانے یا اسے طلاق دلوانے کے آپشنز لے کر اس کے گھر پر نہیں پہنچے گا۔"

"آپ نے فارسی کے ایک محاورے کو دوسرے محاورے کی سنگت میں بیک وقت عملی مظاہرے سے گزارہ ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ آپ کی ایک عمدہ پیش کش ہے۔"

"کون سے دو محاورے قریشی صاحب؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"دیر آید درست آید۔" میں نے کہا "اور گربہ کشتن روز اول۔"

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میری بات اس کی سمجھ میں آئی یا نہیں تاہم اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور ہنسی خوشی فون بند کر دیا۔

اگلے چند روز خالی گزر گئے خالی ان معنوں میں کہ نہ میرا صوفیہ سے رابطہ ہوا اور نہ ہی سجاد کی کوئی خیر خبر سننے کو ملی۔ خالی کا لفظ عموماً غیر فعال کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی ایسا وقت جس میں خاص نوعیت کی کوئی سرگرمی نہ ہو جیسے شوال اور ذیقعد کے مہینوں کو خالی کے مہینے کہا جاتا ہے کیونکہ ان سے پہلے رمضان اور بعد میں ذوالحج کا مہینہ پڑتا ہے۔ یہ دونوں مہینے مذہبی حوالے سے بہت اہم سمجھے جاتے ہیں قصہ مختصر میں اپنے کاموں میں تو مصروف تھا لیکن ان میاں بیوی کی طرف سے مجھے کوئی اپ ڈیٹس نہیں مل رہی تھی۔

میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے باعث شاید سجاد اور صوفیہ کو بھول ہی جاتا کہ ایک صبح جب میں حسب معمول اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک خبر نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔ یہ صوفیہ سے آخری ٹیلی فونک رابطے کے کوئی دو ماہ بعد کی بات ہے۔

اس اخبار خبر کے مطابق گارڈن ایسٹ کے

علاقے میں صوفیہ نامی ایک عورت نے سجاد نامی ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ان دونوں ناموں نے مجھے خبر کی تفصیل پڑھنے پر مجبور کر دیا۔

اخبار کے مطابق مقتول سجاد گارڈن ویسٹ کا رہائشی تھا جہاں اس کا میڈیکل اسٹور تھا اور اس کا گھر بھی اسٹور کے نزدیک ہی تھا جہاں وہ اپنی بیوی صوفیہ اور بیٹے کامران کے ساتھ رہتا تھا کچھ عرصہ پہلے سجاد نے شمائلہ نامی ایک نرس سے شادی کر لی تھی شمائلہ پہلے گارڈن ویسٹ ہی میں رہتی تھی لیکن اس شادی سے چند روز پہلے وہ گارڈن ویسٹ والی رہائش چھوڑ کر گارڈن ایسٹ میں جا بسی تھی۔ان کی شادی بڑے خفیہ انداز میں ہوئی تھی اور صوفیہ کو اس شادی کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی لیکن وہی بات کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اور ایسا ہی حال کچھ خفیہ شادی کا بھی ہوتا ہے واقعات کے مطابق جب صوفیہ کو اپنے شوہر سجاد کے کارنامے کا علم ہوا تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور اس نے گارڈن ویسٹ سے گارڈن ایسٹ پہنچ کر سجاد اور شمائلہ پر قاتلانہ حملہ کر دیا شمائلہ کی خوش قسمتی کہ وہ معمولی زخم کھانے کے بعد اپنی جان بچا کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی تھی جبکہ سجاد، صوفیہ کے جنون کا مقابلہ نہ کر سکا۔صوفیہ کے اندر اس وقت سو بندوں کی طاقت آ گئی تھی اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ گئی تھیں۔فرط غیظ میں سجاد کو فرش پر گرا کر ایک تیز دھار آلے کی مدد سے اس کا سینہ گود ڈالا تھا۔سجاد اس بری طرح زخمی ہوگیا تھا کہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا تھا۔پولیس نے موقع پر پہنچ کر قاتل صوفیہ کو آلہ قتل سمیت گرفتار کر لیا تھا۔صوفیہ نے جائے وقوعہ سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اس نے پولیس کو جو بیان دیا اس کی ابتدا کچھ اس طرح تھی۔

''میں اپنے فعل پر شرمندہ نہیں ہوں، میں نے جو کیا بالکل درست کیا کاش وہ کمینی شمائلہ بھی میرے ہتھے چڑھ جاتی تو میں اسے بھی نمونہ عبرت بنا ڈالتی۔اس کے بعد کسی عورت کو شادی شدہ مرد پر ڈورے ڈالنے اور کسی شوہر کو دوسری شادی کے بارے میں سوچتے ہوئے کپکپی طاری ہو جاتی...... کاش۔''

صوفیہ کے اس بیان پر کوئی بھی مثبت یا منفی تبصرہ کرنا مناسب نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہے۔ستارے اپنی چال چل گئے تھے میری پیش گوئی کے عین مطابق شمائلہ کا دوسرا شوہر بھی ایک حادثاتی اور پرتشدد موت کا شکار ہوا تھا اور سجاد اپنی بیوی کو طلاق دینے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

قدرت کا اپنا ایک نظام ہے اس کا تب تقدیر نے ہر انسان کی ایک ایک سانس کا حساب لکھ رکھا ہے انسان چاہے کتنی بھی جامع منصوبہ بندی کرلے مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے اس کے نظام کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔

نظم قدرت یہ کیا قیامت ہے
چاندنی رات اور چاند گہن

کشکول

ریحانہ عامر

اجرت پر قتل، اغوا برائے تاوان، خواتین اور بچوں کی فروخت جیسا قبیح فعل آج کے دور میں کاروبار کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس کاروبار کی پشت پر ایسے ایسے چہرے آپ کو نظر آئیں گے جن کا آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔
ننھے پھول جیسے بچوں کو اغوا کرکے بھکاری بنانے والے گروہ کا احوال

شام کے سائے تاریک دھند لکے میں ڈھلنے کے لیے پر تول رہے تھے' آدھی سے زیادہ سبزی منڈی بند ہوچکی تھی بیشتر دکاندار منہ مانگی قیمت پر اپنا مال اچھے داموں بیچ کر کرارے نوٹوں سے اپنے گلے بھر چکے تھے۔ اکا دکا دکاندار اور کچھ ٹھیلے بان ابھی تک گاہکوں کے انتظار میں بجھے ہوئے دل سے دھیرے دھیرے بچا کچا فروٹ اور سبزیاں ٹھیلے پر ترپال سے ڈھانپ رہے تھے۔ گاڑیوں اور لوگوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ صفیہ نکڑ کے سامنے والے ٹھیلے سے سستی باسی سبزیاں اور کچھ گلے سڑے فروٹ پیوند دار پرانے تھیلے میں اڑوس رہی تھی۔ وہ ہر تیسرے چوتھے روز سلائی کڑھائی کے کام سے فارغ ہو کے اکثر شام ہونے سے ذرا پہلے ہی منڈی کا رخ کرتی جس کی بڑی وجہ رش نہ ہونے کے برابر ہوتا اور دوسرا سبزی اور پھل سستے داموں میں دستیاب ہوتے۔ دن کے وقت پھلوں اور سبزیوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی دکاندار منہ مانگی قیمت کے عوض پھل اور سبزیاں فروخت کرتے تھے جو کہ غریب طبقے کی پہنچ سے کوسوں دور تھا۔

آخری وقت میں ان کے پاس بچا کچا مال رہ جاتا تھا جسے غریب لوگ تھوڑی سی بحث وتکرار کے بعد خرید کے اپنے گھر کی راہ لیتے۔ اس نے اپنی من پسند سبزیاں اور اپنی بیٹوں کی فرمائش پر پھلوں سے تھیلا نک نک تک بھرلیا تھا کیونکہ اسی ہفتے کے آخری میں رشیدہ بیگم کی بیٹی کی شادی تھی ان کے سارے کپڑے اور کڑھائی سلائی کا سارا کام صفیہ کے سپرد تھا۔ اسے پتا تھا کہ اگلے پانچ سات روز تک اس کا گھر سے نکلنا ممکن نہ تھا اس نے ٹھیلے پر سبزیوں سے بھرا تھیلا ٹکاتے ہوئے دائیں ہاتھ پیسوں والی کپڑے کی پوٹلی کی طرف بڑھایا۔

''لاری نکی...... او نکی جلد پیسے دے...... پہلے ہی اتنی دیر ہوگئی ہے۔''

''نکی...... اونکی!...... نک...... ی......''

''ارے بہن! کون نکی...... اور پیسے کس سے مانگ رہی ہیں' آپ کے پیچھے تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' اسے اس کے ذہنی توازن پر شک ہونے لگا ہاتھ چھوڑتے ہی تھیلا زمین پر دھڑم سے آن گرا' ساری سبزیاں اور پھل دور تک بکھر گئے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک سے دوسرے اور تیسرے ٹھیلے والے گاہکوں سے پوچھنے لگی۔



"آپ میں سے کسی نے میری نکی کو تو نہیں دیکھا...... نکی میری بیٹی ہے اس نے سرخ رنگ کی فراک پہنی ہوئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی تھی ابھی ٹھیلے پر میرے ساتھ کھڑی تھی' پتا نہیں کہاں چلی گئی۔ آپ نے دیکھی بھائی صاحب...... آپ نے...... آپ نے دیکھا......"

اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے' وہ سب کچھ بھول گئی "نکی" کو ڈھونڈنے لگی۔

"آپ نے دیکھا...... ہائے میری بچی مجھے چھوڑ کر اکیلی کہاں چلی گئی۔ ایک پل کے لیے ہی تو میں نے نظر پھیری تھی' مڑ کے دیکھا تو نکی غائب...... پتا نہیں اسے زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا۔ سمجھ نہیں آ رہی اسے کہاں تلاش کروں۔" وہ بے بسی سے زمین پر بیٹھ کے دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ کر زاروقطار رونے لگی۔

"ہائے میری نکی...... میں لٹ گئی...... میں برباد ہو گئی' میں اجڑ گئی......"

"بہن! پریشان نہ ہو اپنے آپ کو سنبھالیے' اتنی چھوٹی سی بچی بھلا کہاں جا سکتی ہے۔ آپ یہاں رونے پیٹنے کی بجائے جلدی سے اپنے گھر جائیں' ہو سکتا ہے وہ گھر چلی گئی ہو لہٰذا یہاں گلی کوچوں میں ڈھونڈنے کی بجائے آپ اپنے گھر جا کے دیکھیں مجھے پورا یقین ہے وہ ضرور آپ کو گھر سے مل جائے گی اٹھو میری بہن!" سیانی عمر کے ریڑھی بان نے

اسے تسلی آمیز لہجے میں مشورہ دیا وہ ایک دم اٹھی اور الٹے پاؤں گھر کی طرف دوڑنے لگی۔

❀......❀......❀

''اُف اللہ کتنی بھاری ہے یہ مجھ سے نہیں اٹھائی جاتی' میڈم! کل سے میں اسے دھندے پر ساتھ لے کر نہیں جاؤں گی۔ اسے اٹھا اٹھا کے تو میرے ہاتھ بھی سُن ہو گئے ہیں۔ بھینس کی طرح موٹی ہے' میں اسے اٹھاؤں یا دوسرے بچوں پر دھیان دوں۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب کچھ' نہ اسے کچھ مانگنا آتا ہے سارے رستے اسے اٹھا کے لے جاؤ پھر واپسی پر بھی اٹھا کے لے آؤ۔'' ناجی کا بس یہ کہنا تھا کہ رانی میڈم نے دیوانہ وار اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

''نہیں لے کے جائے گی' مفت میں کھانا ٹھونسے گی ناں' یہ تیرے باپ کا گھر ہے نا' میں نے خیراتی ادارہ بنایا ہوا ہے اور نہ ہی بے سہارا بچوں کے لیے یتیم خانہ کھولا ہوا ہے۔ یہ رانی میڈم کا ڈیرہ ہے سمجھی تُو صرف رانی کا راج ہے اور یہاں رانی کا حکم چلتا ہے جو رانی کے حکم سے سرکشی کرتا ہے اس کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔ میں بھی دیکھتی ہوں تو اس نئی لونڈیا کو کیسے ساتھ نہیں لے جاتی' کیسے اسے بھیک مانگنا نہیں سکھاتی۔ پچھلے کچھ دنوں سے تیرے نخرے کچھ زیادہ ہی بڑھ گئے ہیں تیرا تو میں ابھی علاج کرتی ہوں' اتارتی ہوں تمہارے نازک ہاتھوں کی تھکن۔ ارے شامو! کہاں مر گئے ہو ذرا جلدی سے گرم چھری لاؤ' جلدی کرو شہزادی ناجی کے ملائم ہاتھوں کی ٹکور کرنی ہے۔'' اگلے لمحے ڈیرے کا سب سے پرانا محافظ اور رانی میڈم کا نائب جن کی طرح حاضر ہوا۔

''جی میڈم......میڈم......جانے دیں ناں میں سمجھا دوں گا ناجی کو بھی اور اس نئی لڑکی کو بھی' آپ غصہ تھوک دیں اور مجھ پر چھوڑ دیں۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیں گی' جانے دیں کوئی بات نہیں میرے کہنے پر یہ غلطی بخش دیں۔'' شامو نے ابلتی کڑھتی میڈم کے آگے درخواست کی۔

''واہ واہ......کیا بات ہے شامو! آج تیرے اندر کا مرد کیسے جاگ گیا' تجھے کیسے غیرت آ گئی۔ ارے بھول گیا وہ دن جب سڑک کنارے نشے میں دھت مرے ہوئے کتے کی طرح پڑا رہتا تھا جب تیرے پاس کھانے کو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ اپنے جسم کے گندے خون کو بیچ کر تُو اپنے نشے پانی کا گزارہ کرتا تھا' کئی کئی دن بھوک پیاس سے نڈھال بے ہوش پڑا رہتا تھا۔ تجھے کھانے کو کوئی ایک نوالہ نہ دیتا تھا' لوگ تیری حالت دیکھ کے تجھ پر تھوک کے آگے بڑھ جاتے تھے۔ کچرے کے ڈھیر سے اٹھا کے رانی اپنے ڈیرے پر لائی وہ وقت بول گیا اس وقت تیرے منہ میں نوالہ کس نے ڈالا تھا' آج تجھے ناجی کی بڑی فکر ہو رہی ہے اس کی بڑی طرف داری کر رہا ہے' کہیں دل تو نہیں آ گیا اس پر۔ یاد رکھو ہمارے دھندے میں جذبات' رحم' ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور تم اس ڈیرے کے سب سے پرانے محافظ ہی نہیں بلکہ میرے نائب بھی ہو۔ میرے بعد اس ڈیرے اور دھندے کو تم نے سنبھالنا ہے اس لیے آج تو تمہارے کہنے پر چھوڑ دیتی ہوں مگر یاد رکھنا آئندہ میں کسی کے منہ سے انکار نہ سنوں نہ تمہارے منہ سے کسی کے لیے بھی ہمدردی کا ایک لفظ بھی ورنہ ان کے ساتھ اپنے انجام کا بھی سوچ لینا۔ چلو بچوں اور لونڈیا کو لے کے شکل گم کرو اور سمجھا دینا انہیں اچھی طرح ورنہ......''

''جی میڈم! آپ بے فکر ہوجائیں آئندہ بالکل نہیں ہوگا۔'' شامو نے سر کو جھکا کے ادب سے کہا' ناجی اور بچوں کے کشکول اور ٹوکری میڈم کے کمرے میں رکھ کے باہر جانے لگا۔

''شامو...... اے شامو......!'' اس کے قدم وہیں پتھر کے ہوگئے' الٹے پاؤں دوڑ کے پھر میڈم کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہوگیا۔

''جی میڈم!''

''شامو یہ لڈو اور اس کی فوج آج کہاں رہ گئی' وہ ابھی تک بچوں کو لے کے نہیں آیا ہے اس کم بخت کو کس سگنل پر بھیجا تھا ذرا اس کی پہلے خیر خبر لے لے پھر ان کا حساب کتاب دینا۔ یہ لڈو بھی نرا ہڈحرام ہوتا جارہا ہے۔ اس کی لگام بھی تم نے ڈھیلی کر رکھی ہے' ذرا عقل کے ناخن لو اگر اسی طرح تم ترس کھاتے رہے تو ہمارا دھندا چوپٹ ہوجائے گا اور ایک ایک کر کے ہمارے کارندے بھی ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ جا پتا کر اس کا اور سن! اس لڈو پر جا دا دھیان رکھ۔'' شامو باہر نکلا تو باہر لڈو سہمے ہوئے انداز سے کھڑا تھا۔ شامو کچھ نہ بولا آنکھوں کے اشارے سے اسے اندر جانے کا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

''ناجی تجھے کتنی بار سمجھایا ہے میڈم کو لفظ ناں بالکل ناپسند ہے اس لیے میڈم کے سامنے منہ کھول کے کیوں اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالتی ہو۔''

''شامو! کیا کروں ایک تو کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ بچے لے کے دن بھر سگنلوں پر بھیک کے لیے ماری ماری پھرتی ہوں' نہیں اٹھائی جاتی مجھ سے یہ نئی مصیبت۔ میڈم کو بھی ذرا سوچنا چاہیے مگر میڈم کو اس سے کیا وہ تو دونوں ہاتھوں سے پیسے جمع کرنے میں لگی ہے۔ پتا نہیں یہ بھیک کے پیسے کھا بھی پائے گی یا قبر میں اپنے ساتھ لے جائے گی بڈی کھوڑی!'' ناجی غصے اور بے بسی سے بڑبڑائی۔

''اچھا ناجی! فکر نہ کر' اس نکی کو دو دن بھوکی رکھ اس کی عقل ٹھکانے آجائے گی' ٹھیک ہے ناں۔''

''اچھا ٹھیک ہے شامو! اس نکی کو ذرا نیند کا ٹیکہ لگادو ورنہ پھر رو رو کے ہماری جان مصیبت میں ڈالے گی۔''

❁......❁......❁

''اماں خدا کے لیے صبر سے کام لو کچھ تھوڑا سا کھالو' پہلے ہی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جب سے نکی گم ہوئی ہے تم نے رو رو کے اپنا برا حال کرلیا ہے۔ دیکھو آپ کچھ نہیں کھاؤ گی تو آمنہ' مناہل اور روبیہ آپا کے حلق سے لقمہ کیسے اترے گا۔ یہ بے چاری بھی بھوک سے نڈھال سو رہی ہیں' اماں آپ تو بڑی ہو میری بہنوں کو بھی تسلی دو اور مایوسی گناہ ہے۔ خدا کی رحمت بہت وسیع ہے وہی ہماری مدد کرے گا۔ خدا نے چاہا تو بہت جلدی ہماری نکی ہمیں مل جائے گی' میں اور ماموں غفور سارے شہر کے تھانوں میں نکی کی تصویر دے آئے ہیں۔ تھانہ منڈی ٹاؤن میں گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کرآئے ہیں' اب آپ خدا پر یقین رکھیے' تھانے والے ہر جگہ ہماری نکی کو ڈھونڈ رہے ہیں اور پھر ماموں غفور نے اپنے صاحب سے بھی ہر تھانے میں فون کروایا ہے اور ماموں خود بھی ہر لمحے پولیس سے رابطے میں ہیں۔ اماں اب میری بات مانیے کچھ کھالیجیے ورنہ یہ بچیاں بھی بھوکی مرجائیں گی۔'' صفیہ نے پہلا نوالہ توڑ کے آمنہ کے منہ میں ڈالنا چاہا تو زاہد کے موبائل پر بجنے والی گھنٹی سن کر ٹھٹک گئی۔

''ہیلو آپ زاہد ہو' غفور کے بھانجے؟''

''جی میں زاہد ہی ہوں آپ کون؟''

''بیٹا میں تھانہ منڈی ٹاؤن سے انسپکٹر رشید بات کرر ہا ہوں میں نے تمہارے ماموں غفور سے بات کرنا تھی دراصل ان کا موبائل بند جارہا ہے اس لیے پھر تجھے کال کی۔ بیٹا ہمیں کوٹ حیدری کی حدود سے ایک سات آٹھ سالہ لڑکی کی لاوارث لاش ملی ہے' پورے علاقے میں اطلاع کرنے کے باوجود ابھی تک اس کا کوئی وارث نہیں آیا۔ بیٹا میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ کون بدنصیب ہے اور کس بدنصیب ماں کی آنکھ کا تارا ہے مگر جو عمر اور کپڑوں کا رنگ آپ نے نکی کا بتایا تھا اس سے کافی مشابہ ہے۔ خدا کرے بیٹا! یہ تمہاری بہن نہ ہو مگر پھر بھی شک دور کرنے کے لیے جتنا جلدی ہوسکے اس لاش کی شناخت کے لیے اپنے ماموں کو ساتھ لے کر تھانہ پہنچ جاؤ۔''

''کون تھا کیا کہہ رہا تھا...... تمہارے ماموں تو نہیں تھے...... کہیں میری نکی کی خبر تو نہیں تھی...... زاہد! تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟'' ماں بے بسی سے روتے ہوئے زاہد کی قمیص کا دامن پکڑ کے زمین پر بیٹھ گئی۔

''ماں کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں...... تھانے سے فون آیا تھا انہیں کوٹ حیدری سے کسی چھوٹی بچی کی لاش ملی ہے اس کی شناخت کے لیے مجھے اور ماموں کو تھانے بلا رہے تھے۔'' آخری الفاظ کے ادا ہونے سے پہلے ہی وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

''ہائے میری بچی...... ہائے میری بچی...... میری نکی کو ظالموں نے مار ڈالا۔''

''ماں بغیر دیکھے ہم کیسے مان لیں کہ وہ ہماری نکی ہے۔ اماں تھوڑا صبر سے کام لو۔ میں ماموں کو ساتھ لے کے تھانے جاکے پتا کرتا ہوں یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ لاش کسی اور بچی کی ہو۔''

''نہیں زاہد...... میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی' مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔'' روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

اولاد کا غم والدین کے لیے کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے' صفیہ اپنی بیٹی کی گمشدگی پر نیم پاگل ہوچکی تھی۔ زاہد اپنی ماں اور ماموں کے ہمراہ تھانے پہنچ گیا' تھانے کے احاطے میں خون میں لت پت لاش پڑی تھی' انسپکٹر انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا' غفور کو مخاطب کر کے بڑی ہمدردی سے بولا۔

''آیئے غفور بھائی! میں آپ کا ہی انتظار کررہا تھا' یہ لاش ہمیں کوٹ حیدری سے ملی ہے جو کہ ہماری حدود سے کافی دور ہے۔ آپ نے شناخت کے لیے نکی کی جو تصویر دی تھی یہ لاش ہے تو اس سے کافی مختلف مگر پھر بھی میں نے آپ لوگوں کو اطلاع دینا انتہائی ضروری سمجھا۔ آپ ایک نظر دیکھ لیں گے تو میرے دل کا شک بھی دور ہوجائے گا۔'' زاہد نے جیسے ہی لاش کے منہ سے کپڑا ہٹایا اس کی ماں ایک دم غش کھا کے بے ہوش ہو کے گر گئی۔ غفور اور انسپکٹر سمیت جتنے اہلکار وہاں موجود تھے سب کے چہرے آنسوؤں سے تر ہوگئے۔

''ارے نہیں ماموں جان یہ ہماری نکی نہیں ہے۔ اماں نکی کے غم میں حواس کھو کے بے ہوش ہوگئی ہے۔ آیئے ادھر دیکھئے یہ ہماری نکی نہیں ہے۔'' زاہد کی تصدیق کے بعد غفور میں بھی لاش کی سمت قدم بڑھانے کا حوصلہ پیدا ہوگیا۔

''جی ہاں...... جی ہاں انسپکٹر صاحب! یہ ہماری بچی نہیں ہے' زاہد ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' بے ہوش

ہونے کے بعد صفیہ کا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا' پولیس کی مدد سے اسے جلدی سے قریبی اسپتال لایا گیا۔ دو دن بعد ان کی حالت کافی بہتر ہوچکی تھی مگر نکی کا نام اسی طرح اس کی زبان پر تھا ڈاکٹر نے زاہد کو ہدایت کی کہ تمہاری ماں کو تمہاری بہن کی گمشدگی کا گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے اس کے آرام اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا' بہت کمزور ہوگئی ہے یہ کچھ میڈیسن لکھ دی ہیں اسے باقاعدگی سے دینا' اب آپ اسے گھر لے جاسکتے ہیں۔"

❁......◉......❁

"جلدی کرو شاباش' جلدی سے کھانا کھاؤ جتنا جلدی منہ ہلا کے کھانا پیٹ میں ٹھونس رہے ہو اتنا جلدی سگنل پر بھیک کے لیے ہاتھ پاؤں بھی ہلالیا کرو۔" رانی میڈم اپنی رعب دار آواز میں کھانا جلدی ختم کرکے دھندے پر جانے کا حکم دے کر اپنے کمرے کی طرف مڑنے ہی والی تھی۔ نکی بھوک سے نڈھال بچوں کو کھانا کھاتے دیکھ کے لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھی اور روٹی پر جھپٹی تو رانی میڈم نے اس کے ہاتھ سے آدھ جلی روٹی چھین کر ایک طرف پھینک دی' اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا تو نکی دوسری طرف جا گری۔ شامو یہ منظر دیکھ کے تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا' وہ نکی کو اٹھانے کے لیے اس کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ رانی میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے وہیں رک جانے کا اشارہ کیا۔ خوف سے شامو کے قدم وہیں ساکت ہوگئے۔

"حرام زادی! کس ڈھیٹ مٹی کی بنی ہے' بھیک مانگتی نہیں اور روٹی مانگتی ہے' مفت کا مال نہیں ہے چل پہلے بھیک مانگ پھر کھانا ملے گا۔"

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کردیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔
7 'فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔
☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

''آنٹی! خدا کے لیے مجھے بہت بھوک لگی ہے' مجھے روٹی دے دیں آپ جیسے کہو گی ویسے کروں گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے تمام توانائی بحال کر کے ہمت سے اٹھی' کمزوری اور بھوک سے لڑکھڑاتے ہوئے پھر گر گئی۔

''شاباش یہ ہوئی نا اچھے بچوں والی بات' اچھا تجھے روٹی دیتی ہوں پہلے بھیک مانگ کے دکھا۔''

''آنٹی خدا کے لیے روٹی دے دیں بہت بھوک لگی ہے۔'' اس نے معصوم ہاتھ جوڑ کے کہا۔

''ارے ایسے مانگو گی تو کوئی خاک تجھے بھیک دے گا۔ میں تجھے سکھاتی ہوں' ایسے ہاتھ آپس میں جوڑ' ارے ایسے...... میری طرف دیکھ' اب بول...... مائی خدا کے واسطے کھانے کو کچھ دے دو' دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔ گھر میں میرا اندھا باپ اور چھوٹے بہن بھائی ہیں' دو دن سے بھوکے ہیں' اللہ کے نام پر دے دو مائی۔''

''شاباش یہ ہوئی نا بات۔'' رانی میڈم سمیت سبھی تالیاں بجانے لگے۔

''شامو! آج اسے ناجی کے ساتھ بلکہ لڈو کے ساتھ بھیجو' آج سے یہ نکی لڈو کے گروپ میں ہے۔ ناجی او ناجی......'' وہ سر پر پاؤں رکھے دوڑتی ہوئی میڈم کے سامنے ہو گئی۔

''جی میڈم!''

''جا' نکی کے لیے ذرا دھندے والے کپڑے لا اور کلنک کی ڈبیہ بھی لے آ' ایسی حالت میں بھلا کون بھیک دے گا۔'' ناجی نے جھٹ سے گندے میلے چیکٹ بدبودار بوسیدہ کپڑے پہنائے' جلدی سے کلنک سے اس کے ماتھے اور پھولے سرخ رخساروں کو کالی لکیروں سے بھکارن کا حلیہ بنا کر میڈم کے سامنے پیش کر دیا۔

''ہاں اب ٹھیک ہے' لڈو لے جا اسے اپنے قریبی سگنل پر کھڑا کرنا اور نظر رکھنا اس پر' جا۔'' نکی کے دل میں میڈم کا ڈر اس کے گھر والوں کی یاد اور اپنی اصلیت پر غالب آ چکی تھی۔ وہ ایک پیشہ ور بھکارن کے روپ میں ڈھل چکی تھی اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو ہمیشہ کے لیے معذور بنا دی جائے گی اور گر بھیک نہیں مانگے گی تو میڈم اسے بھوکا مارے گی اس لیے اس نے وہی کیا جو میڈم نے حکم دیا وہ اپنے ننھے ہاتھوں کا کشکول بنا کے سگنل پر کھڑی ہر گاڑی کے پاس جاتی۔

''مائی خدا کے واسطے کھانے کو کچھ دے دو' کوئی چیز مائی...... کچھ مدد کر دو...... دو دن سے بھوکی ہوں' گھر میں اندھا باپ اور چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ دو دن سے بھوکے ہیں' اللہ آپ کو خوش رکھے۔ کوئی معصوم ہاتھوں کے کشکول میں معصوم چہرے پر ترس کھا کے کھانے کی چیز رکھ دیتا تو کوئی چند روپوں سے مدد کر دیتا۔ گاڑی چلنے کے بعد ہر بچے کے پاس لڈو اور ناجی پہنچ جاتے' جھٹ سے ان کو بھیک کی مد میں جو کچھ بھی ملتا وہ فوراً چھین کر بڑی سی کپڑے کی زنبیل میں ڈال کے انہیں خالی ہاتھ کر کے اگلے سگنل پر گاڑی رکنے پر پھر وہی عمل دہرانے کا حکم دے کے خود بھی بھیک میں مصروف ہو جاتا۔ نکی کے سامنے ایک نئی لگژری گاڑی رکی' اس کا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا وہ رٹے رٹائے جملے دہرانے کے لیے آگے بڑھی۔

''مائی اللہ کے نام پر کچھ دے دو' دو دن سے بھوکی ہوں۔'' گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے صاحب نے گاڑی کا شیشہ اوپر چڑھانے کے لیے ڈرائیور کو حکم دیا۔

''پتا نہیں کہاں سے آ جاتے ہیں' بھیک کو تو

اچھے بھلے لوگوں نے مستقل پیشہ بنالیا ہے، سگنل پر گاڑی رکی نہیں ان مانگنے والوں کے ڈرامے شروع۔'' حقارت بھری نظروں سے نکی کو دیکھ کے منہ میں بڑبڑایا' درمیان والی سیٹ پران کی اپنی بیٹی مزے سے چاکلیٹ کھارہی تھی اسے دیکھ کے بھوک اور بھی شدت سے ستانے لگی۔ اس نے بے بسی سے گاڑی کے قریب جاکے حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ جوڑ کے پھر وہی جملے دہرائے' کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ بھوک سے نڈھال گرنے والی تھی کہ کسی سخی عورت کی کار کا دروازہ کھلا اس نے ہاتھ بڑھا کے ایک سیب اور چند روپے اس کے ہاتھوں کے کشکول میں ترس کھا کے ڈالے۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوگئی' اس نے دل میں سوچا کہ وہ سیب خود کھالے گی اور روپے زنبیل میں ڈالے گی۔ چلو اس سیب سے بھوک تو کچھ کم ہوگی' یہ سوچ کے وہ سیب جونہی منہ کے قریب لائی لڈو نے جھٹ سے اس کے ہاتھ سے سیب اور پیسے چھین کر زنبیل میں ڈال دیئے وہ خود بھی بھکاری کا روپ دھارے ساتھ والے سگنل پر بھیگ مانگ رہا تھا۔

''لگتا ہے کل والی میڈم کی مار بھول گئی ہو' یہاں جو کمائی کرنی ہے وہ چپ چاپ میڈم کی زنبیل میں ڈالنی ہے' اپنے پیٹ میں نہیں ورنہ سنا نہیں میڈم جان سے مارڈالے گی۔''

بچے صبح سے شام تک مختلف سگنل پر کھڑے ہو کے بھیک مانگتے' رانی میڈم کے پاس مختلف شہروں سے اغواء کی ہوئی بچوں کی کثیر تعداد تھی وہ کسی ایک شہر میں سال سے زیادہ نہیں ٹکتی تھی جب اس کی اصلیت کھلنے لگتی وہ دوسرے شہر کوچ کر جاتی۔ لڈو' شامو اور ناجی اس کے ساتھ ساتھ

نظم

جشن برپا ہے تری آمد پہ یوں اے سال نو
کھل اٹھی ہیں دل کی کلیاں گل شگفتہ ہو گئے
جس قدر تاریک پہلو تھے گزشتہ سال کے
وہ امیدوں کے دلوں سے جگمگا کے رہ گئے
تیرا ہر پل ہو مسرت کی نوید اے سال نو
تیرا ہر دن روزِ روشن کی طرح براق ہو
تیری ہر شب چودھویں کی رات کا مصداق ہو
ہر کس و ناکس کے لب پر ہے دعا تیرے لیے
تو محبت کا پیمبر ہو پیامِ غم کا
مدتوں سے زندگی کی سانس ہے ترسی ہوئی
ہم سے مل جائیں
ہمیں بھی جان سے پیارے ہیں جو
راہ جن کی دیکھتے آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئیں
ہاں ملادے ہمیں اپنے پیاروں سے ہمیں
اے سال نو......!

تعظیم زونیہ...... کھاریاں

☆☆☆

سال نو

نتیجہ پھر وہی ہوگا سنا ہے سال بدلے گا
پرندے پھر وہی ہوں گے شکاری جال بدلے گا
بدلنا ہے تو دن بدلو بدلتے کیوں ہو ہندسے کو
مہینے پھر وہی ہوں گے سنا ہے سال بدلے گا
چلو ہم مان لیتے ہیں مہینہ ساٹھ سالوں کا
بتاؤں کتنے سالوں میں ہمارا حال بدلے گا
پیارے قارئین نئے سال کیلئے دعا کیجیے
بقول فیض
آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی فیض
ہم جنہیں رسم دعا یاد نہیں

خدایا...... 2015ء گزرگیا 2016ء کو ہمارے لیے بہتر بنا ہمیں امن، سکون، خوشحالی اور خوشی عطا فرما، آمین اہل وطن کو نیا سال 2016ء مبارک ہو

ایم جے قریشی...... ڈی آئی خان

ہوتے وہ جہاں جاتی جہاں رہتی وہ ہر جرم میں اس کے ساتھ برابر کے شریک ہوتے۔ وہ بچوں کو پکڑ کے اپنے ٹھکانے پر لا کے ان پر ظلم و تشدد کرتی' انہیں ڈرا دھمکا کے بھیک مانگنا سکھاتی جو بچہ زیادہ بھیک مانگ کے لاتا اسے پیٹ بھر کے کھانا ملتا اور جو بھیک کے پیسے کم لاتا اسے نہ کھانا ملتا بلکہ اسے مار پیٹ کر زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا۔ آدھی درجن کے قریب بچوں کو بے دردی سے ان کے ہاتھ یا پاؤں توڑ کے معذور بنا دیے گئے تھے۔ میڈم ایک ایک بچے سے دن بھر کی بھیک کا حساب لینے بیٹھی تھی۔

''ہاں بھئی لاؤ' کتنے ہیں لڈو! اس کے کتنے ہیں؟''

''میڈم چار سو روپے' ہاں چار سو روپے شاباش' اسے پیٹ بھر کے کھلانا' بچے کل سے اور زیادہ کوشش کرنا' ہاں بھئی اس کی کمائی کتنی ہے؟''

''اچھا...... ارے لڈو کوئی اپنے ہاتھ کی صفائی بھی دکھاتا ہے یا آج صرف بھیک پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔''

''میڈم کیوں نہیں آج زیادہ رش نہیں تھا صرف ایک ہی پرس مارا ہے۔'' اس نے دور سے ہی پرس میڈم کی طرف اچھالا۔

''ارے کچھ شرم کر بس یہی تیزی ساری فوج سے زیادہ تو ناجی اکیلی کماتی ہے۔ میرے پاس آنے سے پہلے تو تُو شہر کا مشہور جیب کترا تھا' یہ میرے پاس آتے ہی سب کو موت پڑ جاتی ہے۔ اچھا سن یہ نئی لونڈیا بھی چڑھی پٹڑی پر یا بس مفت کی روٹیاں توڑ رہی ہے۔''

''جی میڈم! پچاس روپے اس کی آج کی کمائی ہے۔''

''دھت تیرے کی...... بس پچاس روپے' آنا ذرا ادھر' دھندے پر جانے سے پہلے کیا سمجھایا تھا' روٹی کے لیے تو بڑا اگلا پھاڑ کے منہ کھولتی ہے۔''

''شامو! جلدی سے ٹوکا لا اس کمینی کے ہاتھ کاٹتی ہوں پھر یہ بھیک مانگے گی اگر یہ خود مانگنے کے لیے منہ نہیں بھی کھولے گی تب بھی کم از کم اس کی معذوری دیکھ کر لوگ ترس کھا کے تو کچھ دیں گے۔'' شامو کے لوٹنے سے پہلے ہی وہ معصوم میڈم کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے قدموں میں گر گئی۔

''آنٹی! خدا کے واسطے میرے ہاتھ مت کاٹیں' آج مجھے معاف کر دیں' کل سے میں زیادہ محنت کروں گی' خدا کے لیے آنٹی! آج معاف کر دیں۔''

''اے لونڈی! تمہارے پاس آج کی رات اور کل کا دن ہے' بہت ڈھیٹ مٹی ہو تم' چل جا آج تجھے معاف کیا مگر کل دو سو روپے سے کم لائی تو انجام تم جانتی ہو۔''

''ابے نکی! لا دے کتنے پیسے جمع ہوئے تیرے پاس' ارے یہ تو بہت کم ہیں ایک دو اور گاڑیاں دیکھ لے پھر چلتے ہیں۔ یہ تو بہت کم ہیں' اتنے پیسے میڈم کو بتائے تو وہ تمہارے ساتھ میرا بھی حشر نشر کر دے گی۔'' لڈو نے فکرمندی سے نکی کو ہدایت دی۔

''اللہ کے نام پر کچھ دے دو صاحب! دو دن سے کچھ نہیں کھایا ہے۔'' نکی نے ہاتھوں کا کشکول جیسے ہی آگے بڑھایا غفور کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''صاحب جی...... ارے یہ تو میری بھانجی ہے نکی! صاحب آپ گاڑی میں بیٹھیں میں ابھی آیا۔'' وہ تیزی سے گاڑی سے اتر کے اِدھر اُدھر بھکاری بچوں میں اسے ڈھونڈنے لگا' دونوں طرف رکی گاڑیوں کی لمبی قطاریں دیکھ کے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اس سے

پہلے کہ وہ غش کھا کے گرتا' دائیں طرف والی قطار میں ایک لنگڑا شخص نکی کا ہاتھ تھامے تیزی سے گاڑیوں کی لمبی قطاریں چیرتا ہوا بھاگتا نظر آیا۔

''نکی میری بچی...... رک جاؤ......'' اس سے پہلے کہ وہ ان تک پہنچ پاتا' سگنل کھل گیا گاڑیوں کا ساکن سمندر ایک دم حرکت میں آ گیا۔ عجلت میں ایک کار سے ٹکرانے کے بعد غفور سڑک پر دور جا گرا' اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا اس کا بھانجا زاہد اور اس کا صاحب اس کے سرہانے کھڑے تھے۔

''زاہد بیٹا...... صاحب آپ...... میں......''

''غفور کار سے ٹکرانے سے تمہارے سر میں چوٹ لگی تھی' فکر مندی کی کوئی بات نہیں ہے تم بالکل ٹھیک ہو۔'' صاحب نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کے پیار سے کہا۔

''صاحب جی میں کچھ دن کام پر نہیں آ سکوں گا آپ......''

''نہیں غفور! کوئی بات نہیں' تم جتنے دن چاہو چھٹی کر سکتے ہو' آؤ میں تمہیں اور زاہد کو گھر تک چھوڑ دوں۔'' غفور کی بات کاٹ کے صاحب نے اپنائیت سے کہا۔

''نہیں صاحب! آپ کا بہت شکریہ' ہم چلے جائیں گے دراصل سب سے پہلے مجھے اور زاہد کو تھانہ منڈی ٹاؤن جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے غفور! یہ کچھ پیسے رکھ لو تمہارے کام آئیں گے جہاں میری مدد کی ضرورت ہو تو مجھے لازمی بتانا' اللہ حافظ۔''

''تھانیدار صاحب میری بھانجی گم نہیں ہوئی بلکہ بھیک مانگنے والے گروہ نے اسے اغوا کر لیا ہے' آج سگنل پر بھیس بدل کے خود میں نے ان بھکاریوں کے ساتھ بھیک مانگتے دیکھا ہے۔'' اس نے تھانیدار کو تمام صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ' مگر تمہیں پکا یقین ہے کہ وہ تمہاری بھانجی نکی ہی تھی؟''

''جی ہاں جناب! بھلا میں اپنی نکی کو کیسے بھول سکتا ہوں۔''

''تھانیدار صاحب! خدا کے لیے کچھ کریں ورنہ ان بھکاریوں کا کیا بھروسہ ہماری نکی کو کہیں دور لے جائیں اور ہم ڈھونڈ ہی نہ پائیں یا اسے بیچ دیں یا کہیں خدانخواستہ......'' اس جملے کو ادھورا چھوڑتے ہوئے مستقبل قریب کے خدشات سے آگاہ کیا۔

''ہاں بات تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے ان کا کوئی بھروسہ نہیں جو معصوم بچوں کو پکڑ کے زبردستی بھیک منگواتے ہیں ان کے عزائم میں سمجھ سکتا ہوں بہرحال آپ لوگ بے فکر ہو جاؤ نکی میری بیٹی جیسی ہے یہ میرا آپ سے وعدہ ہے میں ابھی سارے شہر میں اپنے اہلکار پھیلا دیتا ہوں اور میں بذات خود اس آپریشن کی نگرانی کروں گا' بس آپ رابطے میں رہیے گا' ان شاء اللہ بہت جلد آپ کو آپ نکی مل جائے گی۔''

☆......☆......☆

''میڈم یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے اس طرح ہم سب لوگ پکڑے جائیں گے' پورے شہر میں پولیس پاگل کتوں کی طرح ہمیں ڈھونڈ رہی ہے۔ ہمارے آدمیوں نے بتایا کہ پولیس سول کپڑوں میں ہر بس اسٹاپ' سگنل پر ہماری ٹوہ میں ہیں۔ میں تو کہتا ہوں اس نئی مصیبت کی جڑ نکی کو ہم رات کے اندھیرے میں اپنے ڈیرے سے کہیں دور

جا کے چھوڑ دیتے ہیں ورنہ یہ لڑکی ہمارے سارے گروہ کو لے ڈوبے گی' ہمارے دھندے کا بھی ملیامیٹ ہوسکتا ہے۔'' شامو نے ڈرتے ڈرتے اسے نقطہ نظر سے آگاہ کیا۔

''اگر شکل اچھی نہ ہو تو کم از کم بات اچھی کرلیا کرو' تم چاہتے ہو کہ ہم نکی کو چھوڑ کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارلیں اور نہ آتی مصیبت بھی خود خرید کے اپنے گلے میں ڈال لیں۔ تمہارے دماغ میں عقل کی جگہ بھوسہ بھرا ہوا ہے' بھوسہ...... ارے نکی کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہے جو خاموشی سے اپنے گھر چلی جائے گی اور کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ ارے یہ آٹھ سال کی لڑکی ہے اچھا بُرا سب سمجھتی ہے' یہ تو بڑی مشکل سے ہم نے اسے ڈرا دھمکا کے قابو میں رکھا ہوا ہے اسے آزادی مل گئی تو سب کچھ اگل دے گی۔ اسے چھوڑنا مصیبت کو خود دعوت دینا ہے اس لیے بک بک بند کرو اس کا کوئی نہ کوئی حل سوچتے ہیں۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جب لنگڑے اور نکی کے پیچھے گاڑی والا دوڑا تھا' ہوسکتا ہے اس نے ہمارا ڈیرہ دیکھ لیا ہو اور پولیس کو اطلاع کردی ہو۔''

''میڈم میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے اگر تم......''

''تم اپنا منہ بند رکھو گے تو میں کچھ سوچوں گی' مینڈک کی طرح سب ٹرٹر کررہے ہو جس کے منہ میں جو آرہا ہے بکے جارہے ہیں۔'' اس بار میڈم کے غصے کا ایٹم بم لڈو پر گرا' وہ بھی خاموش ہوگیا۔ میڈم اٹھ کے اپنے کمرے میں چلی گئی باقی سب حتمی فیصلے کے انتظار میں وہیں بیٹھے تھے تھوڑی دیر کے بعد اپنے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ سجائے رانی میڈم کمرے سے باہر آئی سب اسے ٹک ٹک دیکھے جارہے تھے۔

''اب فیصلہ ہوگیا اب بیچ میں کوئی نہیں بولے گا' سب اپنی چونچ بند رکھیں گے۔ میری دلاور سے بات ہوگئی ہے' ہمیں رات ہونے سے پہلے ہی یہ شہر چھوڑنا ہوگا۔ اس کے لیے تم جا کے دلاور سے فوراً ملو' تمہارے ساتھ بس اور کچھ آدمی بھیجے گا' ہم لوگ اگلے بیس منٹ تک بچوں کو پیچھے کے راستے سے نکالتے ہیں اور پارک میں کھڑے ہوں گے جلدی کرو وقت بہت کم ہے۔'' میڈم نے شامو کی طرف اشارہ کیا وہ چپ چاپ سر ہلا کے نکلنے لگا تو میڈم کی آواز پر پھر رک گیا۔

''شامو کمینے...... مروائے گا تو اس حالت میں باہر جائے گا تو ذلیل انسان پہلے اپنا حلیہ تبدیل کر پھر جا اور جلدی پارک کے گیٹ پر پہنچ جانا' جا اب دفع ہوجا۔ ہم سب لوگ بھی وہیں پر تجھے ملیں گے۔''

☆......☆......☆

انہوں نے ابھی مشکل سے نصف گھنٹے کا سفر طے کیا ہوگا کہ اندرون شہر ہی بس کو ایک چیک پوسٹ پر پولیس نے روک لیا۔

''کون ہے بس میں' کدھر جانا ہے؟'' ڈرائیور سے چوکی انچارج نے قدرے کرخت لہجے میں استفسار کیا۔

''جی اسکول کے بچے ہیں' ٹرپ پر جارہے ہیں ساتھ میں خواتین ٹیچرز اور کچھ دیگر اسٹاف ہے۔'' ڈرائیور نے بڑی مہارت سے گولی دی۔

''سر! مجھے تو کچھ معاملہ گڑبڑ لگتا ہے جو اندر خواتین ٹیچر اور دیگر اسٹاف ہے نہ تو مجھے وہ شکل سے ٹیچر لگتی ہیں اور نہ ہی اسٹاف بلکہ اندر سات مشکوک قسم کے مرد بھی بیٹھے ہیں اور حیرت کی بات ہے تمام کے تمام بچے سوئے ہوئے ہیں۔''

حوالدار کی آخری بات اسے خطرے کی گھنٹی کی طرح سنائی دی اس نے فوراً مسلح جوانوں کو گاڑی گھیرے میں لینے کا اشارہ کیا اور خود حوالدار کے ساتھ پستول تانے اندر گھس گیا۔ لڈو سب سے آخری سیٹ پر بیٹھا تھا شیشے کے راستے فرار ہونے کے لیے اس نے جونہی چھلانگ لگائی پولیس کے جوانوں نے اسے دبوچ لیا۔

''ارے یہ آپ لوگ کیا کررہے ہیں' یہ ہمارے اسکول کے بچے ہیں کیوں ہمیں خوامخوا تنگ کررہے ہو؟'' رانی میڈم کا شور بس کے اندر ہی دم توڑ گیا۔

''حوالدار تم فوراً تھانہ منڈی ٹاؤن خبر کرو اور تین چار جوانوں کو اندر بھیجو۔'' تھانیدار نے ساتھ ہی رانی اور اس کے کارندوں پر پستول تان لی۔

''خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔'' اگلے لمحے رانی میڈم سمیت تمام گروہ کو بس سے اتارا گیا جس بچے کو بھی ہلایا جاتا وہ اپنی سیٹ پر ادھر اُدھر جھولنے کے بعد پھر سو جاتا۔ منڈی تھانہ ٹاؤن کی تمام نفری موقع پر پہنچ گئی۔

''ان حرام زادوں کو فوراً لے کر چلو اور بس کو فوراً اسپتال لے کر چلو' ان درندہ صفت انسانوں نے ان ننھے فرشتوں کو ہیوی ڈوز میں نشہ ور ادویات دی ہے اور تم فوراً میرے ساتھ اسپتال چلو۔'' تھانیدار نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔

تھانیدار کی ہدایت پر غفور' نکی کی ماں اور زاہد اسپتال پہنچ چکے تھے۔ گاڑی اسپتال کی حدود میں جونہی داخل ہوئی نکی کو ہوش آچکا تھا اس نے اپنے گھر والوں کو دیکھتے ہی دوڑ لگادی۔

''ماموں جی...... یہ بہت بُرے لوگ ہیں' بچوں کو اغوا کر کے ان پر ظلم کرتے ہیں۔ زبردستی ان کو بھکاری بناتے ہیں جو اُن کی بات نہیں مانتا اس بچے کو معذور بنادیتے ہیں۔ رانی آنٹی بہت ظالم ہے ماموں! گاڑی میں تمام بچے رانی نے اغوا کیے ہوئے ہیں' سب بچوں کو نشے کے ٹیکے لگائے ہوئے ہیں۔ ماموں! خدا کے واسطے سب بچوں کو بھی نیچے اتاریں ان کو بچائیں' ورنہ رانی آنٹی انہیں دوسرے شہر لے جائیں گی۔'' نکی روتے ہوئے اپنے ماموں سے لپٹ گئی۔

''ارے کہاں لے کے جارہے ہو مجھے تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو۔'' رانی میڈم نے چھڑانے کے انداز میں پولیس انسپکٹر سے کہا۔

''میڈم! تجھے تمہارے ننھیال لے کے جارہے ہیں' ان کو تمہاری بہت یاد آرہی ہے چل اندر بڑی آئی ہونہہ......'' پولیس انسپکٹر نے رانی کو بند کر کے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ساری عمر یہاں سڑو۔''

تمام بچوں کو ہوش آچکا تھا اور سب آزادی کی فضا میں سانس لے رہے تھے اور خوش تھے کہ انہیں ہوش آتے ہی ان کے معصوم ہاتھوں کے کشکول ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئے۔

راہ شناس

جواد حسیب علی

میں نے جو کچھ لکھا ہے شاید افسانے کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اس کوئی واضح انجام نہیں۔ کوئی مر نہیں گیا' ناامید، نامراد۔ کسی نے محبت میں آخرکار کامیاب ہوکر خوش کن و خوش گوار زندگی کا آغاز نہیں کردیا، اس میں کوئی ولن بھی نہیں جو آخرکار اپنے انجام کو پہنچا ہو، یہاں تو سب کردار زندہ سلامت ہیں۔ اپنی روش پر قائم، نئی آفات، نئے حادثات کے منتظر، یعنی جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ راہ شناس پر قائم و دائم۔ جہاں یہ کہانی ختم کی ہے وہیں سے آگے شروع کی جاسکتی ہے۔ واقعات و حادثات کا تسلسل برقرار، وہیں ٹھوکریں کھانا، گرنا، سنبھل جانا نئی ٹھوکر کھانے کے لیے یعنی اس کہانی میں یہ کردار ولن ہے خود اپنے لیے، ایک دوسرے کے لیے، جب ایسا کچھ ہو تو کہانی ختم نہیں ہوتی۔

میرے سامنے سہیلہ کھڑی تھی' رات کے دس بجے نیم تاریک سڑک پر گود میں چھوٹا سا بچہ لیے' ایک پُراسرار ہیولے کی طرح۔ تھوڑی ہی دیر پہلے میں بیوی کو لے کر اس کے میکے آیا تھا کہ سہیلہ کا فون آیا۔

''میں آپ کے گھر پر کھڑی ہوں' گھنٹی بجارہی ہوں لگتا ہے آپ لوگ موجود نہیں ہیں۔ انکل آپ کہاں ہیں' مجھے آپ سے ملنا ہے' بہت ضروری ہے۔'' وہ ایک سانس میں کہتی چلی گئی مجبوراً میں نے اس کو پتا بتادیا۔

''پھر کوئی گڑبڑ ہے' یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟'' موبائل بند کرتے ہوئے میں بڑبڑایا اور اب وہ سامنے کھڑی تھی' ٹیکسی واپس ہوئی تو میں نے پوچھا۔

''اب کیا ہوا؟''

''میاں نے مارا ہے' گھر سے نکال دیا۔ اب میں کہاں جاؤں اس بچی کو لے کر؟ آپ چلیں میرے ساتھ' سمجھائیں ان کو۔''

اس کی بات کاٹتے ہوئے میں نے کہا۔ ''میں کیا کروں گا جاکر' کیا لڑوں اس شخص سے اور پھر یہ سب ہوتا ہی کیوں ہے اور آخر کب تک یوں ہی ہوتا رہے گا؟'' میں نے جان چھڑانے کو بہت پینترے بدلے مگر وہ کہاں ٹلنے والی تھی اور پھر واقعی وہ کہاں جائے گی یہ سوچ کر میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سہیلہ کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوسری طرف سے جاکر گاڑی اسٹارٹ کردی۔

غیرآباد تو نہیں لیکن اچھا خاصا دور تھا' وہ علاقہ اور ویسا ہی تھا جیسے کراچی کے درمیانی طبقے والوں کے نواحی نئے علاقے ہوتے ہیں۔ گھر میں رسائی ذرا مشکل سے ہوئی وہ بھی جب اندھیری گلی میں کھڑی میری گاڑی اور پھر میری آواز سے اس نے مجھے پہچانا۔ اوپر بالکونی سے بات کرتا رہا اور پھر دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی جو شاید اس نے ریموٹ سوئچ دبا کر یا رسّی کھینچ کر کھولی ہوگی۔ جھگڑا بہت ہی پھسپھسا اور بے بنیاد سا تھا لہٰذا جلد



ہی ختم بھی ہوگیا۔ سہیلہ کا سوتیلا بیٹا جوتقریباً اس کا ہم عمر تھا اندر سے شربت کے گلاس لے کر آیا اور میز پر رکھ کے کونے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہاتھ تھوڑی کے نیچے ٹکا کر حالات کا جائزہ لینے کے انداز میں۔ شیشے کے دروازے کے اندر کی طرف ایک عورت آتی جاتی نظر آرہی تھی۔ ہم سمجھ گئے کہ بڑی بیوی ہے اور سن گن لینے کے چکر میں آس پاس گھوم رہی تھی۔

یہ عورت بھی سہیلہ کے سوتیلے بیٹے کی ماں نہیں تھی وہ دراصل سہیلہ کے میاں کی پہلی بیوی کا بیٹا تھا یعنی سہیلہ تیسری بیوی تھی۔ اپنی ڈپلومیٹک کاوش کی کامیابی پر مسرور و نازاں ہم واپس ہوئے۔

میرا خیال ہے کہ مجھے اب یہ بتا دینا چاہیے کہ سہیلہ کون ہے اور میں اس کے معاملات میں اس کے بہت ذاتی اور گھریلو قسم کے مسائل میں اس قدر دخیل کیوں ہوں۔

دس سال پہلے جب ہم نے اپنے نئے مکان میں رہنا شروع کیا تو سامنے والے گھر میں جو لوگ کرائے پر رہتے تھے ان کو مکان خالی کرنا پڑ گیا، پُرسکون ماحول اور متوسط تعلیم یافتہ طبقے کی آبادی کو دیکھتے ہوئے یہی علاقہ ان کو رہائش کے لیے مناسب لگتا تھا لہٰذا بہت گفت وشنید کے بعد وہ ہماری اوپر کی منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ خاتون بیوہ تھیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی باہر

تھی جبکہ ایک بیٹی اور بیٹا ان کے ساتھ۔ افراد کم تھے تو ہمیں بھی بظاہر کوئی پریشانی کی بات نظر نہیں آئی۔ ہمارے بیٹے بھی ابھی زندگی میں کوئی مستقل راہ کے متلاشی تھے ان کی شادیوں کی ابھی کئی سال کوئی امید نہیں تھی یعنی نیچے کا گھر ہمارے لیے بہت کافی تھا۔

تھوڑے ہی دن میں انکشاف ہوا کہ بیٹا امجد جو بیکار تھا اور باہر سے آنے والی بھائیوں کی کمائی پر تکیہ کیے ہوئے تھا' نشے کا بھی عادی تھا۔ مریم بیگم کو بیوگی اور معمولی سی معذوری نے بدمزاج بنا دیا تھا اور سے بیٹے کی حرکتیں۔ ماں بیٹے کے درمیان اکثر جھگڑا ہوتا تھا' بُری صحبت اور بیکاری میں پیسوں کی طلب تو رہتی ہے۔ جھگڑا نبٹانے کے لیے اکثر مجھے ہی اوپر جانا پڑتا تھا' ساتھ رہنے سے سارے عیب سامنے آجاتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان کو ہم میں بھی کچھ عیب نظر آتے ہوں۔

ہمارے بیٹوں کی بے زاری ظاہر ہونی شروع ہوگئی تھی' یہ لوگ ان کے اور اوپر والی کھلی چھت کے درمیان حائل ہوگئے تھے جہاں یہ ورزش کرتے رہتے تھے اور اب وہاں امجد چرس بھری سگریٹوں کے دم لگاتا تھا۔ بھائی کی عادتیں جتنی خراب تھیں' سہیلہ کے اطوار اتنے ہی اچھے تھے۔ نرم لہجے والی مودب سدا کلام میں مصروف رہنے والی۔ کپڑوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہفتے دس دن بعد دھو کر ڈال دیتی تھی' کمپیوٹر استعمال کرنا' خراب کرنا اور پھر لے جاکر اسے ٹھیک کرانا بلکہ خود ہی کرلیتی تھی وہ سب کچھ تھی۔ گاڑی چلالیتی تھی اور ماں کو ان کی پسند کی مارکیٹ سے خریداری بھی کرادیتی تھی۔ تیمارداری اور دواؤں کے اوقات کا خیال' سب کچھ...... باوجود اس کے کہ اس نے یونیورسٹی تک پہنچنے میں کامیابی نہیں حاصل کی' وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو کسی بھی اچھے گھر میں بیاہی جاسکتی تھی اور کامیاب گھریلو زندگی گزار سکتی تھی۔ اگر ہمارا کوئی بیٹا اس وقت کسی باقاعدہ نوکری میں ہوتا تو شاید ہم اس لڑکی کے بارے میں بھی سوچتے۔

ان لوگوں کے رشتے دار یا تو تھے ہی نہیں اور اگر تھے تو ان سے ملنا جلنا نہیں ہوگا۔ ورنہ کبھی تو نظر آتے جب گھروں میں مرد سرپرست نہ رہے اگر رہے تو بھی ...... چچا اور پھوپی والا رشتہ کمزور ہی پڑجاتا ہے' خاتون خانہ کی کاوشوں کے طفیل...... یہی وجہ تھی کہ سہیلہ کی ایک پھوپی اگر کبھی آجاتی تھیں تو سرد رویے کی وجہ سے جلد ہی ان کی واپسی ہوجاتی تھی۔

شوہر کے نہ رہنے سے اکثر عورتوں کا رویہ سسرالی رشتے داروں کے ساتھ ایسا ہوجایا کرتا ہے۔ ہاں کچھ لوگ اچانک اس طرح سے آنا شروع ہوجاتے تھے کہ گمان ہوتا کہ رشتے کی بات چل رہی ہے' چہل پہل باتوں اور کھانوں کی خوشبو سے اندازہ ہوتا تھا کہ بات آگے بھی بڑھ چکی ہے لیکن پھر اچانک وہی خاموشی اور ویرانی چھا جاتی کہ اندازہ ہوتا تھا کہ بات بنی نہیں البتہ میرا ایک ذاتی فائدہ اس تمام چہل پہل اور دعوت میں مضمر تھا۔ سہیلہ سوئٹ ڈش میں سے میرے لیے ضرور کچھ دے جاتی تھی' مریم بیگم کے امریکا والے بیٹے بڑے والے جب آئے تو ہم لوگوں کا تعارف بھی ان سے کرایا گیا۔ پتا چلا کہ وہ بنی نوع انسان کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں کہ جس کے خیال میں پیسہ اور صرف پیسہ اہم ہوتا ہے' جیسے بھی آئے جہاں سے بھی آئے۔

اس کے لیے جعلی پاسپورٹ' جعلی ویزہ'

کنٹریکٹ میرج‘ کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے کہ دنیا میں کامیابی کی واحد کنجی گرین کارڈ کا حصول ہے اگرچہ چار پانچ سال پہلے ہی وہ یہاں سے گئے تھے لیکن یہاں کے حالات سے اس درجہ بے خبر کہ گویا وہاں امریکا میں ہی پیدا ہوئے ہوں اور یہاں اس بچھڑے ہوئے ملک گھومنے چلے آئے ہیں۔ انہوں نے اپنی بہن کی اسمارٹنس نہیں‘ ڈرائیونگ اور دوسری خصوصیات کو دیکھتے ہوئے اس کے لیے نوکری کرنا بہت ضروری قرار دیا۔ وہ تو چلے گئے اور سہیلہ نے نوکری کے لیے پر تولے اور ایک عدد نوکری مل بھی گئی کسی معمولی سے ادارے میں معمولی سی نوکری۔ اس سے گھر کے خرچوں میں تو کیا ہاتھ بٹایا ہوگا‘ ہاں اپنا حلیہ ضرور بدل لیا اس نے اور اکثر استعمال ہونے والا عبایا نئی تراش خراش کے لباسوں میں کہیں گم ہوگیا۔ میں نے اسے دو چار بار گھر کے قریب شام ڈھلے کار سے اترتے دیکھا ایک سنہری سی نئی کار سے۔

ایک دن پتا چلا کہ وہ لوگ گھر چھوڑ رہے ہیں‘ ان کے پاس کسی نئے اور غیر آباد علاقے میں ایک پلاٹ تھا اس پر مکان بنانے کا فیصلہ ہوا اور یہ فیصلہ بھی کہ وہاں قریب ہی ایک چھوٹا مکان لے کر رہا جائے تاکہ مکان کی تعمیر کے دوران دیکھ بھال کی جاسکے‘ اس مکان کا انتظام بھی ہم کو ہی کرنا پڑا۔ انہوں نے ہمارا مکان چھوڑ دیا لیکن ہمیں یہ خبر بالکل نہیں تھی کہ وہ لوگ ہمیں کبھی نہیں چھوڑیں گے‘ کبھی بھی نہیں۔ اس بات کا اندازہ جلد ہی ہوگیا ان کے مکان چھوڑنے کا جشن ہمارے بچوں نے خوب منایا۔

تھوڑے ہی عرصے بعد مریم بیگم گھر میں ہی حادثاتی طور پر گر گئیں اور پیر کی ہڈی تڑوا بیٹھیں۔

خبر ملی تو ان کو اسپتال پہنچانا بھی ہماری ہی ذمہ داری ٹھہری' سہیلہ کو کچھ دوائیاں وغیرہ دلوا کر اسے اسپتال چھوڑنے جا رہا تھا کہ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ مریم بیگم، سہیلہ کو مارنے کے لیے لپکی تھیں کہ گر گئیں' توازن برقرار نہ رکھ سکیں۔ ''اب ہڈی ٹوٹ گئی ہے تو زندگی بھر طعنے مجھے ہی سننے ہیں' اب تو میں ہی ذمہ دار ٹھہروں گی ہمیشہ کے لیے۔'' سہیلہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''ارے تو کیوں مارنے کو لپکیں' کیا کہا تھا تم نے؟'' میں نے سامنے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے سوال کیا' کہنے لگی۔

''وہ تو اکثر مجھے مارتی ہیں' کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔'' مجھے اس کا لہجہ عجیب سا لگا' کئی بار میں نے اوپر سے مریم بیگم کے لہجے کے زیر و بم میں ہلکی ہلکی سسکیوں کی سنگت سنی تھی لیکن وہ اس معیار سے کم ہوتا تھا جو میری دخل اندازی کے لیے خود بخود طے ہو گیا تھا۔ اگر کبھی آوازیں تیز ہوتی بھی تھیں تو میرے زینے سے پوچھنے یا صرف کھکھارنے سے ہی خاموشی چھا جاتی تھی۔ بیٹے کی بات اور تھی اور اس کے لیے تو مجھے اوپر جا کر حالات پر قابو پانا پڑتا تھا' مگر یہ بیٹی کی روز روز کی پٹائی پر مجھے حیرت ہوئی۔

''تم اتنے دن سے مار کھا رہی ہو' آخر کیوں؟ اور یہ جو تمہارے اتنے رشتے آئے تو آخر شادی کیوں نہ ہو سکی؟ اس روز روز کی پٹائی سے تو جان چھوٹ جاتی۔'' یہ سب میں بے خیالی میں کہہ گیا مگر خود ہی شرمندہ بھی ہوا۔ ایک غیر اور کنواری لڑکی سے شادی کی بات کرنا مجھے خود بھی اچھا نہ لگا' چاہے وہ لڑکی مجھے انکل ہی کیوں نہ کہتی ہو لیکن وہ شاید سب کچھ بتانے پر تلی ہوئی تھی۔

''انکل! رشتے تو بہت آتے ہیں کئی بار تو ایسا لگا کہ معاملہ طے ہو گیا لیکن اچانک امی کوئی ایسی بات کر دیتی ہیں کہ وہ لوگ پلٹ کر نہیں آتے۔ کبھی وہ لڑکے کے علیحدہ مکان کی بات کر دیتی ہیں اور کبھی اس کو گھر داماد بنانے کی یعنی وہ بہرصورت ساتھ رہنا چاہتی ہیں۔ ایک بار تو یہ بھی ہوا کہ انہوں نے خود بھی میرے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی' دراصل ان کو خوف ہے کہ وہ اکیلی رہ جائیں گی بے یار و مددگار! امجد بھائی تو آپ کو پتا ہے کیسے ہیں' امی کا سارا کام میں ہی کرتی ہوں وہ تو کچھ بھی نہیں کرتے۔ اپنے کپڑے بھی وہ مجھ سے دھلواتے ہیں جو ان کو خود دھونے چاہئیں۔ بھائی باہر سے پیسے بھیج دیتے ہیں' ان کا کام ختم یہاں کے مسائل سے تو مجھے ہی نبٹنا ہے۔''

وہ نہ جانے اور کیا کیا کہتی رہی' مجھے یاد نہیں۔ میں بنیادی مسئلے پر ہی اٹک گیا تھا' ماں کا خوف تنہائی پھر میرا دھیان اسپتال کی پارکنگ میں جگہ ڈھونڈنے میں لگ گیا۔ دو تین ہفتے بعد مریم بیگم اسپتال سے واپس گھر چلی گئیں اور زندگی کے معمولات میں ہم بھی مصروف ہو گئے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ انہوں نے ہمارا مکان چھوڑا تھا ہم کو نہیں۔ ایک دن رات گئے فون آیا۔

''انکل آپ یہاں آ سکتے ہیں' یہاں سوسائٹی والے پولیس اسٹیشن میں......''

پولیس تھانے سے سب کو گھبراہٹ ہوتی ہے' وہ کہہ رہی تھی کہ جلدی آ جائیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا بہانہ بناؤں' کس طرح جان چھڑاؤں؟ اس معاملے میں بہت نکما ہوں' موقع پر کوئی بہانہ نہیں سوجھتا۔

''لیکن ہوا کیا؟ خیریت تو ہے؟'' میں نے سہیلہ کو سوالوں میں الجھانے کی کوشش کی' ادھر سے

نماز کی معافی نہیں

اللہ تعالیٰ جل شانہ کی تمام تخلیقات زمین، آسمان، سیارے، پہاڑ، سمندر، دریا، فرشتے اس کی حمد وثنا میں مصروف ہے۔ اللہ پاک رحیم بھی ہے جبار بھی ہے اللہ پاک اعلیٰ ہے اور عظیم ہے پھر اپنے لطف وکرم کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ میرا عذاب بھی عظیم ہے۔ اب ہمیں خود اندازہ کر لینا چاہیے کہ جو خود عظیم ہے۔ اس کا عذاب بھی عظیم ہے اللہ پاک کے ساتھ کسی کو شریک کرنا گناہ کبیرہ ہے کبیرہ سے مراد بڑا گناہ ہے۔ صغیرہ سے مراد چھوٹا گناہ۔ قیامت صغریٰ کا مطلب چھوٹی قیامت قیامت کبریٰ سے مراد بڑی قیامت۔ چھوٹی قیامت سے مراد کسی گھر میں حادثہ کی صورت میں کہرام برپا ہونا۔ یعنی اس گھرانے پر قیامت برپا ہوگئی۔ بڑی قیامت وہ ہوگی جب صور پھونکا جائے گا۔ انسانوں اور تمام نگلی گئی چیزوں کو زمین اللہ کے حکم سے اگل دے گی۔ سب سے پہلے انسانوں سے نماز کے بارے پوچھا جائے گا بے نمازی کو قبر میں عذاب بھگتنے کے علاوہ جہنم واصل کردیا جائے گا۔ ایک تو اللہ پاک کو شرک پسند نہیں دوسرا جو لوگ اس کے احکامات اور عبادت سے غافل ہوتے ہیں وہ پسند نہیں۔ کچھ ساگ' بھات اور حلوے کھانے والے دیہاتی ملاؤں نے مشہور کر رکھا ہے کہ پیر اپنے مریدوں کو بخشوائیں گے۔ پیروں کے آسرے پر لوگ نماز سے غافل ہوتے جارہے ہیں۔ یہ غفلت ان کو لے ڈوبے گی۔ پھر پچھتاوے کیا ہوت' جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ جعلی پیر خود جہنم واصل ہوں گے۔ نماز کی معافی نہیں ہے۔ کو دنبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں کبھی تجاہل عارفانہ سے کام نہیں لیا۔ تو مسلمان بھائیوں نماز کی غفلت سے اجتناب کرو' نماز قائم کرو اسی میں ہماری بہتری ہے۔

بشیر بھٹی ...... بہاولپور

جو جواب آیا وہ کچھ یوں تھا۔

''بھائی جان نے امریکا سے ڈیڑھ لاکھ روپے بھیجے تھے ہنڈی سے...... یہاں ایک فلیٹ سے پیسے وصول کر کے تاری' گاڑی میں بیٹھ رہی تھی کہ ایک شخص کندھے سے بیگ اتار کے بھاگ گیا وہ جس گاڑی میں بیٹھا تھا میں نے اس کا پیچھا کیا لیکن اس علاقے کی گول گول گلیوں میں ہی بھٹکتی رہی اور وہ گاڑی غائب ہوگئی' یہاں پولیس اسٹیشن پر میں نے شکایت درج کرادی ہے۔''

''تو اب میں آ کر کیا کروں گا؟'' میں نے پھر بچنے کی کوششیں کی۔ ''تم یہ پیسے چیک سے کیوں نہیں وصول کرتیں اور پھر اتنی رات گئے' اب تم گھر جاؤ صبح دیکھیں گے۔''

''نہیں انکل! میرا آپ سے ملنا ضروری ہے' اچھا میں خود آ رہی ہوں آپ کے پاس۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ آ گئی اور پھر جن صاحب کے ذریعے پیسے آئے تھے ان کا بھی فون آ گیا اور

پھر وہ خود بھی وارد ہو گئے۔ دراصل سہیلہ نے ان کا فون نمبر اور پتا پولیس کو بتادیا تھا اور وہ مارے گھبراہٹ کے سہیلہ کی تلاش میں نکل پڑے اور اس کے بتائے ہوئے پتے کی بدولت مجھ تک پہنچ گیا' تھانے سے کئی فون آچکے تھے ان کو......

''بھائی صاحب! اس لڑکی نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا ہے' آخر میں نے کیا کیا ہے۔ میرا نام پولیس کو کیوں بتادیا' میرا تو شیئرز کا کاروبار ہے یہ ہنڈی والا معاملہ تو سب گڑ بڑ کردے گا۔'' حاجی مبین ایک لمحے کو سانس لینے کو رکے تو میں نے اپنی بات شروع کردی۔

''دیکھیے حاجی صاحب! ان لوگوں کو چار چھ ماہ میں جتنی رقم دیکھنے کو ملتی ہے آپ تو ہر منٹ پر اتنی رقم اپنی انگلیوں سے گن کر نکال دیتے ہوں گے۔ اس لڑکی نے تو صرف پولیس کے سوالات کے جواب ہی دیئے تھے' آپ کا نام بھی آ گیا۔ آپ کو پتا ہے کہ یہ لوگ بال کی کھال نکالتے ہیں' پیسے کہاں سے آئے؟ کس کے ذریعے آئے؟ سب کچھ پوچھا ہوگا۔''

''جی جناب! آپ کو معلوم ہے ان لوگوں نے کیا الزام لگایا ہے مجھ پر؟ میں لوگوں کو ادائیگی کے بہانے مختلف جگہوں پر بلاتا ہوں اور خود ہی ڈاکو ان کے پیچھے لگادیتا ہوں۔'' حاجی مبین تقریباً رو دینے کی پوزیشن میں آ گئے تھے۔

میں نے کہا۔ ''اب رات بہت ہوگئی ہے' صبح ایک ملاقات اور رکھ لیتے ہیں' کوئی حل نکل ہی آئے گا۔'' میں نے ان پر واضح کردیا تھا کہ غلطی ان کی بھی ہے۔ چیک سے ادائیگی کیوں نہیں کرتے اور پھر اتنی رات کو کیوں بلایا پیسے دینے کو' کچھ نہ کچھ ازالہ تو کرنا ہی پڑے گا ان کو۔

صبح صبح حاجی صاحب کا فون آ گیا' سہیلہ کو اور مجھے قریب کے بینک میں بلایا تھا جہاں سہیلہ کا اکاؤنٹ تھا۔ چھینی ہوئی آدھی رقم انہوں نے سہیلہ کے اکاؤنٹ میں ڈالی اور پھر وہ اس کو لے کر پولیس اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ درخواست کی واپسی اور اپنا نام ریکارڈ سے ہٹانے کے لیے' وہاں ان کو دس ہزار روپے اور ادا کرنے پڑے جس کے بعد معاملہ کچھ ایسا ہوگیا کہ جیسے کچھ ہوا بھی نہیں تھا۔ کون سے پیسے' کیسی شکایت' کیسا ڈاکا اور کہاں کے حاجی صاحب۔

تھوڑے عرصے کے بعد ہی ایک مارکیٹ کے باہر سے سہیلہ کی گاڑی چوری ہوگئی' حسب معمول مجھے بلایا گیا میں تو انشورنس کلیم کا مشورہ ہی دے سکتا تھا۔ ہم تو ان کو فون کرنے سے بھی اجتناب کرتے تھے کہ پتا نہیں کون سا نیا مسئلہ ہمارا منتظر ہوگا۔ سوئے ہوئے شیر کو جگانا' ابلتی ہوئی ہانڈی پر ہاتھ رکھنا' شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑنا ویسے بھی سمجھداری کے خلاف ہے۔ کچھ عرصہ بعد مریم بیگم کا فون آیا۔

''ذرا جلدی سے بیس ہزار روپے کا انتظام کردیں' آپ کو جلد ہی ادا کردوں گی' سہیلہ کو بھیج رہی ہوں آپ کے پاس۔''

میں نے کہا۔ ''کل تک کی مہلت دیں' ابھی تو نہیں ہیں میرے پاس۔''

ادھر سے آواز آئی۔ ''دیکھئے' ابھی کردیجیے کسی طرح' بہت گڑبڑ ہوگئی ہے سہیلہ کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں اگر صبح ضمانت نہ ہوئی تو وہ جیل چلی جائے گی۔'' وہ اور پتا نہیں کیا کیا کہہ رہی تھیں میں نے بات کاٹ دی۔

''مختصر اور سیدھی بات بتائیے۔''

جواب آیا۔ ''کیا بتاؤں آپ کو اس کم بخت نے دو تین ماہ قبل شادی کر لی تھی' اپنے کمینے اور منحوس باس کے ساتھ' ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے بہت بڑا دھوکا۔ ہمیں لوٹ لیا گیا بے خبری میں' آپ سن رہے ہیں ذرا جلدی سے کچھ کر دیں۔''

''اور کراؤ اپنی اسمارٹ اور ذہین بیٹی کو نوکری۔'' دل چاہا کہ زور سے کہوں یہ بات ان سے لیکن ایک فوری رحم اور مروت کے جذبے کے تحت ارادہ ملتوی کر دیا۔ ان کی بات جاری تھی۔

''وہ ڈیفنس میں فلیٹ لے کر رہ رہی تھی' پچھلے ہفتے چھاپا پڑا شوہر موجود نہیں تھا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ فہیم گاڑیاں چوری کرواتا ہے اور نئی گاڑیاں قسطوں پر حاصل کر کے ان کے چوری ہونے کا ڈرامہ رچا کر انشورنس کا پیسہ وصول کرتا ہے۔ دوسری طرف گاڑی یا تو شہر سے نکل جاتی ہے یا پرزہ پرزہ کر کے بیچ دی جاتی ہے۔ پورا گروہ ہے اس کا' بھائی صاحب! وہ شخص تو شادی شدہ ہے اور اس کا سسر اس کے کاروبار میں برابر کا شریک ہے۔ چھاپے کے بعد ایک دن وہ سہیلہ کی غیر موجودگی میں آیا اور تمام ضروری کاغذات اور سہیلہ کا نکاح نامہ لے کر چلتا بنا' نکاح کے گواہ وکیل سب اس کے آفس کے ملازمین تھے۔ آفس بند ہے اور ملازمین فرار ہو چکے ہیں' اب تو شادی کا کوئی ثبوت بھی موجود نہیں ہے۔ ایک دن پولیس سے پتا لے کر سہیلہ اس کے گھر پہنچی تو فہیم کی بیوی نے اس کی خوب خبر لی' بلکہ اس نے تو پولیس میں رپورٹ لکھوا دی کہ ایک دھوکے باز عورت اس کے شوہر کو اپنا شوہر بتا کر جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔

بھائی صاحب! آپ سن رہے ہیں نا' اس کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں اگر کل صبح ضمانت نہ ہوئی تو

بکھرے ہیں موتی

جو شخص اس لئے اپنی اصلاح کر رہا ہے کہ دنیا اس کی تعریف کرے تو اس کی اصلاح نہیں ہوگی۔

اپنی نیکیوں کا صلہ دنیا سے مانگنے والا انسان نیک نہیں ہو سکتا۔

ریاکار اس عابد کو کہتے ہیں جو دنیا کو اپنی عبادت سے مرعوب کرنا چاہے

بے وقوف بول کر سوچتا ہے۔ عقل مند سوچ کر بولتا ہے۔

تکبر، ظلم اور غصہ عدل کا دشمن ہے۔

خوش رہیں اور دوسروں کو خوش رکھنے کی سعی کریں۔

کسی کی مدد کر کے اسے بھول جاؤ۔

بڑی چھلانگ لگانے کے لیے تھوڑا پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔

ارسلان احمد

سہیلہ گرفتار ہو جائے گی۔ وہ پتا نہیں کیا کیا کہتی رہیں ہذیانی انداز میں اور میں سوچ رہا تھا کہ کیسی تباہی آئی ہے اس خاندان پر۔ تسلسل سے حادثے ہو رہے ہیں' ایک مرد سرپرست کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے یہ سب کچھ بلکہ شاید مریم بیگم کی ناعاقبت اندیشی' ہٹ دھرمی اور بھائیوں کی بے پروائی کا نتیجہ ہے یہ۔ اچانک مجھے اس عورت سے نفرت ہو گئی' سوچوں میں گم نہ جانے کیسے میں نے روپوں کے انتظام کا وعدہ کیا مجھے یاد نہیں۔ کئی مہینے سے یہ شادی وغیرہ کی بات انہوں نے مجھ سے چھپائی ہوئی تھی۔

''اچھا تو رات کو دس بجے وہ اپنے وکیل کے ساتھ پہنچ جائے گی' آپ کے پاس۔'' یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کے پیسوں کی ڈکیتی

اور گاڑی کی چوری میں فہیم کا ہی ہاتھ ہوتا تھا۔ ماں بیٹی کے مشترکہ اکاؤنٹ سے پیسے بھی اس نے ہی نکالے تھے یہ بات بھی بعد میں پتا چلی' عزت مال متاع سب کچھ لوٹا اس نے دل بھر کے۔ سہیلہ اپنی کوئی بات اس سے راز رکھتی ہی نہیں تھی اور اس کا فائدہ اس نے خوب اٹھایا۔ وہ کب کہاں جا رہی ہے اور کتنی دیر کے لیے' سب کچھ وہ فہیم کو بتا دیتی تھی۔ یہاں تک کہ ماں بیٹی کے مشترکہ اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے' کتنی اس مہینے آنی ہے وغیرہ وغیرہ۔

رات دس بجے کے قریب جب ایک گاڑی میرے دروازے پر آئی اور سہیلہ اس گاڑی سے برآمد ہوئی تو پہلی نظر میں اس کو پہچان نہ سکا۔ عجیب اڑی اڑی سی رنگت خوف زدہ اور شکست خوردہ۔ میں نے پیسے اس کے ہاتھ میں دیئے' ساتھ آئے ہوئے وکیل سے میرا تعارف ہوا تو میرے سید ہونے کو اس نے کچھ اس طرح سراہا کہ گویا یہ میری ذاتی کاوش اور محنت کا نتیجہ ہو۔ سہیلہ کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہنے لگا۔

''یہ آپ کو انکل کہتی ہے' میرے لیے یہ بیٹی کی طرح ہے۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اس کی عزت اور اس کا مقام میں اس کو واپس دلاؤں گا۔'' اور پھر حیات محمد خان وکیل اپنی عجیب و غریب شخصیت اور سفید سر کو سمیٹ کر گاڑی میں بیٹھا اور دونوں گاڑی سمیت اندھیرے میں تحلیل ہو گئے۔ میں کھڑا سوچتا رہا کہ تقریباً چالیس سال کا تجربہ تو ہوگا اس کے پاس' وکیل کی شخصیت کو کیا دیکھنا۔ اللہ کرے وہ اپنی قابلیت اور تجربے کی بنا پر اس لڑکی کو مقدمے سے آزاد کرا لے جیل جانے سے بچا لے۔

دو مہینے بعد مریم بیگم کا فون آیا' کہہ رہی تھیں کہ آ کر پیسے لے جائیں' کیس ابھی چل رہا ہے' سہیلہ ضمانت پر ہے۔ مجھے شاید اس لیے بلایا تھا کہ بیٹے پر اعتبار نہ تھا' رقم ادھر اُدھر نہ کر دے۔ دو چار دن بعد وقت نکال کر ان کے گھر پہنچا اور پیسے وصول کیے۔

اس دوران سہیلہ کمرے سے برآمد ہوئی' بہت دن بعد اس کو دیکھا تھا۔ وہ بھی دن کی روشنی میں' سر جھکا ہوا چہرہ ویران جذبات سے عاری۔ خود اعتمادی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی' سلام کر کے کچن میں چائے بنانے لگی۔ کچن اور لاؤنج یا ڈرائنگ روم کے درمیان کوئی پردہ یا دیوار نہ ہو تو اسی کو امریکن کچن کہتے ہیں۔ بے حجابی اور امریکا لازم اور ملزوم جو ہیں' مریم بیگم نے کچھ زیادہ بات نہیں کی۔ وہ کیا بتاتیں سب کچھ تو مجھے معلوم تھا' میں ذرا جلدی میں تھا اس لیے اجازت لی۔

کچھ دن بعد فون آیا' میں گھبرا گیا کہ پھر کچھ ہو گیا کوئی نئی کہانی' نئی آزمائش' نئی پریشانی کہنے لگیں۔

''نہ کوئی فوری پریشانی ہے اور نہ کوئی ضرورت' بس آپ سے کچھ بات کرنی ہے اگر آ جائیں گے تو اچھا ہوگا۔''

میں منع نہ کر سکا اور دوسرے دن ان کے گھر پہنچا۔ بیٹا گھر کے باہر مزدوروں سے الجھ رہا تھا' نئے گھر کا کچھ کام باقی ہوگا شاید' اندر وہ تو تھیں پر سہیلہ نہیں تھی۔ مجھے سلام کر کے کہیں فون ملایا اور ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا' میں نے دوسری طرف سے سہیلہ کی آواز سنی' میں نے کہا۔

''میں تمہارے ہی گھر سے بات کر رہا ہوں' تم کہاں ہو؟'' اس نے پتا نہیں کیا جواب دیا میں سن نہ سکا کیونکہ مریم بیگم نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا تھا' اتنے زور سے کہ ساری آوازیں ان کی

آواز تلے دب گئیں۔

''اس کمینی نے ایسا کیوں کیا' ذرا پوچھیں اس سے۔''

''کیا کہا ہے اس نے؟'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''اس بڈھے خبیث وکیل سے اس نے شادی کرلی ہے' اس کی یہ تیسری یا شاید چوتھی شادی ہے' ذرا پوچھیں تو اس سے۔'' وہ مسلسل چیخ رہی تھیں۔

''ارے آپ ذرا سانس تو لیں۔ اتنے زور سے بولیں گی تو میں بات کیسے کروں گا۔'' میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے ان کو پرسکون حالت میں لانے کی کوشش کی۔ وہ خاموش تو ہوگئیں مگر میں کچھ پوچھ نہ سکا سہیلہ سے۔ میں سمجھا ہی نہیں تھا پوری بات' کیا بات کرتا یہ لوگ زندگی کی دوڑ میں گر کر سنبھلنے سے اکتا چکے تھے شاید...... مگر اس وکیل نے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے' سہیلہ کو بیٹی کہا تھا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے' مجھے وکیل سے وہ پہلی ملاقات یاد تھی' سوچوں میں گم میں واپس آ گیا۔

خاتون کے اپاہج ہونے کی بنیاد پر یا شاید علاج کی غرض سے ان کی امریکا کا ویزہ مل گیا اور سہیلہ کو بھی۔ پتا نہیں کس بنیاد پر' یہ بات مریم بیگم نے روانگی پر مجھے فون پر بتائی لیکن دو ہفتے بعد دوسرا فون آیا' امریکا سے انہوں نے اطلاع دی۔

''سہیلہ واپس چلی گئی پاکستان' ناراض ہوکر۔'' بھائیوں کے طعنے برداشت نہ کرسکی ہوگی میں نے دل میں سوچا۔

وہ بتارہی تھیں ہمارا یہاں آنے کا انتظام بڑی مشکل سے ہوا تھا' بہت خرچہ ہوا' سوچا تھا کہ یہاں سے اس کو وکیل سے طلاق یا خلع کی کارروائی کرکے اس کی کہیں اور شادی کردیں گے لیکن وہ

ناقدری بخت واپس چلی گئی اور عیار چالاک شوہر روانہ ہوتے وقت کہہ رہا تھا۔

''اسے لے جاتو رہی ہو لیکن یہ واپس آئے گی۔ اس کا ٹھکانہ اب میرا ہی گھر ہے' آپ مانیں یہ وکیل انسان نہیں کوئی اور مخلوق ہے۔ آسیب ہے یا جن ہے۔'' دیکھئے وہی ہوا جو اس نے کہا' اچانک ہی ایک دن سہیلہ نے جانے کا ارادہ کرلیا اور چلی گئی۔

جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا تھا کہ میں شوہر سے صلح کرانے سہیلہ کے گھر گیا تھا اس وقت اسے امریکا سے آئے کئی مہینے ہوچکے تھے۔ اس واقعے کے بعد پھر ان کا جھگڑا ہوا سہیلہ نے بتایا کہ سوت کی شکایت پر شوہر نے اس کو گھر چھوڑ دینے کا نوٹس دے دیا ہے۔ امی تو یہاں نہیں ہیں' اب میں کہاں جاؤں اس بچی کو لے کر' بات شاید پیسوں کی چوری کی تھی' اس الزام پر وہ آپے سے باہر ہوگئی نتیجتاً شوہر کی مار بھی کھائی اور نکل جانے کا حکم بھی ملا۔

میں نے حیات محمد خان کو فون کر کے سمجھانے کی کوشش کی تو کہنے لگا۔

''آپ یہاں آ کر اس کو میرے سامنے ڈانٹیں اور اس سے معافی مانگنے کا کہیں تو میں مانوں گا۔''

سہیلہ کے دو تین فون آ گئے ایک ہی شام میں' آخر میں نے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ مجھے گلی میں ہی مل گئی' بیٹی کو ڈاکٹر کو دکھا کر لائی تھی۔ مجھے دوسرے فلور پر لے جا کر ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ پہلا فلور اس کی سوت کا تھا' میں نے سوچا تھا کہ اس کا شوہر موجود ہوگا لیکن پتا چلا کہ وہ نہیں ہے اور ابھی بہت دیر تک واپسی کی توقع نہیں ہے۔

میں نے پوچھا ''جنت کی کیفیت ہے یا حالتِ امن؟''

''ابھی تک ناراض ہیں' آپ کے آنے پر ہی تو فیصلہ ہونا تھا۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا اور کھڑکی سے باہر تکنے لگی۔

''میں تو آ گیا ہوں لیکن وہ تو نہیں ہے اور میں روز روز آ نہیں سکتا۔ اب تم ایسا کرو کہ جب وہ آئے تو اس سے کہنا کہ انکل آئے تھے اور انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔ بہت زیادہ ناراض تھے' پتا نہیں آپ نے ان سے کیا شکایت کی ہے میری۔ اگر پھر بھی نہ مانے تو مجھے فون پر بتانا' میں اس سے بات کروں گا۔'' میں نے جو کچھ کہا اس نے پہلے تو کچھ سمجھا ہی نہیں' سمجھ میں آیا تو ذرا سا مسکرائی اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اچانک ایک خیال نے مجھے پریشان کر دیا' میں اس وقت سہیلہ کے کمرے میں تھا اس کی سوت بھی گھر پر نہیں تھی اور شوہر بھی۔ دونوں میں سے کوئی بھی کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ سوت تو سوت ہی ہوتی ہے اور اس قبیل کا شوہر جن کا اپنا کردار مشکوک ہو اور اوپر سے بیوی کے مقابلے میں اس قدر عمر رسیدہ ہوں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کتنے مشکوک اور گری ہوئی ذہنیت کے ہو سکتے ہیں۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ اٹھ جاؤں اس سے پہلے کہ معاملہ بگڑ جائے۔ چلتے ہوئے اچانک ہی مجھے مریم بیگم کی بات یاد آ گئی جب انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ذرا اس سے پوچھیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ میں رک گیا' پلٹا تو وہ میرے بالکل ہی قریب تھی' میں نے اس کی آنکھوں ہی جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا' کیوں شادی کی اس شخص سے؟'' اس نے نظریں جھکا لیں' کچھ تامل کے بعد اس نے بولنا شروع کیا' فرش کی ٹوٹی ہوئی

ٹائل کو اپنے پیر کے انگوٹھے سے کریدتے ہوئے۔
''دراصل میں نے اور میری امی نے بھی کچھ خواب دیکھے تھے' الگ الگ لیکن ایک جیسے۔ ہم سمجھے تھے کہ آپ کے گھر کی شکل میں ہمیں ایک ٹھکانہ مل گیا ہے' آپ کے بیٹے دوسرے والے کو۔ ہم دونوں نے اپنی امیدوں کا مرکز جان لیا تھا لیکن انہوں نے کبھی میری طرف توجہ ہی نہیں کی' پہل کرنے کی میری بھی ہمت نہیں ہوئی اور آپ لوگوں نے بھی شاید اس طرح سے کچھ سوچا ہی نہیں۔ میں شاید اس گھر کے قابل تھی ہی نہیں میری ماں کو خوف تھا کہ اگر میری شادی ہوئی میں دور چلی گئی تو وہ دربدر ہو جائیں گی پھر ہم نے آپ کا گھر چھوڑ دیا۔ میں اپنے باس کی باتوں میں آ گئی اور میں نے اس سے شادی کر لی کسی کو بتائے بغیر اور یہ شادی تھوڑے ہی عرصے میں سراسر فریب ثابت ہوئی۔ اگر ہار کر بیٹھ جاتی تو شاید کچھ ہی عرصے میں زخم بھر جاتے لیکن میں تو لڑنے پر تل گئی اور الٹا خود ہی مقدموں میں پھنس گئی۔ امی اور بھائی نے بالکل بھی ساتھ نہیں دیا' مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ مقدمے ختم ہوئے اور بصد مشکلات عدالتوں سے جان چھوٹی۔
اس دن...... آخری دن میں سارا وقت عدالت میں مصروف رہی' رات نو بجے تھکی ہاری' ٹریفک جام سے گزر کر گھر پہنچی تو امی کا پارہ کچھ زیادہ ہی چڑھا ہوا تھا۔ دروازے ہی پر مجھے تپا نہیں کیا کیا سننا پڑا' انہوں نے مجھ پر بدکرداری کا الزام لگایا۔ میرے احتجاج پر مجھے گھر سے نکال دیا' بہت دیر سخت سردی میں باہر کھڑی رہی' اس ویران علاقے میں کیا کرتی آپ کے گھر جانے کا خیال آیا لیکن شرم کے مارے رک گئی۔ قریب ترین وکیل صاحب کا گھر تھا' وہاں دوسرے ہی دن انہوں نے مجھ سے کہا۔
''تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں' لوگ کیا کہیں گے بہتر ہے ہم دونوں شادی کر لیتے ہیں اور میں نے ہاں کر دی' کیوں کیا میں کچھ غلط کیا مجھے کوئی اور راستہ ہی نہیں نظر آیا' کیا میں نے ٹھیک کیا ہے؟''
اس بار سہیلہ کی زبان ہی نہیں آنکھیں بھی مجھ سے سوال کر رہی تھیں اور پھر میں خاموشی سے زینے سے اتر گیا۔

ختم

دلچسپ و حیران کن معلومات

☆ کار سازی دنیا کی سب سے بڑی انڈسٹری ہے۔
☆ نیلی وہیل کی سیٹی کسی بھی جانور کی پیدا کردہ سب سے بلند آواز ہے۔
☆ مچھلیاں آپس میں باتیں کر سکتی ہیں۔
☆ کبھی بھی کھلی آنکھوں کے ساتھ چھینک نہیں آ سکتی۔
☆ کسی غار سے نکلتے وقت چمگادڑیں ہمیشہ بائیں ہاتھ مڑتی ہیں۔
☆ چوہا' اونٹ کی نسبت زیادہ لمبے عرصے تک پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔
☆ ہر سال سڑکوں پر پچاس ملین کاروں کا اضافہ ہوتا ہے۔
☆ خواتین مردوں کی نسبت دوگناہ تعداد اور رفتار سے اپنی پلکیں جھپکتی ہیں۔

عثمان عبداللہ......ملتان

آگ

دستگیر شہزاد

آگ کی نوعیت خواہ جیسی بھی ہو' اس کا کام اس کی لپیٹ میں آنے والی ہر شے کو بھسم کرنا اور تباہ کرنا ہوتا ہے۔
وہ بھی حسد اور انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ ایک دن اس کے اندر بھڑکتے ہوئے شعلے باہر آگئے تھے۔
زندگی کو سب کچھ سمجھنے والوں کا احوال' جرم و سزا کے موضوع پر ایک خوبصورت کہانی۔

۱۵ مئی ۲۰۱۱ء کو ٹیلی ویژن واسٹیج اداکارہ لیلیٰ خان کے والد نادر شاہ نے تھانہ سول لائن میں پہنچ کر بتایا کہ گزشتہ ماہ سے لیلیٰ اس کی ماں سلینا، بہن احمینہ، زارا اور بھائی ابوذر لاپتا ہیں۔ اس سے پہلے بھی ایک نیوز چینل کی رپورٹر نشاط شاہ پراسرار طریقے سے غائب ہوگئی تھی۔ لیلیٰ خان اور اس کے کنبہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج ہوئی تو اخبارات میں اس خبر کو سنگل کالم کی کوریج مل گئی بس اس خبر کے پھیلتے ہی شہر میں بحث اور افواہوں کا بازار گرم ہوگیا۔

شوبز والوں کو بھی لیلیٰ خان کی تلاش تھی اور اس کے لیے سب سے زیادہ پریشان تھے اداکارہ کرن ناز کے بھائی پروڈیوسر حمزہ بٹ۔

یاد رہے لیلیٰ خان کو ڈراموں میں پہلا بریک حمزہ بٹ نے ہی دیا تھا۔ ۲۰۰۱ء میں انہوں نے ڈرامہ ''بے وفا'' بنایا تھا اور اسی سال یہ ڈرامہ پلے بھی ہوا تھا۔ اس ڈرامہ میں حمزہ بٹ نے لیلیٰ خان کو اپنے زمانے کے سپر اسٹار شوکی خاں کے مقابل کاسٹ کیا تھا۔ بے وفا شوکی خان کا آخری ڈرامہ تھا۔ لیلیٰ خان شوکی خان کا آخری ڈرامہ تھا۔ لیلیٰ خان شوکی خان کے مقابل کام کرنے سے لائم لائٹ میں آ گئی تھی حالانکہ ڈرامہ فلاپ ہوگیا تھا۔

لیلیٰ خان کو چرچا میں آنے کا فائدہ بھی ہوا ایک طرف جہاں اسے کچھ ٹی وی سیریلز میں کام کرنے کا چانس ملا وہیں حمزہ بٹ نے اپنے ڈرامے ''جنات'' کے لیے ہیروئن ہی منتخب کرلیا۔

سائننگ اماؤنٹ کے طور پر حمزہ بٹ نے لیلیٰ خان کو ایک لاکھ روپے بھی دے دیے تھے جنات کی شوٹنگ بھی شروع ہوگئی کچھ دن تو لیلیٰ وقت پر شوٹنگ کے لیے آئی یونٹ کو اس سے تعاون بھی ملا۔ اس کے بعد اچانک ایسی غائب ہوئی کہ ڈھونڈنے سے بھی اس کا سراغ نہیں ملا، لیلیٰ کے معہ کنبہ غائب ہوجانے سے شوبز میں طرح طرح کی افواہوں اور چہ میگوئیوں نے زور مارا۔ کسی کا کہنا تھا کہ لیلیٰ خان اپنے کنبے سمیت دبئی شفٹ ہوگئی ہے۔ تو کسی کا قیاس تھا کہ لیلیٰ خان ہندوستانی خفیہ ایجنسی ''را'' کی ایجنٹ تھی۔ لاہور میں اس کا کام ختم ہوگیا تو وہ بھاگ کر اپنے کسی دوست کی پناہ میں ہندوستان چلی گئی۔ بہرحال سول لائن پولیس اپنے طبقے سے لیلیٰ وغیرہ کا سراغ لگانے کے لیے کوشاں تھی۔ اسی دوران نادر شاہ نے ایک بار پھر تھانہ سول لائن پہنچ کر معاملے کو نیا موڑ دے دیا۔

لیلیٰ وغیرہ کی گمشدگی میں وسیم احمد جٹ کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے۔ اس نے کہا۔ مجھے تو یہ بھی شک ہے



کہ وسیم نے ہی ان سب کو مار کر لاشیں غائب کر دی ہیں یہ وسیم احمد جٹ کون ہے۔ تفتیشی افسر چونکے۔
"سیلینا کا شوہر۔"
لیکن اس کے شوہر تو آپ ہیں۔ آفیسر نے کہا۔
ہوں نہیں تھا، نادر شاہ نے اب یہ گتھی سلجھاتے ہوئے کہا۔ "کئی سال قبل غازی پور کے گولی مار علاقے میں جب سیلینا اپنے کنبے کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ تب اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ جلدی یہ ملاقات پیار میں بدل گئی اور ہم نے شادی کر لی۔"
سیلینا کی اجمینہ، لیلیٰ، زارا اور ابو ذر نام کی چار اولادیں ہیں وہ مجھ سے ہی پیدا ہوئی ہیں بعد میں سیلینا نے مجھ سے طلاق لے کر آصف شیخ سے شادی کر لی۔ کچھ عرصے کے بعد سیلینا نے آصف شیخ کو بھی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اس نے وسیم جٹ سے تیسری شادی کر لی تھی جہاں تک مجھے علم ہے وسیم کی نگاہ سیلینا کی پراپرٹی پر تھی۔ اسی لیے اس نے عمر میں کئی سال بڑی سیلینا سے شادی کی تھی۔
"سیلینا وغیرہ کے پاس کتنی پراپرٹی ہوگی؟" آفیسر نے پوچھا۔ کروڑوں کی نادر شاہ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ سول لائن میں لیلیٰ کے نام ڈیڑھ کروڑ روپے مالیت کا ایک فلیٹ ہے۔ اسلام نگر کے کامپلیکس میں چالیس لاکھ قیمت کی ایک دکان ہے مال روڈ پر لیلیٰ خان کے ہی نام پچاس لاکھ کا ایک فلیٹ بھی ہے۔ اس کے علاوہ مبارک آباد میں بھی لیلیٰ کا

چار ایکڑ میں دو منزلہ فارم ہاؤس ہے جس کی اندازاً قیمت تقریباً 75 لاکھ روپے ہے۔ سیلینا احمینہ اور لیلیٰ کے پاس لاکھوں کی جیولری بھی ہے۔

اس کے علاوہ ان لوگوں کی اور کہیں جائیداد ہو تو مجھے معلوم نہیں۔

پولیس کے لیے مشکل کی بات یہ تھی کہ وسیم کا صحیح اور مکمل پتا نادر شاہ کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے بھی بس اتنا معلوم تھا کہ وسیم پتوکی کے آس پاس کسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ نادر شاہ نے پولیس کو یہ بھی بتایا کہ لیلیٰ کے پاس ٹیوٹا کرولا اور لینڈ کروزر دو کاریں تھیں۔ ان میں سے ایک کار کا استعمال وہ خود کرتی تھی جبکہ دوسری کار اس کے گھر والوں کے استعمال میں رہتی تھی۔ لیلیٰ وغیرہ کے ساتھ اس کی یہ دونوں کاریں بھی لاپتا ہیں اس کے علاوہ وسیم کا بھی کوئی اتا پتا نہیں ہے نادر شاہ نے پولیس کو یہ بھی بتایا کہ سیلینا اپنی چاروں اولادوں کے ساتھ مبارک آباد والے فارم ہاؤس میں گئی تھی ممکن ہے وہ پانچوں وہیں سے غائب ہوئے ہوں

پولیس کے اعلیٰ افسران کے کانوں تک جب یہ سارے شواہد پہنچے تو اس کیس کی چھان بین میں پولیس کی کرائم برانچ کی ٹیم وہاں پہنچی تو ایک سنسنی خیز سچائی سے اس کا سامنا ہوا آگ لگنے سے تعظیم الشان اور وسیع فارم ہاؤس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ تمام فرنیچر اور سامان وغیرہ جل کر راکھ ہو گئے تھے جو سامان جل نہیں سکا تھا وہ سیاہ پڑ گیا تھا دیواروں کا رنگ و روغن بھی بد رنگ ہو چکا تھا۔ اڑوس پڑوس میں پوچھنے پر پتا چلا۔

جنوری کے مہینے میں فارم ہاؤس میں آگ لگی تھی اور اس فارم ہاؤس کی دیکھ بھال شاکر حسین بانی نامی ایک واچ مین کرتا تھا لیکن آگ لگنے سے پہلے ہی اس کا کوئی اتا پتا نہیں ہے لیکن وہ بھی پتوکی کے کسی علاقے کا رہنے والا تھا۔

مبارک آباد میں جہاں لیلیٰ خان کا فارم ہاؤس تھا وہاں بجلی نہیں تھی فارم ہاؤس میں روشنی کے لیے ڈیزل سے چلنے والا ایک جنریٹر تھا بجلی ہوتی تو مان لیا جاتا کہ شارٹ سرکٹ سے آگ لگی ہوگی۔ جنریٹر مہینوں سے چلا نہیں تھا اور نہ ہی اس میں ڈیزل تھا ایسی صورت میں سوچنے والی بات تھی کہ بند فارم ہاؤس میں آگ کیسے لگی یا ثبوت مٹانے کے لیے لگائی گئی تھی۔

کرائم برانچ کی ٹیم نے وسیم احمد جٹ کو بھی مطلع کر دیا اور اس سے تعاون طلب کیا لیکن مہینوں بیت گئے اور نتیجہ صفر ہی رہا آخر کار پتوکی کے اے ایس پی ابرار احمد چوہدری کی کوششیں رنگ لائیں ایک مخبر کے ذریعے اسے معلوم ہو گیا کہ وسیم احمد جٹ نامی ایک شخص دیا نوالہ کا رہنے والا ہے چند سال پہلے وہ ٹی وی ڈراموں کا ہیرو بننے کے لیے لاہور آ گیا تھا شوبز میں وسیم کی دال نہیں گلی تو وہ واپس دیا نوالہ لوٹ آیا۔ مخبر نے چوہدری ابرار کو یہ بھی بتایا کہ جب وہ لاہور سے لوٹا تھا تب وہ دو مہنگی کاریں لے کر آیا تھا اس میں سے ایک کار دیسی تھی اور دوسری غیر ملکی تھی۔ دیسی ٹیوٹا کار تو دکھائی نہیں دے رہی ہے لیکن لینڈ کروزر اس کے گیراج میں پچھلے سال سے ہی بند ہے۔ وسیم نے اس کا استعمال بھی نہیں کیا وہ اسے اس طرح چھپا کر رکھے ہوئے ہے جیسے لاہور سے چرا کر لایا ہو۔ اے ایس پی ابرار احمد نے وسیم کے گھر چھاپہ مارا۔

وسیم تو گھر نہیں ملا مگر گیراج میں بند جاپانی گاڑی پولیس کو ضرور مل گئی جسے تھانہ لا کھڑا کر دیا گیا اس کار میں آگے پیچھے دونوں طرف کی نمبر پلیٹ غائب تھی چوہدری نے کار کے شیشے چیک کیے لیکن وہاں بھی نمبر نہیں ملا۔ پولیس نے کار کا انجن نمبر پولیس کی کرائم برانچ کو بھیج دیا کرائم برانچ کی ٹیم نے نمبر کی بنیاد پر متعلقہ رجسٹریشن اتھارٹی کے آفس میں چھان بین

کرائی تو سنسنی خیز اطلاع ملی وہ کار لیلیٰ خان کی ہی تھی اس لیے کرائم برانچ ٹیم نے چوہدری ابرار سے وسیم احمد جٹ کی گرفتاری کے لیے کہہ دیا۔ چوہدری ابرار نے خفیہ طریقے سے وسیم کے بارے میں پتا لگایا تو معلوم ہوا کہ قانون کے شکنجے کے خوف سے سنگاپور چلا گیا ہے اور کسی ایسی نوکری کی تلاش میں ہے جس میں اسے بھرپور پیسے کے علاوہ عزت بھی ملے۔

اب وسیم کے قریبی ساتھیوں کی مدد سے چوہدری ابرار نے اسے نوکری کا لالچ دیا اور اس تک اطلاع بھی پہنچا دی گئی کہ کار کے کاغذات دیکھتے ہی ریلیز کر دی جائے گی۔

اپنے آپ کو بے حد چالاک سمجھنے والا وسیم اے ایس پی ابرار احمد چوہدری کے جال میں پھنس کر ایک دن سنگاپور سے لوٹ آیا دوسرے دن اے ایس پی ابرار احمد سے ملنے ان کے دفتر پہنچا تو وہاں ہتھکڑی اس کا انتظار کر رہی تھی کار چوری کے الزام میں پتوکی پولیس نے وسیم کا چالان کر کے اسے جیل بھیج دیا اور کرائم برانچ کو مطلع کر دیا ادھر معاملے کی چھان بین میں لگی لاہور پولیس نے لیلیٰ کی ماں سیلینا کے ماضی کا پتا لگا کر سب کچھ معلوم کر لیا۔ تقریباً 35 سال قبل سیلینا اپنے کنبے کے ساتھ غازی پور کے علاوہ گولی مار میں رہنے آئی تھی اس وقت اس کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی۔ آبائی طور سے کنبہ سندھی تھا۔ نادر شاہ غیر ممالک میں ریڈی میڈ گارمنٹس ایکسپورٹ کرتے تھے کسی پارٹی میں نادر شاہ اور سیلینا کی ملاقات ہوئی اور پیار ہو گیا پھر بار بار ملاقاتیں ہونے لگیں نادر شاہ کو سیلینا کے بغیر چین تھا نہ سیلینا کو نادر شاہ کے بغیر اس لیے جلدی دونوں نے شادی کر لی دونوں کی زندگی خوشگوار گزرنے لگی۔ سیلینا کو پیسے کی چاہ تھی اور نادر شاہ کو خوب صورت واسمارٹ اور بولڈ شریک حیات کی دونوں کی خواہشوں کی تکمیل ہوگئی۔

رم جھم، ونڈ اسکرین، وائپر اور بوندوں کی ہر آن مٹتی دنیا' جس کی ہر ترتیب نئی تھی' اب اتفاقات نے چھوٹے سے چوکھٹے میں امکانات کا بے انت جہاں پالا ہے شادی کے سوا ڈیڑھ سال بعد ہی سیلینا نے ایک بیٹی کو جنم دیا نام رکھا۔ احمینہ اس کے چار سال بعد سیلینا کی دوسری بیٹی ہوئی' ریشماں اس کے چند سال بعد جڑواں اولاد کے طور پر سیلینا نے ابوذر اور زارا کو جنم دیا۔ بچے بڑے ہونے لگے۔ نادر شاہ کا دھیان اب رنگ رلیوں سے اچاٹ ہو گیا اور وہ پیسہ کمانے میں مصروف رہنے لگا اسی سلسلے میں وہ دو سال کے لیے یوگنڈا چلا گیا۔ نادر شاہ کے یوگنڈا جاتے ہی خواہش پسند سیلینا عیش پسند ہو گئی' شوہر کما کما کر گھر بھیجتا رہا بیوی اڑاتی رہی' دو سال بعد نادر شاہ کی کمی وہ دوسرے تو جوانوں سے پوری کرتی تھی۔ جو نوجوان اسے خوش کر دیتا تھا۔ اسے خوش رکھنے کے لیے وہ اس پر دونوں ہاتھوں سے دولت خرچ کرتی تھی۔ بیوی کی بے راہ روی سے نادر شاہ کے دل کو گہری ٹھیس لگی۔ دونوں میں جھگڑے شروع ہو گئے اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن نادر شاہ نے سیلینا کو طلاق دے دی۔ نادر شاہ اپنے چاروں بچوں کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے مگر سیلینا کو یہ منظور نہیں تھا اس لیے وہ بچوں کو لے کر الگ گھر میں رہنے لگی اسی سال سیلینا کی ملاقات آصف شیخ سے ہوئی۔ آصف شیخ ایک پراپرٹی ڈیلر اور بلڈر تھا دھن دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی اور وہ چونتیس سال کا تھا جبکہ سیلینا پینتیس سال پورے کر چکی تھی پھر اس دوران ہی دونوں نے شادی کر لی اور سیلینا اپنی چاروں اولادوں کے ساتھ آصف شیخ کی بیوی بن کر رہنے لگی۔

انہی دنوں نادر شاہ نے بھی اپنی پسند سے دوسری

شادی کرلی اور گولی مار کا علاقہ چھوڑ کر مال روڈ پر واقع ایک اپارٹمنٹ میں فلیٹ خرید کر اس میں رہنے لگا۔

خوب صورت سیلینا کی چاروں بچے بھی بے حد خوب صورت تھے۔ البتہ دوسرے نمبر کی بیٹی ریشماں کی بات ہی الگ تھی۔ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ تیز دماغ خواہش پسند اور ماں کی طرح کھلے خیالات کی مالک تھی۔ اس کے دل میں بچپن سے ہی شوبز میں آنے کی دھن سوار تھی اس نے اپنا خوب صورت فیلیو بنوایا اور ٹیلی ویژن سنٹر کے چکر کاٹنے لگی۔ اسے کامیابی بھی ملی، کچھ ٹی وی سیریلز میں اسے چھوٹے موٹے کردار بھی مل گئے۔ ٹی وی اسکرین پر چہرہ نظر آنے سے ریشماں کا پورا کنبہ بھی خوش تھا۔

لیکن ریشماں زیادہ خوش نہیں تھی وہ ٹی وی سیریلز کو اپنا پڑاؤ مانتی تھی منزل نہیں، اس کی منزل تو اسٹیج ڈرامہ تھا یہاں بھی اس کی کوششیں جاری تھیں یہاں بھی وہ کامیاب ہوئی، حمزہ بٹ کے اسٹیج ڈرامہ وفا میں اسے شوکی خان جیسے نامی گرامی ستارے کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور اپنا نام بھی ریشماں شاہ سے لیلیٰ خان کر دیا۔ اس دوران نادر شاہ کبھی کبھی بچوں سے ملنے آ جاتا تھا سیلینا اور آصف شیخ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا نادر شاہ نے ہی کرائم برانچ کے سینئر انسپکٹر کاشف علی گرو کو بتایا کہ سیلینا نے نجانے کن اسباب کی بنا پر آصف شیخ کو اپنی زندگی سے الگ کر کے وسیم احمد جٹ سے تیسری شادی کرلی تھی اس کے بعد سول لائن میں واقع اس فلیٹ میں چاروں بچوں کے ساتھ رہنے چلی گئی تھی۔ جو لیلیٰ کے نام تھا اس فلیٹ کی قیمت ڈیڑھ کروڑ سے زائد تھی۔

کرائم برانچ کی ٹیم نے اس درمیان لیلیٰ کی جائیداد کی جانچ کی کہ کروڑوں کی جائیداد کے لیے اس کے پاس پیسہ کہاں سے آیا تو پتا چلا کہ فارم ہاؤس ہو، فلیٹ یا دکان لیلیٰ خان نے کچھ نہیں خریدا تھا بلکہ جائیداد اسے تحفے میں ملی تھی۔

بہر حال رنگیلی بوڑھی سیلینا نے آصف شیخ کو چھوڑ کر اس سے بھی کم عمر والے وسیم کا ہاتھ کیوں اور کن حالات میں تھام لیا تھا یہ تو وسیم ہی بتا سکتا تھا۔

اور وسیم کوٹ لکھپت جیل میں تھا اس لیے اسے ٹرانزٹ ریمانڈ پر لینے کرائم برانچ کی ایک ٹیم کوٹ لکھپت جیل پہنچ گئی اور وسیم کو طلبی حکم نامہ کے ساتھ تھانہ لے آئی تھانہ پہنچتے ہی وسیم سے طویل پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہو گیا وسیم سمجھ چکا تھا کہ دو سال بعد بھی لیلیٰ اور اس کے کنبے کا خون اب سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس لیے اس نے پوری داستان سلسلے وار بیان کر دی۔ بتیس سالہ وسیم جٹ ڈبانوالہ کا باشندہ تھا اس کے والد کا نام اقبال جٹ اور ماں کا نام فردوس تھا اقبال پیشے سے زمیندار تھا اور زرعی فصلوں کا بیوپار کرتا تھا۔ وسیم کا دل پڑھائی میں کم اور اونچے خواب دیکھنے میں زیادہ لگتا تھا۔

دسویں میں فیل ہونے کے بعد وسیم نے پڑھائی کو چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں تک باپ کے ساتھ کام کرنے کے بعد اس نے پیشہ چھوڑ دیا اور الیکٹرک پاور پروجیکٹ میں ملازم ہو گیا لیکن تنخواہ کم تھی اس لیے یہ ملازمت بھی اسے زیادہ عرصے تک باندھ کر نہیں رکھ سکی۔ اس لیے یہ بھی اس نے چھوڑ دی اور چھوٹا موٹا بیوپار کرنے لگ گیا اس کے بعد سیاست میں آ گیا اور نیشنل کانفرنس پارٹی میں شامل ہو گیا الیکشن لڑا اور ہار گیا۔ پارٹی صدر نے نمائندوں کی شکست کے اسباب کا جائزہ لینے کے لیے انہیں اسلام آباد بلایا تو وسیم بھی گیا۔ وہیں شکیل احمد کے مکان میں اس کی ملاقات سیلینا سے ہوئی وسیم اور سیلینا کی یہ دوسری ملاقات تھی، پہلی ملاقات گزشتہ سال تب ہوئی تھی

جب وسیم پارٹی میں شامل ہونے کے لیے اسلام آباد آیا تھا۔ شکیل احمد نے اس کی ملاقات سیلینا سے کرائی تھی۔ الیکشن ہارنے سے وسیم سخت مایوس تھا اور اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ اس بارے میں اس نے سیلینا سے بات کی تو وہ بولی۔

سیاست گیری چھوڑو اور لاہور آجاؤ اس کے بعد دیکھنا میں تمہاری قسمت کیسے چمکاتی ہوں، آج کل ہر نیا پروڈیوسر اپنی نئی سیریل میں نیا ہیرو لانچ کر رہا ہے چاہو تو میں تمہیں ٹیلی ویژن میں کام دلوا سکتی ہوں۔ میں نے اپنی بیٹی لیلیٰ خان کو ہیروئن بنوا ہی دیا ہے۔

نوعمری میں وسیم ہیرو بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ سیلینا کی باتوں سے اس کے دل میں دبی اس کی خواہش بھڑک اٹھی اور کچھ دنوں بعد ہی لاہور پہنچ گیا۔ لیلیٰ خان کا مال روڈ والا فلیٹ خالی تھا۔ سیلینا نے اس کے رہنے کا انتظام اس میں کر دیا ایکٹنگ اسکول میں داخلہ دلانے کے لیے وسیم نے سیلینا کو دو لاکھ ۶۶ ہزار روپے بھی دے دیے۔

پہلے تو وسیم احمد یہی سمجھتا رہا کہ سیلینا اپنی بیٹی کے لیے اس پر مہربان ہے مگر پھر جلدی اسے معلوم ہو گیا کہ لیلیٰ نہیں اس کی ماں سیلینا خود امیدوار تھی مرد خور سیلینا نے ایسا جال بچھایا کہ مال روڈ والے فلیٹ میں ایک رات وسیم تن من سے اس کا ہو گیا۔ سیلینا نے چند ہفتوں کے اندر ہی آصف شیخ کی چھٹی کر کے وسیم سے نکاح کر لیا۔

سیلینا نے اسے ہیرو بنانے کے لیے بلایا تھا مگر بنا لیا شوہر۔ ایکٹنگ اسکول کے نام پر وسیم نے جو پیسہ دیا تھا اسے بھی وہ ہضم کر گئی کچھ عرصہ گزرا تو وسیم کی سمجھ میں آ گیا کہ ماں بیٹی دونوں بگڑی ہوئی ہیں سیلینا بے حد چالاکی سے اپنی ایکٹریس بیٹی کو کیش کرا رہی ہے اور اپنی ہوس کا خود وسیم کو ایندھن بنا رہی ہے۔

لیلیٰ سے اس کے سول لائن میں واقع فلیٹ میں ملنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ لاہور ہی نہیں دور دراز کے اضلاع سے اس کے چاہنے والے آتے رہتے تھے۔ وہ صرف ملنے ہی نہیں آتے تھے کچھ نہ کچھ قیمتی تحفے تحائف بھی دے کر جاتے تھے انجان نگاہوں کا لمس دل میں اترتے ہی ہاتھ پر ہاتھ کے نرم دباؤ کا تحفہ ملا لیکن آنا فانا یہ ایک لحہ ناتمام لذت کا نڈھال پن چھوڑ کر ماضی سے جا ملا۔ ان کہی سے کوئی بات گھر میں گونجتی رہی رات کو گھڑی گھڑی نیند ٹوٹتی رہی۔

دھیرے دھیرے وسیم کو سیلینا کے کنبے میں اپنی حیثیت کا بھی اندازہ ہو گیا دنیا کو دکھانے کے لیے سیلینا یا لیلیٰ خان سے کوئی ملنے آتا تو اس کے لیے چائے ناشتہ یا کھانے پینے کا انتظام وسیم ہی کو کرنا پڑتا تھا یہی نہیں جھوٹے برتن اٹھا کر کچن میں لے جانا اور انہیں دھو پونچھ کر رکھنا بھی وسیم کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ کاروں کی صفائی کا ذمہ بھی وسیم کا تھا وسیم کے کام سے کنبہ کا کوئی فرد ناراض ہو جاتا تو اسے نازیبا کلمات بھی سننے پڑتے تھے اتنی بے عزتی برداشت کرنے کے باوجود وسیم سیلینا کے گھر میں اس لیے ٹکا ہوا تھا کہ ان لوگوں کے پاس کروڑوں کی جائیداد تھی۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی وسیم کے دل کے کسی گوشہ میں امید تھی کہ کبھی نہ کبھی آدھی جائیداد اسے مل ہی جائے گی آدھے کا مالک ابوذر اور آدھے کا مالک وہ۔

انہی دنوں وسیم نے سیلینا اور آصف شیخ کو سول لائن کے فلیٹ میں قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا۔ وسیم نے شور مچایا تب اس کے سامنے راز کھلا کہ آصف شیخ سیلینا کا دوسرا شوہر تھا اور وسیم سے شادی کرنے کے بعد بھی اس نے آصف شیخ سے اپنا رشتہ ختم نہیں کیا تھا۔

راز کھل گیا تو پھر وسیم کے سامنے ہی آصف شیخ،

سیلینا سے ملنے آنے لگا اسی دوران سیلینا نے مال روڈ کا اپنا بنگلہ لوگوں کے فنکشن کے لیے 10 ہزار روپے فی رات کرائے پر دینا شروع کردیا فارم ہاؤس کی دیکھ بھال کا فرض بھی وسیم کے ذمہ تھا وہاں بھی پارٹیاں ہوتی تھیں وہ دیکھتا پارٹی کے نام پر وہاں فحاشی ہوتی تھی۔ شراب و شباب کی ندی بہتی ہے اور لوگ جی کھول کر اس میں ڈبکیاں لگاتے ہیں ایک دن وسیم کو پتا چلا کہ سونو نامی نوجوان لیلیٰ کی زندگی میں ہے اس سے لیلیٰ نے شادی کرلی ہے۔ وہ لیلیٰ ہی نہیں اس کے پورے کنبے کو ہی دبئی لے جانا چاہتا ہے سونو نے وسیم کے علاوہ سب کے پاسپورٹ بنوا دیے تھے۔ سیلینا اسے اپنے ساتھ دبئی نہیں لے جارہی وہ اسے لاہور میں اپنی غیر منقولہ جائیداد کا چوکیدار بنا کر چھوڑ جانا چاہتی ہے۔ یہ بات وسیم کے دل میں تیر کی مانند چبھ گئی۔

اس سے بھی بڑا صدمہ اسے یہ جان کر ہوا کہ سیلینا وغیرہ نے اپنی پوری جائیداد کی پاور آف اٹارنی آصف شیخ کے نام کردی ہے۔ سیلینا کے دبئی شفٹ ہونے کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو آصف کو ساری جائیداد فروخت کرکے پیسہ سیلینا کے پاس بھیج دینا تھا۔

بس سیلینا کا منصوبہ سمجھتے ہی وسیم کی کھوپڑی گھوم گئی اور اس نے ایک خطرناک منصوبہ بنالیا۔

منصوبے کے تحت اس نے حادثے سے دو مہینے پہلے ڈبانوالہ سے اپنے با اعتماد دوست شاکر حسین بانی کو لاہور بلایا اور سیلینا سے کہہ کر اسے مبارک آباد میں واقع فارم ہاؤس کا چوکیدار مقرر کرادیا۔ اس کے بعد وسیم نے سیلینا کو پٹی پڑھائی۔ فارم ہاؤس میں پانی کی کمی ہے میں چاہتا ہوں کہ وہاں انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک بنوا دیا جائے ٹینک بن جانے سے فارم ہاؤس میں پانی کی کمی نہیں ہوگی پانی کے مسئلہ سے سیلینا بھی پریشان تھی اس لیے اس نے وسیم کو ٹینک بنوانے کی اجازت دے دی اور پچاس ہزار روپے بھی دے دیے۔

وسیم نے فارم ہاؤس کے پڑوس سے مزدوروں کو بلا کر فارم ہاؤس کے پچھواڑے ۸ فٹ لمبا ۸ فٹ چوڑا اور ۶ فٹ گہرا گڑھا کھدوایا۔

منصوبے کے مطابق ایک دن وسیم نے سیلینا سے کہا تم دبئی جارہی ہو، تم لوگوں کے دبئی جانے سے پہلے فارم ہاؤس میں ایک الوداعی پارٹی رکھنا چاہتا ہوں۔ سیلینا مان گئی اور ایک دن شام کو وہ ایک رشتے دار ریشماں عرف ٹلو اور وسیم کے ساتھ فارم ہاؤس پہنچ گئی لیکن وسیم کا ارادہ پورے کنبے کا صفایا کرنے کا تھا اس لیے اس نے ان دونوں کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اسے تو لیلیٰ خان وغیرہ کے آنے کا انتظار تھا جب تک لیلیٰ وغیرہ مبارک آباد نہیں پہنچے تو وہ ٹلو کے ساتھ واپس سول لائن میں واقع لیلیٰ کے فلیٹ میں پہنچا۔ جہاں لیلیٰ، انجمینہ، زارا اور ابوذر مبارک آباد فارم جانے کے لیے تیار تھے اور پھر لیلیٰ انجمینہ، زارا اور ابوذر کے علاوہ سیلینا اور ریشماں بھی اپنی ٹیوٹا کار سے مبارک آباد فارم ہاؤس پہنچ گئے شام ہوتے ہی پارٹی شروع ہوگئی تیز موسیقی پر زارا، ابوذر اور ٹلو کے ساتھ لیلیٰ بھی تھرکنے لگی۔ اس کے بعد کھانے پینے کا لطف اٹھایا گیا۔ دیر تک پارٹی چلتی رہی۔ اس کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں سونے چلے گئے۔ سیلینا بھی وسیم کو لے کر فرسٹ فلور کے بیڈ روم میں چلی گئی۔ سیلینا رات رنگین کرنے کے موڈ میں تھی لیکن وسیم کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔

بیڈ روم میں پہنچتے ہی سیلینا نے آصف شیخ کے قصیدے پڑھنے شروع کردیے کہ وہ اسے کس قدر خوش کردیتا ہے۔ اسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہوگیا جھگڑا بڑھ گیا تو وسیم کو گالیاں دیتے اور کوستے ہوئے سیلینا کمرے سے نکل کر گراؤنڈ فلور پر آگئی اس کے

پیچھے پیچھے وسیم بھی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا سیڑھیوں کے پاس ہی لوہے کا ایک راڈ رکھا تھا وسیم نے اسے اٹھا کر پوری طاقت سے سیلینا کے سر پر وار کر دیا۔ ایک ہی وار میں سیلینا کی گھٹی گھٹی چیخیں سن کر ابوذر وہاں آ گیا وسیم نے چوکیدار شاکر بالی کو آواز دے کر بلایا تو شاکر بھی وسیم کی مدد کو آ گیا دونوں نے مل کر راڈ اور چاقو سے ابوذر کو بھی مار دیا۔

دو لاشیں بچھ چکی تھیں اب وسیم کو سیلینا کے باقی کنبے کا خاتمہ کرنا تھا اس کے بعد احمینہ، لیلیٰ، زارا اور ریشما عرف ٹلو بھی ایک ایک کر کے ان دونوں کی حیوانیت کا شکار بن گئے۔

جب کنبہ میں کوئی بھی زندہ نہیں رہا تب جا کر وسیم کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا شاکر کی مدد سے اس نے سبھی لاشوں کو ٹینک کے لیے بنائے گئے گڑھے میں ڈال کر اسے پاٹ دیا چاقو اور راڈ بھی دفن کر دیے اور رات میں ہی وسیم اور شاکر لیلیٰ کے سول لائن والے فلیٹ پر گئے وہاں سے انہیں جتنی نقدی اور زیورات ملے سب اپنے قبضے میں کر لیے اس کے بعد وسیم نے ایک ٹریول ایجنسی سے ایمان علی اور محبوب نامی دو ڈرائیور کرائے پر لے لیے لینڈ کروزر اور ٹیوٹا لے کر مبارک آباد سے اسلام آباد موج مستی کرتے ہوئے ڈبانوالہ چلے گئے۔ کاریں وہاں پہنچا کر دونوں لاہور لوٹ آئے تھے۔

وسیم نے سیلینا کے پورے کنبے کا صفایا تو کر دیا تھا لیکن جب لیلیٰ خان اور اس کے کنبے کے پراسرار طور پر غائب ہونے کی خبریں شوبز میں اٹھنے لگیں تو ایک دن وہ پھر مبارک آباد لوٹا تھا اور فارم ہاؤس کو آگ لگا دی تھی تاکہ فارم ہاؤس کے اندر خون کے داغ یا جو بھی اس کے خلاف ثبوت ہیں وہ سب خاک ہو جائیں زمین سے سب سے بڑی چیز جو نظر آتی ہے وہ آسمان ہے اور اندھیرا ہوتا ہے۔

جب اپنے بچوں سے ملنے کے لیے نادر شاہ پریشان ہو گئے تب وہ اپنی فریاد لے کر ۵ مئی ۲۰۱۱ء کو سول لائن تھانہ پہنچے تھے۔ وسیم کی نشاندہی پر پولیس نے فارم ہاؤس کے عقب سے دو سال قبل دفن کی گئی چھ لاشیں ڈھانچوں کی شکل میں برآمد کر کے انہیں فورنسک جانچ کے لیے بھیج دیا۔ قتل میں استعمال ہونے والا راڈ و چاقو بھی برآمد کر لیے گئے مزید تفتیش سے یہ بھی پتا چلا کہ پتوکی میں بھی وسیم دھوکا دہی کے متعدد معاملے انجام دے چکا ہے پولیس کے پاس جس کا ریکارڈ بھی موجود تھا دو سال بعد لیلیٰ خان اور اس کے کنبے کی پراسرار گمشدگی کا راز تو کھل گیا مگر لیلیٰ خاں کا باپ نادر شاہ مطمئن نہیں تھا وہ اس سارے معاملے کی جانچ سی آئی اے سے کرانے کا مطالبہ کر رہا تھا دوسری طرف پولیس نے آصف شیخ کو کلین چٹ نہیں دی تھی دراصل لیلیٰ خان وغیرہ کی جائیداد کی پاور آف اٹارنی آصف ہی کے نام تھی اور ان سب کی موت سے کروڑوں کا سیدھا فائدہ آصف شیخ کو ہی ہوتا ہے۔

وسیم جٹ کے بیان پر پولیس نے شاکر حسین بالی کی تلاش میں ڈبانوالہ میں ریڈ کی تو وہ گھر پر مل گیا۔ بعد از ریمانڈ دونوں کو جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ زبان بند رکھنے پر کچھ نقصان نہیں ہوتا سب کچھ بچ جاتا ہے اور جب زبان کھول دی جائے تو سب کچھ خرچ ہو جاتا ہے کچھ نہیں بچتا وقار حتیٰ کہ شخصیت بھی نہیں بچتی۔

کہانی کار

شاہدہ صدیقی

ایک مصنف کا احوال' حالات نے اس کے قلم کو نشتر بنا دیا تھا اور وہ انسانیت کے دائرے سے باہر نکل گیا تھا۔

مغربی ادب سے انتخاب' مختصر مگر خوب صورت کہانی

لاش برف پر پڑی تھی، تعطیلاتی کیمپ سائٹ سے تھوڑے ہی فاصلے پر وہ خاندان بھی چھتریوں کے نیچے ایک دوسرے سے جڑا کھڑا تھا، چھتریاں تفتیشی اہلکاروں نے ان پر تان رکھی تھیں۔

دو کم عمر لڑکوں کو ان کے والدین نے بازوؤں سے تھام رکھا تھا جو لاش کے دریافت ہونے کا واقعہ بیان کر رہے تھے۔

مسلسل برفباری سے ایسے فورنزک نشانات تیزی سے مٹتے جا رہے تھے جن سے معلوم ہو پاتا کہ لاش کس کی تھی اور وہ شخص کہاں سے آیا تھا۔

اس کی موت کیوں ہوئی تھی یہ بھی ایک معمہ تھا۔

سراغرساں انسپکٹر جارج ہیون کو معلوم ہوا تھا کہ ان دونوں لڑکوں کو یہ سمجھنے میں کچھ دیر لگی تھی کہ جس جلے ہوئے ڈھیر پر انہوں نے پیر رکھ دیئے تھے وہ دراصل انسانی جسم تھا کسی خیمے میں جلائی گئی آگ کی باقیات نہیں۔

جارج اہلکاروں کے گروپ کی طرف بڑھا۔

''میتھیو! اگر تمہیں جو جاننا تھا' وہ معلوم ہو چکا ہے تو ان لوگوں کو جانے دو، ہمیں ان کے کیبن کا علم ہے، ضرورت ہوئی تو مزید پوچھ تاچھ کرلیں گے''

میتھیو کیمپ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اوکے سر!''

اور نوٹ بک بند کرتے ہوئے اس خاندان کو واپس اپنے تعطیلاتی کیبن کی طرف جانے کا اشارہ کر دیا، ایک چھتری اس نے باپ کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔

''ہاں تو بتاؤ، کیا پتا چلا تمہیں؟''

''وہ دونوں، تھامس اور ایلکس بتا رہے تھے کہ لاش انہیں ساڑھے نو بجے نظر آئی تھی۔ جمعے کو یہاں آنے کے بعد سے یہ ان کا معمول تھا کہ وہ اسٹور سے اخبار، دودھ اور ڈبل روٹی خرید کے جنگل کے باہر باہر ہی اسی راستے سے کیبن میں واپس آیا کرتے تھے۔

انہوں نے تو کچھ نہیں کہا لیکن یہاں پھیلی ہوئی مافوق الفطرت داستانوں نے انہیں متجسس کر دیا ہے اور وہ اسے مہم جوئی کی طرح لے رہے ہیں۔''

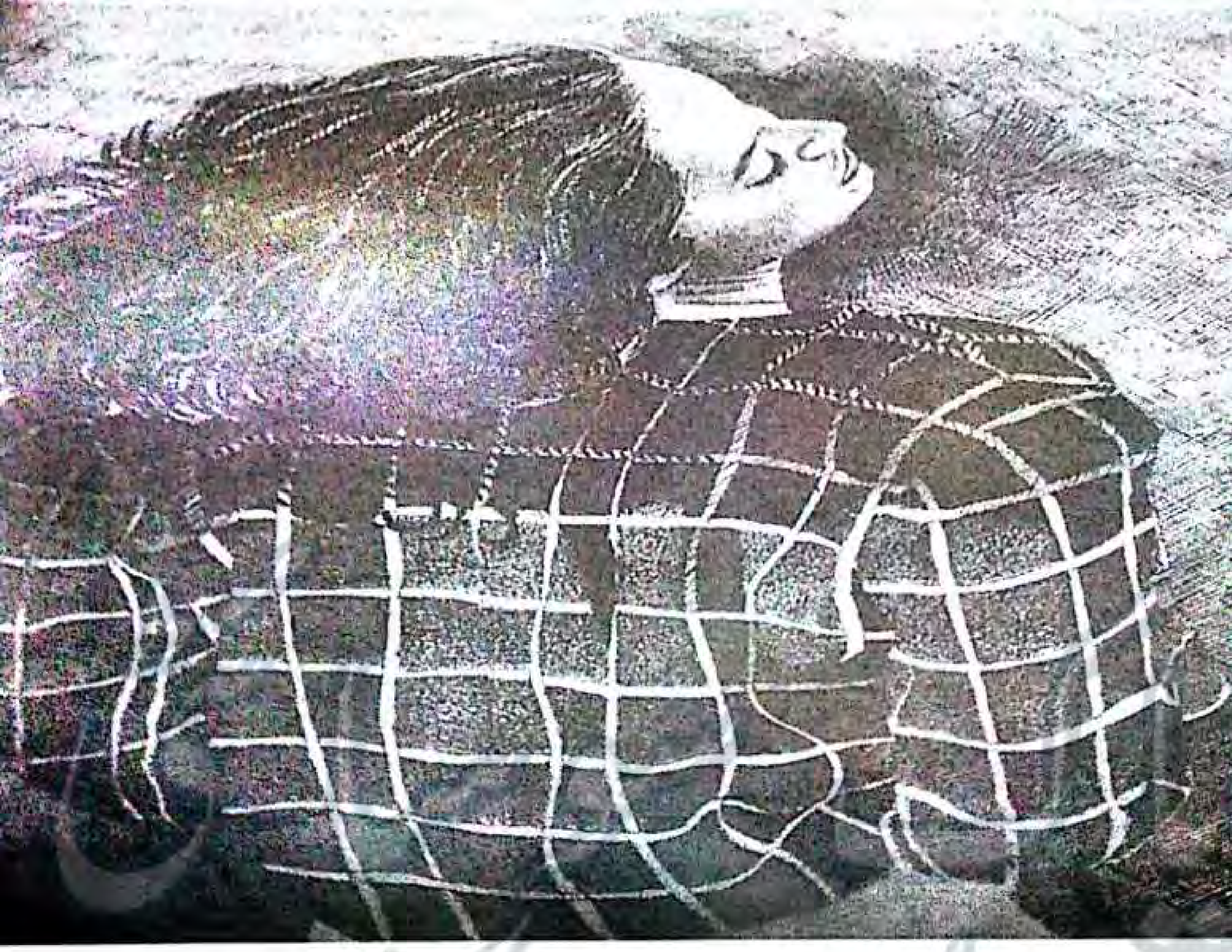
جارج گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سیاہ اور مسخ شدہ لاش کا جائزہ لینے لگا، جو کبھی کسی انسان کا جسم رہا ہوگا۔ اب سفید برف میں ایک عجب تضاد پیش کر رہا تھا۔

''وہ کیا افواہیں ہیں؟ کیا جادوگری اور جنگل میں قربانی کی داستانیں ہیں؟''

کیمپ نے شانے اچکا کے جواب دیا۔

''یقین سے نہیں کہہ سکتا سر!''

مجھے کئی سال پہلے کا کچھ کچھ یاد پڑتا ہے، جیکب کونلی کے بارے میں۔'' جارج بولا



”وہ یہیں قریب ہی رہتا تھا، پارک کے گیٹ کے پاس ایک خستہ حال سی کٹیا میں۔“
جارج اٹھ کھڑا ہوا۔
”اس نے اسی علاقے کے پس منظر میں مختصر خوفناک کہانیاں لکھی تھیں۔ وہ اس کی موت تک نہ تو شائع ہوئیں اور نہ ہی کسی کو پتا چلا۔
”کار حادثے میں اس کی موت کے بعد اس کی تحریریں سامنے آئیں، اس کے بعد سے تو نوجوانوں میں اس کی کہانیاں بہت مقبول ہوگئیں۔“
”تعجب ہے مجھے آج تک پتا نہیں چلا!“ کیمپ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔
”وہ اس لیے کہ مقامی لوگ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا علاقہ بھوتوں اور چڑیلوں کا گڑھ مشہور ہو جائے، اسی لیے اشاعت محدود رہی۔ اب تو کئی سال سے کوئی کہانی شائع ہی نہیں ہوئی ہے۔“
برف اب تیزی سے گر رہی تھی، جارج نے کیمپ کو کار کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔
”چلو کہیں گرم جگہ چل کر بیٹھتے ہیں۔ تمہارے فورنزک ماہرین باقی کام کرلیں گے۔“
ابھی وہ بار میں آکے بیٹھے ہی تھے کہ ایک شخص ان کے قریب آیا، ”معاف کیجیے گا۔“
”آپ پولیس افسر ہیں؟“ نوجوان نے پوچھا تھا، وہ ان کے عہدوں کے بارے میں تو پر یقین نہیں تھا لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ پولیس سے

متعلق ہیں اگر چہ سادہ کپڑوں میں ملبوس ہیں۔
''سراغرساں انسپکٹر جارج ہیون اور سارجنٹ میتھیو کیمپ۔'' ہیون نے تعارف کروایا۔ ''کہیے ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟''
نوجوان ان کی میز پر آ کے بیٹھ گیا، بیٹھتے ہی اس نے اپنے تھیلے سے ایک فائل نکال کر ان کے سامنے رکھ دی تھی۔
''دراصل میں آپ کی مدد کرنے آیا ہوں۔'' وہ بولا۔
''جلے ہوئے آدمی کے بارے میں؟''
جارج کی بھویں اوپر اٹھ گئی تھیں۔
''جلا ہوا آدمی؟''
''ہاں۔''
وہ لاش جو ابھی آپ نے دیکھی ہے؟ کسی مرد کی ہے؟ ناقابل شناخت ہے نا؟''
میتھیو نے اپنا گلاس زور سے میز پر رکھا اور بولا۔ ''مسٹر؟''
''ڈیوڈ ہیورڈ۔'' نوجوان نے جواب دیا
کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کے پاس یہ معلومات کہاں سے آئیں؟''
''تو میں صحیح کہہ رہا ہوں، ہے نا؟ تو اس نے ٹھیک چالیس سال انتظار کیا دوبارہ شروع کرنے کے لیے لیکن ترتیب وہی ہے۔''
دخل دینے کی باری اب جارج کی تھی۔
''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کس نے چالیس سال انتظار کیا؟''
ڈیوڈ نے فائل کھول کے کاغذات میز پر بکھیر دیئے، جن میں کچھ اخباروں کے تراشے اور ہاتھ سے لکھے ہوئے اور ٹائپ کئے ہوئے کاغذات شامل تھے۔

''یہ سب آپ کو ان میں مل جائے گا۔ جس شخص کی آپ کو تلاش ہے وہ جیکب کونلی ہے۔ اس نے اس علاقے میں قتل اور پر اسرار واقعات کی کہانیاں کئی سال قبل لکھی تھیں اور اب وہ انہیں حقیقت میں ڈھال رہا ہے۔''
''ایک منٹ!'' جارج ہاتھ اٹھا کے بولا۔
جیکب کونلی تو 1964ء میں کار حادثے میں ہلاک ہو چکا ہے۔''
ڈیوڈ نے زور سے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔ یہ تو وہ چاہتا تھا کہ سب سمجھیں وہی ہلاک ہوا ہے۔ کار میں لاش جیکب کی نہیں تھی، کار اس کی ضرور تھی مگر جو شخص ہلاک ہوا وہ میرے دادا آلیور ہیورڈ تھے۔
''حادثہ مصنوعی تھا اور ان کا چہرہ اتنا مسخ کر دیا گیا تھا کہ دانتوں کے ریکارڈ سے بھی شناخت نہ ہو سکے۔ حادثے کے بعد آگ نے باقی کام بھی کر دیا۔ کار میں ایک ہی لاش تھی، کار بھی جیکب کی تھی تو کوئی کیوں سوچتا کہ وہ لاش اس کی نہیں ہوگی۔''
''تو اس کی کار تمہارے دادا کیوں چلا رہے تھے؟'' جارج نے سوال کیا۔
ڈیوڈ نے کچھ تصاویر نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں جو زیادہ تر گروپ فوٹو تھے، تین یا چار مرد جو سوٹوں یا بلیزر میں ملبوس تھے۔
''یہ تصویریں میرے دادا کے البم کی ہیں۔ میرے دادا اور جیکب کونلی تقریباً پندرہ سال سے ایک دوسرے کے دوست تھے اور دادا اس کے ایجنٹ بھی تھے۔ جیکب کی کہانیاں فروخت نہیں ہو رہی تھیں اور یہ اس سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ پھر اسے موقع مل گیا جب دادا نے اس کی کار مانگی، انہیں کسی پارٹی سے گھر واپس آنا تھا۔ جیکب نے کار میں کچھ گڑبڑ کر دی اور میرے دادا حادثے کا شکار

ہوگئے۔ وہ بالکل اسی انداز میں ہلاک ہوئے جیسا کہ جیکب کی پہلی کتاب کی ایک کہانی میں بیان کیا گیا تھا۔''

جارج نے تصویریں اٹھا کے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہیں یہ شک کیوں ہوا کہ اس نے تمہارے دادا کو ہلاک کیا ہے؟

کسی مصنف کے پاس اپنے ایجنٹ اور دوست کو قتل کرنے کا کیا جواز ہوسکتا ہے؟''

''اس کی کہانیاں۔'' ڈیوڈ نے جواب دیا۔

''اس کی موت کے بعد اس کی کہانیاں بکنے لگیں۔ اس کے لیے یہی بات سب سے اہم تھی کہ اسے ایک مصنف مان لیا جائے۔

اس سے پہلے اس کی کہانیوں میں کسی کو دلچسپی نہیں تھی، یہاں کے لوگ یہ ظاہر کرتے تھے جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

اس کی موت، یا جیسا کہ اس وقت سمجھا گیا، ایک طرح سے اس کی کہانی میں درج واقعے جیسی تھی اور اس طرح اس کی تحریروں میں دلچسپی بہت بڑھتی گئی۔ پھر چینل 5 پر اس کے بارے میں ایک دستاویزی پروگرام بھی نشر ہوگیا۔''

''میں نے وہ پروگرام کبھی نہیں دیکھا۔'' جارج بولا۔

اس نے تصاویر رکھتے ہوئے جیکب کونلی کی ایک کتاب کے سرورق کی تصویر اٹھالی۔ مختصر کہانیوں کے اس مجموعے کا نام تھا' قاتل جادو'۔

''او کے مسٹر ہیورڈ! فرض کریں آپ کا شبہ درست ہے، کہ جیکب کونلی کسی طرح خود کو چھپائے رکھنے میں کامیاب ہوگیا اور آپ کے دادا کو ہلاک کرکے اسے اپنی موت ظاہر کردیا۔

اس کی کتابیں دھڑا دھڑ بکنے لگیں اور معاوضے

کا ڈھیر لگ گیا۔ لیکن ایک مردہ شخص اپنا معاوضہ کیسے وصول کر سکتا ہے؟

اور اس کا کیا تعلق ہے آج ملنے والی لاش سے؟''

ڈیوڈ آگے جھکا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے قلم سے جارج کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب کے سرورق کو چھو کر بولا۔

''یہ سب اس میں موجود ہے انسپکٹر۔ آپ کے سوالوں کا جواب اس کتاب کی کہانیوں میں پوشیدہ ہے۔''

میتھیو کیمپ کو اب بے چینی ہونے لگی تھی، اس سے رہا نہ گیا۔

مسٹر ہیورڈ۔ ہمارے پاس اتنا وقت کہاں کہ صوفے پر بیٹھ کر کتاب پڑھیں۔ ہم دونوں اس وقت بہت مصروف ہیں، اس لیے آپ ہی مختصراً بتا دیں تو بہتر ہے۔''

ڈیوڈ نے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ اٹھایا اور بولا۔ ''جیکب کی کہانیاں چڑیلوں اور جادوگرنیوں کے گرد گھومتی ہیں۔ پہلی کہانی میں ایک چڑیل ایک پڑوسی گاؤں کے زمیندار کے کہنے پر یہاں رنگ ووڈ کے ایک زمیندار پر جادو کرتی ہے۔

دوسری کہانی، مختلف ہے لیکن اس میں بھی جادوگری کا حوالہ ہے اور انتقامی کارروائی میں کار تباہ ہوتی ہے۔

تیسری کہانی میں ایک آدمی خود بخود جل جاتا ہے آپ سمجھ رہے ہیں نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''شاید۔'' جارج نے جواب دیا۔

''لیکن معاوضہ، اگر وہ اب بھی زندہ ہے تو اشاعت کی رقم تک تو نہیں پہنچ سکتا۔''

''کیا اس کے خاندان کا کوئی فرد یہاں رنگ ووڈ میں رہتا ہے؟'' ڈیوڈ اپنے کاغذات واپس فائل میں رکھتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں جیکب کو نلی کو اس وقت سے تلاش کر رہا ہوں جب سے میرے باپ نے مجھے دادا کے بارے میں بتایا تھا۔

جیکب کا ایک بیٹا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اب بھی زندہ ہے۔ یہ بیٹا رچرڈ کچھ سال پہلے کینسر کا شکار ہو گیا اور ہیگنی کے سینٹ جوزف اسپتال میں زیر علاج تھا، شاید اب بھی ہو۔ بس اس کے اور کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کی بیوی کی موت اب سے دو تین سال پہلے دل کے دورے سے ہو گئی تھی۔''

جارج ہیون اٹھ کھڑا ہوا' یہ ملاقات ختم ہونے کا اشارہ تھا۔

''مسٹر ہیورڈ، آپ کی معلومات کا شکریہ، آپ کا کوئی رابطہ نمبر ہے؟''

ڈیوڈ نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کے ایک مڑا تڑا بزنس کارڈ نکالا۔ یہ مشین سے کھڑے کھڑے چھپوایا جانے والا کارڈ لگ رہا تھا اور جارج کو تھما دیا۔

''اس پر میرے گھر کا اور موبائل نمبر دونوں ہیں۔''

''تو تم کمپیوٹر کے آدمی ہو۔'' جارج نے کارڈ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔'' میں تمہاری تفصیلات پولیس اسٹیشن میں اپنے ایک ساتھی کے حوالے کروں گا۔ وہ ہمیشہ اپنے کمپیوٹر پر لعنت بھیجتا رہتا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ مزید معلومات درکار ہوں گی تو تم سے رابطہ کریں گے۔''

جارج ہیون نے مقامی تھانے کے عملے کو سینٹ جوزف اسپتال جا کے رچرڈ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا حکم دیا۔

ڈیوڈ کے جانے کے بعد جارج اور میتھیو کچھ دیر

وہیں بیٹھے اس کی باتوں پر غور کرتے رہے۔
میتھیو کو اس کی کہانی پر شک تھا کہ ایک کمپیوٹر ماہر آخر ایک خودکار کارڈ مشین سے اپنے بزنس کارڈ کیوں چھپوائے گا۔
جارج البتہ ہمیشہ کی طرح پرسکون اور سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، اس کے ذہن میں معمے کے حل کے کئی ٹکڑے گھوم رہے تھے اور وہ انہیں بار بار ادھر سے ادھر کر رہا تھا۔

......☆☆☆......

پیتھالوجسٹ بتا رہا تھا۔
"یہ جیکب کوئلی کی لاش معلوم ہوتی ہے۔ دانتوں کے ریکارڈ میں کافی مشابہت ہے لیکن شناخت میں اس سے زیادہ مدد اس کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیوں میں ٹوٹنے کے آثار سے ملے گی۔"
جارج نے دائیں بائیں سر ہلایا۔ "میں سمجھا نہیں؟ ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی؟"
"یہ کچھ اس کے چڑیلوں کے پیچھے بھاگنے کا نتیجہ تو نہیں؟" میتھیو نے لقمہ دیتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں!" پیتھالوجسٹ بولا۔ "جارج، مجھے حیرت ہے یہ بات تمہیں یاد نہیں۔ پچاس کی دہائی کے وسط میں وہ اپنی جادوگری میں بہت زیادہ سرگرم رہتا تھا، یہاں تک کہ اس نے اپنے کئی دشمن بنا لیے تھے۔
ایک رات ان میں سے ایک گروہ کے افراد جو غالباً نشے میں تھے، اس کے گھر میں داخل ہوئے اور بیس بال بیٹ سے اس پر حملہ کیا۔ وہ کسی طرح کھڑکی سے کود کر چھت پر جانے لگا تو پیر پھسلا اور وہ نیچے آ گرا جس سے دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ اس کی ان چوٹوں کے نشانات اس جلی ہوئی لاش پر موجود ہیں۔"

خلیل جبران خلیل

☆ اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیا ہے تو یقیناً تم نے دنیا کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا۔
☆ جب کوئی شخص قتل کرتا ہے تو قاتل کہلاتا ہے لیکن اگر کوئی جج کسی شخص پر موت کا پروانہ جاری کرتا ہے تو منصف کہلاتا ہے۔
☆ انسان کی حقیقت ان چیزوں میں نہیں ہوتی' جو وہ ظاہر کرتا ہے بلکہ ان چیزوں میں مخفی ہوتی ہے جنہیں وہ ظاہر نہیں کرتا۔
☆ مجھے چاہیے کہ میں زمانے کا قیاس اپنے اس قول سے نہ کروں کہ "کل تھا اور کل ہوگا۔"
☆ اگر تم کسی سے محبت کرتے ہو تو اسے آزاد چھوڑ دو' اگر وہ واپس نہ آیا تو سمجھ لو کہ وہ کبھی تمہارا تھا ہی نہیں اور اگر وہ واپس آ گیا تو اس کی قدر کرو۔
☆ اس خوشی اور مسرت سے دور رہو جو کل غم کا کانٹا اور زندگی کا روگ بن جائے۔
☆ اس دنیا میں اتنی بلند و بالا دیواروں والے محلات میں نہ رہو جس سے تمہاری آواز ہی گھٹ جائے۔
☆ نصیحت وہ کچی بات ہے' جسے ہم کبھی غور سے نہیں سنتے' خوشامد اور چاپلوسی ایسا بدترین دھوکا اور فریب ہے کہ ہم اسے بڑے غور اور توجہ سے سنتے ہیں۔
☆ عقل مند سوچ کر بولتا ہے اور بیوقوف بول کر سوچتا ہے۔
☆ باطل ہیں وہ تمام اعتقادات' نظریات' خیالات اور تعلیمات جو انسان کی زندگی میں بدقسمتی لائیں۔
☆ وہ سب جذبے' خیال اور نظریات جھوٹے ہیں جو انسان کو مایوسیوں کی طرف لے جائیں۔
☆ انسان کا یہ فطری اور پیدائشی حق ہے کہ وہ اس زمین پر کامیاب اور کامران زندگی بسر کرے۔

محمد حذیفہ پیرزادہ...... ناظم آباد' کراچی

''تو ہوسکتا ہے اس بار یہ خود جیکب ہی ہو۔'' میتھیو نے کہا۔
''اس سے تو ڈیوڈ کی کہانی کی تصدیق ہوتی ہے۔''
''لیکن ہمیں اس کے قاتل کا نام نہیں بتاتی۔'' جارج نے اضافہ کیا۔

☆☆☆

شام کے چھ بجے سے ذرا پہلے ہیکنی تھانے سے ٹیلی فون آیا۔ راس فشر ان پولیس اہلکاروں میں سے ایک تھا جو اسپتال میں معلومات کرنے گئے تھے۔ وہ نرسوں کے فون سے بات کر رہا تھا۔
جارج ابھی نہا کر نکلا تھا اور قمیص کے بٹن بند کر رہا تھا۔ وہ بستر پر بیٹھ کر معلومات نوٹ کرنے لگا۔

☆☆☆

''ہم یہ کتنے یقین سے کہہ سکتے ہیں؟'' میتھیو کار چلاتے ہوئے بولا۔
''وہ ایسے کہ جب راس فشر نے بتایا کہ رچرڈ کونلی اسپتال سے دو ہفتے پہلے غائب ہو گیا تھا تو میں نے کتاب کی تیسری کہانی پڑھی کہ دیکھوں بات آگے کہاں تک جائیگی۔''
دونوں کار سے اتر کر قریبی گھر کی طرف چل پڑے۔ ہوا میں کافی ٹھنڈک تھی۔
گھر بالکل تاریک تھا۔
ڈرائیو وے میں کھڑی کار کے بونٹ کو ہاتھ لگانے سے جارج کو اندازہ ہوا کہ وہ گرم تھا جس کا مطلب تھا کہ کار تھوڑی دیر پہلے یہاں پہنچی ہے۔
''وہ گھر پر ہے۔
''میتھیو آگے بڑھو، میری کمر تو اس کی اجازت نہیں دیتی۔''
میتھیو نے آگے بڑھ کر دروازے کو ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ تالا جھٹکے سے ٹوٹا اور دروازے کے پٹ اپنے قبضوں پر جھول گئے۔
ہال تاریک اور خاموش تھا، سوائے اس ٹپ ٹپ کی آواز کے جو دروازے کے قریب سے آ رہی تھی۔
جارج نے ٹٹول کے سوئچ دبایا تو کمرے میں روشنی پھیل گئی اور انہیں ٹپ ٹپ کی آواز کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ جارج کو دن میں پڑھی ہوئی کہانی کی خوفناک سطروں کو اصلیت میں بدلتے دیکھ کر جھرجھری آ گئی تھی۔
ان کے سر سے اوپر، ٹخنوں پر رسیوں سے بندھی اور اوپر لگے ایک کنڈے سے لٹکی ہوئی ڈیوڈ ہیورڈ کی لاش جھول رہی تھی۔
اس کی لاش بالکل برہنہ تھی اور دونوں بازو سیدھے لٹک رہے تھے۔
اس کی کھلی آنکھیں ان پر جمی تھیں، بغیر پلک جھپکائے۔ دونوں بازوؤں اور سینے پر لگے زخموں سے خون ٹپک کر فرش پر گر رہا تھا۔
باورچی خانے کی چھری جس سے زخم لگائے گئے تھے نیچے میتھیو کے قدموں کے پاس پڑی تھی۔
''یا خدا!'' میتھیو بڑبڑایا۔ اس کی نظریں آہستہ آہستہ جھولتی لاش پر جمی تھیں۔
جارج ہیون نے موبائل نکالا اور نمبر دبانے لگا۔
''رچرڈ کونلی کو ہیلو کہو میتھیو!'' جارج نے دوسری طرف سے فون اٹھائے جانے کا انتظار کرتے ہوئے کہا۔
''اب یہ کینسر اور اس بیماری سے نجات حاصل کر چکا ہے جو اسے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔''

فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگارنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گی

پینو	کے ایم خالد
اجلے لوگ	مہر پرویز
رفتار وقت	شاہد جمیل احمد
چھتنار	خلیل جبار
جھٹکا	جاوید صدیقی

پینو

کے ایم خالد

چک گٹھڑی تے ہو جا تیار کڑے
ترا ٹاہلی ہیٹھ قرار کڑے

مولوی عاشق کی یہ دردناک آواز نعتیہ طرز میں پورے گاؤں میں گونج رہی تھی۔ رات کا دوسرا پہر تھا۔ کچھ لوگ مولوی کی آواز سے وقت کا اندازہ لگا کر سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے میں مولوی صاحب گاتے، گاتے گاؤں سے کافی دور نکل گئے اور ایک ٹاہلی کے درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ پھر انہوں نے دوبارہ گانا شروع کر دیا۔ ان کی آواز ایسے پیارے موسم میں دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا چاندنی کی زرد روشنی میں دور کہیں ہیولا سا ابھرا۔ ان کے دل سے صدا نکلی تو کیا پینو آ گئی؟ ان کی آواز زیادہ بلند ہو گئی۔

چک گٹھڑی تے ہو جا تیار کڑے، ترا ٹاہلی ہیٹھ قرار کڑے۔

وہ ہیولا اب واضح ہوتا جا رہا تھا پھر اس ہیولے نے ایک عورت کی شکل اختیار کر لی اور قریب آنے پر وہ پینو کی شکل میں آ چکا تھا۔

''پینو! تم آ گئیں، سچ یقین جانو مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آ جاؤ گی۔''

''وہ تو تمہاری آواز نے جگا دیا' ورنہ میں نے کہاں اٹھنا تھا۔''

''اچھا، اس گٹھڑی میں کیا ہے؟''

''اس میں میرے کپڑے اور زیور ہیں۔''

''زیور کون سا ہے؟''

''میری ایک مندری ہے چاندی کی، ایک اماں کا چاندی کا ٹیکا ہے اور ایک دادی اماں کا جھمکا اٹھا لائی ہوں۔''

''بس کام بن جائے گا۔'' مولوی عاشق کے چہرے پر اطمینان نمایاں تھا۔ ''چلو اب چلیں۔'' مولوی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''جانا کہاں ہے؟''

''اس دنیا سے دور، بادلوں کے اس پار، چاند پر رہنے کے لیے۔'' مولوی عاشق کا لہجہ رومانوی تھا۔

''اوئے، کہیں تو مجھے مار کر میرا سامان تو نہیں لے جائے گا۔''

''تم یہ کیسی بات کر رہی ہو پینو، تمہیں پتا ہے میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔''

''مجھے سب پتا ہے بادلوں کے پار تو انسان مر کر ہی جاتا ہے''

''اری بیوقوف، وہ تو میں محبت میں کہہ گیا اگر میری طرح پڑھی ہوتی تو سمجھ جاتی۔''

''تو نے کون سا ایویں (ایم اے) کیا ہوا ہے۔''
''پتا ہے میں نے پانچ جماعتوں کے بعد مسجد سے کورس کیا ہے۔''
''تب ہی ایسے کام کر رہا ہے۔''
''اچھا زیادہ ٹر ٹر مت کر چلنا ہے تو چل ورنہ میں چلا۔''
''اچھا زیادہ رعب نہ جما ورنہ سارے گاؤں میں جا کر بتا دوں گی۔''
''سارے عشقیہ موڈ کا ستیاناس کر دیا۔'' مولوی عاشق نے غصے سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پینو بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں آگے پیچھے چلتے ایک انجانی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے۔

❁❁❁

مولوی عاشق چک نمبر ک م 302 میں بطور مولوی مقرر تھے۔ اس کے علاوہ لوگوں کے نکاح اور اموات کے بعد کی رسومات کا ذمہ بھی انھی کے سر تھا۔ اس کام کا نہیں کچھ معاوضہ اور کھانا مل جاتا تھا۔ مولوی صاحب بتیس، تینتیس کے پیٹے میں تھے مگر بہت صحت منداور چاق و چوبند تھے، خضاب لگاتے ، سرمہ ڈالتے اور کیکر کی مسواک کرتے تھے۔ گاؤں کے ہر گھر کے ذمے روٹی کے دن مخصوص تھے۔ جمعرات کے روز تین وقت پینو کے گھر سے روٹی جاتی تھی۔ پینو کونسا بچی تھی طلاق یافتہ تھی خاوند سے نبھ نہ سکی، اس نے طلاق دے دی۔ پہلے پہل تو مولوی اور پینو کی ملاقاتیں روٹی والے دن جمعرات کے روز ہوئیں۔ بعد میں پینو نے اپنے ابا سے کہہ کر سارے دنوں کی روٹی کے لیے خود کو مخصوص کر لیا۔ اسے خضاب ذدہ مولوی نہ جانے کیوں اچھا لگتا تھا اور جیسا کہ کہا جاتا ہے، ابلیس کا کام ہی بھڑکانا ہے، سو اس نے یہاں بھی اپنا کام دکھایا اور مولوی صاحب اپنے دین سے پھر کر دنیا کے ہو گئے اب تو کسی کا جنازہ بھی ان کے لیے وبال جان ہوتا، اب نہ تو انہیں نکاح اچھا لگتا اور نہ کسی کے گھر ختم پر جانا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ مولوی بدل لیں، کوئی دوسرا مولوی رکھ لیں۔ اس نے پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھ لیا ہے۔ پھر عشق و محبت کے قصے بڑھے پہلے بات گھر تک محدود تھی پھر آم کے باغوں تک جا پہنچی۔ کبھی مالٹے کے باغ میں ملاقات ہو رہی تھی کبھی نہر کے کنارے ایک دوسرے سے عہد و پیمان لیے جا رہے تھے۔ پھر یہ بات پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ مولوی اب پینو کے نام کی مالا جپتا ہے بلکہ ایک دفعہ کسی کے گھر میں ختم شریف کی دعا میں مولوی یہ بھی کہہ گیا ''یا اللہ، پینو سے میری شادی کرا آمین۔''

پھر یہ بات ڈھکی چھپی کیسے رہ سکتی تھی، گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگوں نے اپنی بچیوں کو مسجد بھیجنا بند کر دیا، بہت سے لوگوں نے مولوی عاشق کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دی، اپنے گھروں میں پڑھنے لگے مسجد ویران رہنے لگی۔

پھر ایک روز مولوی صاحب خود پینو کے والد سے ملے ان سے شادی کے معاملے پر بات کی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ دوپہر کو جب سب لوگ سو رہے تھے تو پینو گھر سے نکلی اور پانی بھرنے کے بہانے مولوی عاشق سے ملی، مولوی عاشق نے کہا۔ ''پینو! تیری خاطر میں نے دنیا ہی نہیں دین بھی چھوڑا ہے۔''
''مولوی صاحب! میں بھی تمہاری خاطر ہر چیز چھوڑ سکتی ہوں، جو تم کہو۔''

''پینو! میں لوگوں کو اس راہ سے بچنے کی تلقین کرتا تھا لیکن اب میں اس عشق کی دلدل میں پھنس چکا ہوں۔ جن نوجوانوں کو میں رنگے ہاتھ پکڑ کر لعنت ملامت کرتا تھا اب وہ مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ کر لعنت ملامت کرتے ہیں۔ اب یوں لگتا ہے کہ میرا اس گاؤں میں رہنا ٹھیک نہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے تم جیسا کہو میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''تم رات کے آخری پہر تہجد سے پہلے گاؤں سے باہر دوکوس کے فاصلے پر جو ٹاہلی ہے اس کے نیچے آ جانا۔ وہاں سے ہم اس نگری کو چھوڑ دیں گے جو ہمیں جدا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔''

''اچھا پھر میں چلتی ہوں۔'' پینو گھڑا اٹھاتے ہوئے بولی۔

''اچھا رب راکھا اور ٹھیک ٹائم پر پہنچ جانا۔'' مولوی عاشق نے بھی اپنی راہ لیتے ہوئے کہا۔

❀❀❀

گا رے سارے گا ما پا
دانی سا گا ما پا سارے گاماپا

گاؤں کے ایک گھر سے رات کے آخری پہر میں آوازیں نکل رہی تھیں، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی نزع میں ہو اور اس کی روح ابھی نکلی کہ ابھی نکلی اس کے بعد باقاعدہ گانا شروع ہوا۔

''تینوں بھل گئے نیں یار پرانے''

اس آواز میں اتنا درد تھا اتنی لڑکھڑاہٹ تھی کہ پتے بھی کانپ رہے تھے اور درخت ہل ہل کر دعا کر رہے تھے یا اللہ اس آواز کو اٹھا لے۔

یہ استاد ملنگھی کی آواز تھی جو اس وقت ریاض میں مصروف تھا۔ گاؤں کے لوگ چونکہ اس آواز کے عادی ہو چکے تھے اس لیے وہ اس آواز کو لوری سمجھ کر میٹھی نیند سو رہے تھے۔ استاد ملنگھی کی آواز میں بہت زیادہ درد آ گیا، آواز کانپنے لگی یوں لگتا تھا کہ آج ان کا چڑی جتنا دل پھڑک کر باہر آ جائے گا۔ پھر انہوں نے تان لگائی۔

پیار دا بھلیکھا پا کے دل ساڈا توڑیا
کیہڑی گلے سجنا وے مکھ ساتھوں موڑیا

اس کے بعد ان کی ہمت جواب دے گئی اور پھر وہ رونے لگے۔ انہوں نے ساتوں سروں کا ریاض کرتے ہوئے کہا۔

''پینو! میں نے پہلی محبت تم سے کی تھی جیسی لیلیٰ نے رانجھا سے، مہینوال نے شیریں سے اور فرہاد نے سوہنی سے کی تھی۔''

''ماما! تو غلط کہہ رہا ہے، ہیر نے رانجھے سے، لیلیٰ نے مجنوں سے، سوہنی نے مہینوال سے اور شیریں نے فرہاد سے محبت کی تھی، تو نے تو ان کے عاشق ہی بدل دیئے۔'' استاد ملنگھی کے پندرہ سالہ بھتیجے نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مقصد تو عشق کا اظہار ہے۔'' ملنگھی نے ڈانٹا۔

''پینو! میں نے تیری خاطر گلوکاری شروع کی۔ تو ہی تو کہتی تھی مٹھی تجھ سے تو مولوی عاشق کی آواز اچھی ہے۔ اگر تو بھی ریاض کرے تو تیری آواز میں بھی وہی درد آسکتا ہے۔ پینو، میری آواز میں درد تو نہیں آسکا مگر میرا گلہ ضرور درد کرنے لگا ہے۔ مجھے اپنالو پینو، اس سے پہلے کہ میں فوت ہو جاؤں میں نہیں چاہتا کہ لوگ میری قبر پر سرخ دوپٹہ چڑھائیں اور کہیں استاد ملنگھی کنوارہ ہی مر گیا۔ میں آرہا ہوں پینو، میں آرہا ہوں۔'' یہ کہہ کر استاد ملنگھی نے تان پورہ اٹھایا اور باہر نکل گئے۔

دراصل پینو نے تین چار جگہ عشق کی پینگ بڑھا رکھی تھی کہ جہاں بات بن جائے وہیں ٹھیک ہے۔ استاد ملنگھی کا رخ پینو کے گھر کی طرف تھا اس نے دور سے دیکھا ایک ہیولے نے دیوار پھاندی وہ یقیناً عورت تھی استاد ملنگھی نے پہچان لیا کہ وہ پینو ہے۔ اس وقت وہ کہاں جارہی ہے؟ رفع حاجت کے لیے مگر انہوں نے سر جھٹکا کہ رفع حاجت کے لیے ایسے دیوار نہیں پھاندتی تھی۔ انہوں نے اس کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا اور چپکے چپکے اس کے پیچھے چلنے لگے ان کے کانوں میں مولوی عاشق کی نعتیہ طرز میں گانے کی آواز آرہی تھی

چک گٹھڑی تے ہو جا تیار کڑے
ترا ٹاہلی بیٹھ قرار کڑے

جواب میں استاد ملنگھی کا دل تو بہت چاہا کہ وہ بھی مولوی کے اس ماہیے کا جواب اپنی گلوکاری میں دے مگر پھر گاؤں کے کتوں کا خیال آگیا کہ وہ راگوں کی پہچان رکھتے ہیں کہیں رات کے اس پہر جان سے ہی نہ ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔ پینو مولوی سے ملی وہیں ان کے درمیان گل بات ہوئی اور پھر دونوں آگے کی جانب چل پڑے ان کے پیچھے استاد ملنگھی تھا۔

❀ ❀ ❀ ❀

پینو کی عشق بازی گاؤں کے ایک نائی سے بھی چل رہی تھی۔ اس نے نائی سے کئی بار شکایت کی کہ مولوی مجھے جان بوجھ کر چھیڑتا ہے اور مجھ سے کہتا ہے مجھ سے شادی کر لو سکھی رہو گی مگر میں اسے کورا جواب دیتی ہوں اور جب اس نے جیرے بلیڈ سے یہ کہا مولوی نے مجھ سے کہا ہے۔ ''کل ہم گاؤں سے بھاگ چلیں گے۔''

''پھر تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے کیا جواب دینا تھا عورت تھی شرما کر چپ ہو گئی وہ بے غیرت کہنے لگا گاؤں سے باہر ایک ٹاہلی ہے میں اس کے نیچے آخری پہر تمہارا انتظار کروں گا۔ میں نے سوچا چلو جیرے کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں اس لیے تم جلدی پہنچ جانا ہم کسی طرح مولوی کو دغا دے کر نکل جائیں گے اور پیار کی ایک نئی دنیا بسائیں گے۔''

اس کے جواب میں جیرے نے اپنی لشکتی ہوئی ٹنڈ ہلا دی۔ اس رات جیرا وقت سے پہلے ہی ٹاہلی کے اوپر جا بیٹھا حالانکہ عام حالات میں وہ رفع حاجت کے لیے بھی اکیلا نہیں جاتا تھا کیونکہ اس کو جنوں اور بھوتوں سے بہت خوف آتا تھا مگر عشق کے اس میدان میں وہ ٹاہلی کے اوپر بیٹھا انتظار کی گھڑیوں کو

آگے سرکا رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا مولوی عاشق نعتیہ طرز میں کچھ گا رہا ہے اس سے تھوڑی دیر بعد پینو بھی آگئی۔ پینو نے شاید سمجھا ہو گا کہ جیرا نہیں آیا اس لیے وہ مولوی کے ساتھ خاموشی سے چل پڑی۔ جیرے کا دل تو بہت چاہا کہ وہ جیب سے استرا نکال کر مولوی کا گلا کاٹ دے مگر وہ اپنے ارادے سے باز رہا اور خاموشی سے اوپر بیٹھا دیکھتا رہا۔ جب وہ کافی آگے نکل گئے تو اس نے خاموشی سے نیچے اترنا شروع کیا ابھی وہ اوپر ہی تھا اس نے ایک اور سایہ دیکھا جو کافی تیزی سے آگے نکل گیا۔ اس نے پہچان لیا وہ استاد مٹھی تھا۔ جیرے نے سوچا یہ یہاں کیا لینے آیا ہے۔ کہیں پینو نے اس کو بھی تو وقت نہیں دے رکھا تھا مگر اس نے اس خیال کو جھٹکا اور اپنے آپ سے کہا۔ پینو میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ پھر وہ نیچے اترا اور اسی طرف چل پڑا جس طرف پینو، مولوی اور استاد مٹھی گئے تھے۔

❁❁❁❁

مجھے دل سے نہ بھلانا، چاہے روکے یہ زمانہ
تیرے بن میرا جیون کچھ نہیں، کچھ نہیں

پینو جب بھی پیر ڈنڈل سائیں سے ملتی تو پیر ڈنڈل سائیں کے پوپلے منہ سے یہی گانا برآمد ہوتا۔ گانا بھی یوں برآمد ہوتا تھا جیسے کوئی ریل گاڑی کسی سرنگ سے کوکیں مارتی ہوئی گزر رہی ہو اور پیر ڈنڈل سائیں اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس کو دیکھتے اور کبھی اپنے فاقہ زدہ منہ کو۔ پیر ڈنڈل سائیں کا منہ پونے چار انچ مربع تھا۔ حالانکہ کھاتے، پیتے اچھے خاصے تھے گاؤں کے بہت سے بکروں کی بیویوں کو انہوں نے انڈوا کر دیا تھا اور کئی مرغیوں کے مرغے ان کو بانگوں میں گالیاں دیتے ہوئے ان کی چوکھٹ پر قربان ہو گئے تھے۔ شاید انہی بے زبانوں کی بددعاؤں کی وجہ سے ان کا یہ حال تھا پیر ڈنڈل سائیں ویسے تو چھ فٹے جوان تھے مگر جوانی خم کھا کر دائیں طرف ہو گئی تھی۔ ذات کے موچی تھے مگر پیر تھے لوگ ان کے پاس تعویذ اور جادو ٹونہ کے لیے آتے تھے اور کچھ کی مرادیں نہ جانے کیسے پوری ہو گئیں کہ وہ گاؤں میں پیر کرامت شاہ کے نام سے مشہور ہو گئے لیکن لوگ ان کے پرانے نام ڈنڈل سائیں کو نہیں بھولے تھے دراصل نام تو ان کا کرامت ہی تھا مگر ان کو گوبھی کے کچے ڈنڈل کھانے کا شوق تھا اس وجہ سے ان کا نام پیر ڈنڈل سائیں مشہور ہو گیا۔

ایک دن پینو ان سے تعویذ لینے آئی اور کہنے لگی۔

''پیر ڈنڈل سائیں! میری شادی نہیں ہوتی، کوئی اچھا رشتہ ہی نہیں آتا۔''

''تو پھر مجھ سے کر لے۔'' پیر ڈنڈل سائیں نے بے دھڑک کہہ دیا۔

پینو غصے میں آگئی اس نے دو چار طمانچے بھی ان کے منہ پر چھوڑ دیئے۔ پیر سائیں غصے سے کانپ رہے تھے انہوں نے کہا۔

''پینو! تو نے پیر ڈنڈل سائیں کی بے عزتی کی ہے اب تو سکھ، چین سے نہیں رہ سکے گی، میں تجھ پر جن بھوت چھوڑ دوں گا۔''

جن بھوت کا نام سن کر پینو ڈر گئی، کانپنے لگی۔ اس کا سرخی مائل رنگ زردی میں تبدیل ہونے لگا۔

خیالوں ہی خیالوں میں چڑیلیں لمبے لمبے دانت نکالے اس کو ڈرانے لگیں اس نے چیخ ماری اور پیر ڈنڈل سائیں کے قدموں میں گر پڑی۔

''مجھے ان چڑیلوں سے بچالو میں تمہارا کہنا مانوں گی۔''

''اچھا بچالیا اب اٹھ ان آنسوؤں کو پونچھ یہ تیرے مکھڑے پر اچھے نہیں لگتے۔''

پینو نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔'' پیر جی! مجھے گاؤں میں تین آدمی تنگ کرتے ہیں۔''

''اچھا وہ کون ہیں؟ نام تو بتا ذرا۔''

''ایک تو مولوی عاشق ہے دوسرا استاد ملنگھی اور تیسرا جیرا نائی۔''

''اچھا تو مت گھبرا میں ان پر بھوت چھوڑ دوں گا وہ خود ہی قابو کرلیں گے ان مردودوں کو، تو اب گھر جا کل گاؤں سے باہر جو ٹاہلی ہے اس سے کچھ ہٹ کر ایک برگد کا درخت ہے وہاں میں تیرا رات کے آخری پہر انتظار کروں گا یہاں میں نے کافی پیسے کما لیے ہیں اب میرا یہاں دل نہیں لگتا ہم دونوں یہاں سے نکل چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' پینو نے کہا اور اٹھ کر چل دی۔

رات کے آخری پہر پیر ڈنڈل سائیں اٹھے چرس کا سوٹا لگایا اپنے دو چار کپڑے اٹھائے اور پیسے وغیرہ سلوکے کی جیب میں رکھے اور گاؤں سے باہر برگد کے درخت کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گئے ان کو سو فی صد امید تھی کہ پینو ضرور آئے گی کیوں کہ گاؤں کے لوگ جنوں، بھوتوں سے بہت ڈرتے ہیں انہوں نے سنا ٹاہلی کے نیچے سے مولوی عاشق کی نعتیہ طرز میں گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

یہ مولوی ادھر کیا کررہا ہے؟ پیر ڈنڈل سائیں نے دل میں سوچا۔ پھر انہوں نے چاند کی روشنی میں دیکھا وہ پینو مولوی عاشق سے مل دو چار باتیں ہوئیں اور پھر وہ آگے چل پڑے۔ پینو نے برگد کے درخت کی طرف دیکھا ضرور مگر صرف ایک نظر۔ پیر ڈنڈل سائیں اترنے کی کوشش کررہے تھے کہ انہوں نے دیکھا۔ ایک اور آدمی ان کے پیچھے دبے پاؤں جارہا ہے وہ استاد ملنگھی اس کے ہاتھ میں اس کا تانپورہ تھا ابھی پیر ڈنڈل سائیں درخت سے اترے ہی تھے کہ انہوں نے ٹاہلی سے ایک اور آدمی کو اترتے دیکھا وہ اس کی لشکتی ٹنڈ دیکھ کر سمجھ گئے کہ وہ جیرا نائی ہے۔ وہ بھی اسی طرف چل پڑا جس طرف پینو، مولوی اور استاد ملنگھی گئے تھے پیر ڈنڈل سائیں غصے میں آگئے انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔ تو اس کا مطلب ہے پینو نے سب کو ٹائم دے رکھا تھا کہ کوئی نہ کوئی تو آئے گا اپنا مجھے بنائے گا۔ پھر پیر ڈنڈل سائیں نے بھی چرس کا سوٹا لگایا اور اسی طرف چل پڑے جس عاشقوں کی فوج ظفر موج گئی تھی۔

پینو اور مولوی عاشق نعتیہ طرز میں گانا گاتے ہوئے خراماں خراماں چلے جارہے تھے۔

دو ساتھی جیون کے، اک دوجے کا ساتھ نبھائیں گے
جس دن بچھڑے مر جائیں گے دو ساتھی جیوں کے

مولوی عاشق خوش تھا کہ اس نے پینو کو حاصل کرلیا ہے اور دوسری طرف پینو اپنے دوسرے عاشقوں پیر ڈنڈل سائیں، جیرے اور استاد ملنگٹھی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جیرے اور پیر ڈنڈل سائیں کو تو اس نے بلایا تھا نہ جانے وہ کیوں نہیں آئے شاہد وہ مجھ سے سچی محبت نہیں کرتے تھے۔ گاؤں میں صرف مولوی ہی ایسا تھا جو اس کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا، اب اس نے بھی مولوی کا ساتھ دینے کا عہد کرلیا ہے۔

ان سے تھوڑا پیچھے استاد ملنگٹھی ہاتھ میں تانپورہ اور منہ میں گالیوں کا طوفان لیے ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسا راگ گاؤں کہ ساری دنیا میں زلزلہ آجائے۔ توبہ توبہ پینو نے مجھ سے ایسی بے وفائی کی، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک دفعہ تو اس کا دل چاہا کہ تانپورہ مار کر مولوی کو فنا کر دے اور پینو کو لے کر بھاگ جائے مگر نہ جانے کیوں وہ اپنے ارادے سے باز رہا۔ بس وہ ان کا پیچھا کرتا جا رہا تھا۔

استاد ملنگٹھی سے تھوڑا پیچھے جیرا بلیڈ اپنی لشکتی ٹنڈ کے ساتھ ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ پینو کی بے وفائی پر ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا پینو میں نے تمہیں تجھے دیگوں کے چاول کھلائے جب بھی کسی شادی سے دیگیں واپس آتی تھیں میں تمہیں ان میں بچے ہوئے چاول ضرور بھیجتا تھا لیکن تو نے کھا کر حرام کر دیئے۔ پینو تم نے بلایا مجھے تھا۔ بھاگ مولوی کے ساتھ گئی۔ پھر اس کا دل چاہا کہ وہ استاد ملنگٹھی اور مولوی کو استرے مار مار کر ہلاک کر دے اور خود پینو کو لے کر یہاں سے دور کہیں وادیوں میں نکل جائے، وہ سارا دن لوگوں کی حجامتیں کرے، دیگیں پکائے اور پینو گھر کے کام کرے۔ اچھا پینو چھوڑوں گا تو میں تجھے بھی نہیں، حاصل تو ضرور کرلوں گا۔ انہی سوچوں میں وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

جیرے کے پیچھے پیر ڈنڈل سائیں منہ میں چرس کا سگریٹ دبائے چلا آ رہا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کوئی عمل پڑھ کر ان سب کو فنا و برباد کر دے اور پینو کو لے کر نکل جائے مگر عملی طور پر اسے کوئی عمل آتا ہی نہیں تھا اس لیے وہ سوائے دل میں کڑھنے کے اور کیا کر سکتا تھا۔ پینو، یہ تم نے اچھا نہیں کیا اور بھاگ مولوی کے ساتھ گئی اس کا دل چاہا کہ جیرے، ملنگٹھی اور مولوی کو مار دے مگر ان کو مارنے کے لیے اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا اس لیے وہ اموشی سے ان کے پیچھے رہا۔

❁❁❁❁❁

فجر کی اذان سے تھوڑی دیر پہلے مولوی عاشق اور پینو چک نمبر ع غ 420 میں داخل ہوئے کافی چلنے کی وجہ سے ان کے چہروں پر تھکاوٹ نمایاں تھی اسی لمحے درختوں کے جھنڈ سے چار آدمی نکلے اور ان کے آگے پیچھے پھیل گئے۔

''رک جاؤ۔'' ان میں سے ایک کرخت آواز میں بولا۔

پینو اور مولوی رک گئے۔ مولوی کے جسم کی ہر شے رقص میں مصروف تھی جبکہ پینو نارمل تھی۔

''اوئے یہ لڑکی کون ہے؟'' یہ دوسرے آدمی کی آواز تھی لہجہ درشت تھا۔

''جی میری بیوی ہے۔'' مولوی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''نکاح نامہ ہے تمہارے پاس؟''

''جی وہ تو گھر میں ہے۔''

''تو بیوی کو اس وقت کہاں سیر کروا رہے ہو؟''
''اس گاؤں میں شادی پر آئے ہیں۔'' مولوی نے جھوٹ بول کر جان چھڑوانے کی کوشش کی۔
''گھر والے کا نام بتاؤ جہاں شادی پر جانا ہے۔''
اور پھر مولوی الجھ کر رہ گیا وہ اس جال میں اس طرح پھنس گیا کہ نکلنے کا چارہ نہیں تھا۔
''ان دونوں کے ہاتھ پیچھے باندھ دو اور لے چلو۔''
ایک نے کہا اور پھر ان کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے اتنے میں استاد ملنٹھی تان پورہ سنبھالے آ گیا اس نے صورت حال کو دیکھ کر واپس بھاگنے کی کوشش کی مگر ان آدمیوں نے اس کو بھی پکڑ لیا ایک نے پوچھا۔ ''ہاں تم اس وقت تانپورہ لے کر کہاں جا رہے ہو؟''
''جی یہ میری بیوی کو بھگا لایا تھا میں ان کے پیچھے آیا ہوں۔''
''کیا......؟'' وہ حیرت سے چلائے۔ ''اچھا تمہارے پاس نکاح نامہ ہے۔''
''جی وہ تو گھر پر پڑا ہے، آپ میرے ساتھ چلیں آپ کو دکھا دوں گا۔''
''اچھا یہ تو بعد کا معاملہ ہے اس کو بھی باندھ دو۔''
انہوں نے استاد ملنٹھی کو بھی باندھ دیا۔ اتنے میں جیرا وہاں آ پہنچا موجودہ صورت حال کو سمجھ کر اس نے واپس بھاگنے کو کوشش کی مگر آدمیوں نے اسے بھی پکڑ لیا ایک آدمی نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں تم اس وقت کیا کر رہے ہو؟''
''جی یہ مولوی میری بیوی کو بھگا لایا ہے میں ان کا پیچھا کر رہا تھا۔''
''کیا......؟'' وہ حیرت سے چلائے۔
انہوں نے بغیر کچھ کہے اس کو بھی پکڑ کر باندھ دیا ابھی وہ چلنے کو تھے کہ پیر ڈنڈل سائیں درختوں کے جھنڈ سے نمودار ہوئے سب کچھ دیکھ کر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے بھی پیچھے کو بھاگنے کی کوشش کی مگر ایک آدمی نے دو تین جمپ لے کر اسے بھی جا پکڑا اس سے پوچھا گیا کہ تم اس وقت یہاں کر رہے تھے۔ پیر ڈنڈل سائیں نے کہا۔
''یہ مولوی میری بیوی کو بھگا لایا تھا میں ان کے پیچھے آیا تھا۔''
''کیا......؟'' وہ سب ہی حیرت سے چلائے پھر انہوں نے پیر ڈنڈل سائیں کو بھی باندھا اور ان سب کو ساتھ لے کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔

❁❁❁❁

ایک حویلی کے تہہ خانے میں مولوی۔ جیرے، ملنٹھی، پیر ڈنڈل سائیں اور پینو کو رسوں کے ساتھ دیوار سے باندھ دیا گیا تھا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اس نے کہا۔
''ایک وہٹی تن لاڑے تو فلم میں نے بھی دیکھی تھی مگر یہ ایک وہٹی اور چار لاڑے کہاں سے آ گئے۔ سچ سچ بتا دو یہ لڑکی کون ہے تو چھوڑ دوں گا ورنہ تمام کی کھالیں اتار کر بھس بھروا کر حویلی میں ٹانگ لوں گا۔''
یکدم پینو بولی۔ ''میں آپ کو پوری بات بتاتی ہوں، میں کسی کی بیوی نہیں، یہ سارے میرے عاشق

ہیں۔"

"اچھا، تو تم چاروں اس کے سچے عاشق ہو؟" آدمی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" چاروں یک زبان ہو کر بولے۔

"اگر پینو تم سے کوئی چیز مانگے تو دینے کو تیار ہو۔"

"پینو ہم سے جو مانگے گی دینے کے لیے تیار ہیں۔" چاروں کی زبان سے نکلا تھا۔

"پینو! تم میرے ساتھ آؤ۔"

اس آدمی نے پینو کو رسیوں سے آزاد کیا اور پینو کو لے کر ایک کمرے میں گیا۔ اس نے پینو کو ایک تیز دھار خنجر دیا اور کہا۔ "تم نے ہر ایک سے دل مانگنا ہے، بس پھر تماشا دیکھنا۔"

"لیکن وہ مجھے چھوڑ جائیں گے۔" پینو نے کسی خدشے سے کہا۔

"اگر وہ تمہیں چھوڑ جائیں گے تو میں تمہیں اپنا لوں گا میں اس گاؤں کا چوہدری ہوں پہلے ہی میری تین بیویاں ہیں ایک تم بھی سہی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" پینو نے خیالوں ہی خیالوں میں اپنے آپ کو چوہدرائن بنے پایا۔

پینو اور چوہدری واپس تہہ خانے میں آئے پینو کے ہاتھ میں خنجر تھا اس نے کہا۔ "اگر تم سب میرے سچے عاشق ہو تو مجھے تمہارے دل چاہئیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اس پر صرف میرا ہی نام لکھا ہے یا کسی اور کا بھی ہے۔"

چاروں نے خوف زدہ نظروں سے پینو کی طرف دیکھا اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیے۔

"ہاں تو استاد ملنگھی! لاؤ دو دل۔" پینو نے استاد ملنگھی سے اسٹارٹ لیا۔

"مجھے معاف کر دو پینو، میں تمہارا سچا عاشق نہیں، تمہیں پتہ ہے دل نکل جائے تو بندہ مر جاتا ہے۔ پینو میرا دل نکل گیا تو میرے سارے راگ نکل جائیں گے اور راگ نکل گئے تو یہ دنیا ایک عظیم کلاسیکل استاد سے خالی ہو جائے گی۔" ملنگھی نے روتے ہوئے کہا۔

"ہاں، تم بتاؤ مولوی عاشق؟" پینو مولوی کے نزدیک کھسک آئی۔

"پینو! ابلیس ہر آدمی کو بھڑکاتا ہے، میں بھی بہک گیا مجھے معاف کر دینا اب میں اپنی زندگی مسجد میں اللہ ہو، اللہ ہو کرتے گزار دوں گا میرے دل میں نمازیں ہیں، روزے ہیں۔ اگر تم نے میرے دل کو نکال دیا تو دنیا ایک اچھے مولوی سے خالی ہو جائے۔" مولوی عاشق نے خنجر کی تیز دھار کو دیکھ کر لرزتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم بتاؤ پیر ڈنڈل سائیں؟"

"پینو! اس دل میں تعویز بند ہیں۔ اس دل میں بہت بڑا علم ہے اگر تم نے میرا دل نکال دیا تو یہ دریا ادھر ادھر بہہ کر ختم ہو جائے گا۔ یہ دنیا ایک بہت بڑے عامل، پیر سے خالی ہو جائے گی پھر عورتوں کی چڑیلیں کون بھگائے گا، لوگوں کو بیماریوں سے نجات کون دلوائے گا۔ مجھے معاف کر دو اب میں سچے دل سے پیری فقیری کروں گا۔" پیر ڈنڈل سائیں کے جسم پر بھی لرزہ طاری تھا۔

''جیرے، تم بھی اپنا اظہار خیال فرماؤ۔''
''میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں میرے دل میں دیگیں بند ہیں، ان کی خوشبو بند ہے اگر تم نے میرا دل نکال دیا تو یہ ادھر ادھر لڑھک جائیں گی۔ دنیا ایک عظیم نائی سے محروم ہو جائے گی پھر عورتیں بچوں کی جھنڈ کس سے اتروائیں گی لوگ حجامت کہاں سے بنوائیں گے۔ میرے دل کو نکال کر میرے آنے والے بچوں کو یتیم نہ کرو اور مجھے جانے دو۔''
''تم سب جھوٹے ہو۔'' پینو نے خنجر لہراتے ہوئے کہا۔
''بے وفا تم بھی ہو پینو۔'' سب مل کر بولے۔
''ہاں، میں بے وفا ہوں میں نے ایک وقت میں کئی لوگوں سے محبت کی پینگیں بڑھائیں۔ آج کے دور میں محبت کسی چیز کا نام نہیں نہ جانے سچے عاشق کہاں جا سوئے ہیں؟''
پھر پینو نے ان سب کی رسیاں کاٹ ڈالیں اور کہا۔
''تم لوگ جا سکتے ہو۔''
''تم نہیں جاؤ گی پینو۔'' مولوی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
''نہیں، میں چوہدری سے شادی کر رہی ہوں۔''
''کیا......؟'' وہ چاروں حیرت سے چلائے۔
''ہاں۔ عورت کو اس دنیا میں مضبوط بازوؤں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ مضبوط بازو چوہدری کے ہیں۔ آپ لوگوں کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔''
چوہدری نے پینو کا ہاتھ تھام لیا۔
''اب تم لوگ یہاں سے جاتے ہو یا پھر تم سے دل مانگنا شروع کر دوں۔'' پینو نے خنجر لہراتے ہوئے کہا۔
اور پھر چاروں پینو بے وفا کا نعرہ لگاتے ہوئے حویلی سے باہر نکل گئے۔

♥♥♥

اجلے لوگ

مہر پرویز احمد

نجمہ لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ایک تھی جس پر حسن ٹوٹ کر برسا تھا۔ خوب صورتی اس کے انگ انگ سے عیاں تھی۔ حسین ہونے کے ساتھ لاڈ پیار نے کسی حد تک مغرور بنا دیا تھا مگر اس کو پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ نرسری سے میٹرک تک تمام مراحل اچھے نمبرز لے کر طے کیے۔ میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لینے کے ساتھ ہی جوانی کے جنگل میں بھی قدم رکھا اور اپنے حسن سے راہوں کو چمکا دیا

حسن میں یکتا ہونے کے ساتھ تعلیمی اسناد پر درج فرسٹ ڈویژن نے کالج کی نگری میں دھاک بٹھادی۔ ہر طرف اس کے حسن اور ذہانت کے چرچے ہونے لگے کتنی ہی نگاہیں دور سے طواف کرنے لگیں اسے دیکھتے ہی کتنے دل دھڑکنا بھول جاتے دیدار کے لیے کتنے ہی متوالے راہوں پر انتظار کرنے لگے مگر نجمہ تو ہر طرف سے بے خبر صرف اپنی تعلیم سے محبت کرتی تھی اور اس سے جھولیاں بھر رہی تھی۔ کتابوں سے محبت، لیکچر سننے کا شوق امتحان میں اول آنے کی خواہش، اتنی مصروفیات تھیں کہ عشق جیسے فضول کام کے لیے وقت ہی نہیں بچتا تھا۔ تعلیم اور حسن و جمال نے وہ مقام بخشا کہ کتنی ہی حسینائیں انگشت بدنداں رہ گئیں۔ تعلیمی منازل طے کرنے کے بعد جب گھر پہنچی تو ابھی امتحانی تھکاوٹ بھی دور نہ ہوئی تھی کہ اس کے پیا دیس جانے کی چہ میگوئیاں کم اور دکھ زیادہ محسوس ہونے لگا۔ شاید بیٹی ساری زندگی سفر کرتی رہتی ہے اور قبر تک پہنچ کر ہی اس کے سفر تمام ہوتا ہے وگرنہ جیتے جی تو وہ ہمیشہ مسافر کی مانند رواں دواں رہتی ہے۔ بس اس کا مقام بدلتا رہتا ہے بیٹی سے ماں پھر ساس، دادی، نانی۔

نجمہ جیسی پڑھی لکھی لڑکی کے لیے رشتوں کا تانتا بندھ گیا پکی بیری سے بیر توڑنے کے لیے کتنے ہی ہاتھوں نے پتھر اٹھا لیے۔ تعلیمی شعور نے نجمہ کو سلجھا دیا تھا۔ اس نے وقت سے پہلے اپنی آنکھوں میں نہ رت جگے سجائے تھے نہ ہی دل کے گلشن کو کسی کی یاد سے آباد کیا تھا' وہ رب کی رضا پر راضی تھی۔ اس پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ جس طرح خالق کائنات نے حسن میں یکتا اور تعلیم کے میدان میں عزت افزائی دی تھی اسی طرح وہ والدین کی تابعداری اور اطاعت گزاری میں بھی مقام حاصل کرنا چاہتی تھی اس لیے آج تک زندگی کے مستقبل میں کسی جذبے کا اظہار نہیں کیا تھا اور کسی بھی خواب کو آنکھوں کے محل میں سجنے نہیں دیا تھا۔

حسین و جمیل اور تعلیم یافتہ نجمہ کے مستقبل کا فیصلہ گھر کی چار دیواری کے اندر کر دیا گیا اور اسے کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی گئی۔ اس سے کسی بھی قسم کی رائے یا رضامندی لینے کی زحمت گوارہ نہ کی گئی۔ بلکہ ایک حوا کی بیٹی کی زندگی کا فیصلہ معاشرے کے چند معزز ٹھیکیداروں نے کیا۔ ایک ایسے شخص کا مقدر نجمہ کے نام لکھ دیا گیا جو نہ صرف ان پڑھ تھا بلکہ کام کاج بھی نہ کرتا تھا صرف والدین کی روٹیوں پر پل رہا تھا زمانے کی اونچ نیچ اور مستقبل کی ذرہ برابر پروانہ تھی۔ آزاد طبیعت کا مالک اور زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور لطف اندوز ہو رہا تھا۔ نجمہ کو اس کے پلے صرف اس لیے باندھ دیا تھا کہ حسین تتلیوں کے پیچھے بھاگنے سے باز آجائے گا۔ دوسرا نجمہ پڑھی لکھی لڑکی ہے اسے راہ راست پر لا کر ذمہ دار شہری بنائے گی تمام فضول عادات ختم کرے گی اور معاشرے کا سود مند شہری بننے میں اس کی مدد کرے گی۔

یہ معاشرے کی بڑی ستم ظریفی ہے اور اس ستم کا نشانہ ہمیشہ عورت بنتی ہے جو بھی معاشرے کا نکما، لفنگا، کام چور، نکھٹو، نشئی، چرسی، بھنگی اور راندہ نوجوان ہو اس کی اصلاح کی ذمہ داری حوا کی خوب صورت، خوب سیرت، تعلیم یافتہ اور کومل جذبوں کی ترجمان دوشیزہ کے ذمہ لگائی جاتی ہے یوں لگتا ہے وہ کالج و یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے بجائے معاشرے کے ناسوروں کو سنوارنے کا کورس کرتی رہی ہو اگر سنور گیا تو ٹھیک ہے وگرنہ بگڑا ہوا تو وہ پہلے ہی تھا لڑکی کو تو ساری زندگی خون کے آنسو رلاتا رہے گا۔

نجمہ کو بھی اللہ میاں کی گائے کی طرح شمشیر کے پلے باندھ دیا گیا یوں نجمہ کی زندگی کی تمام ساعتیں شمشیر کی خواہشات کے تابع کر دی گئیں۔ایک احسان یہ بھی کیا گیا کہ والدین نے ایک ایکڑ زمین بھی اس کے نام کر دی تا کہ روزی کی تلاش اور زندگی کی منازل طے کرنے میں کسی قسم کے مسائل کا شکار نہ ہو۔شمشیر کو والدین کی طرف سے حصے میں کچھ بھی نہ ملا کیونکہ وہ اپنے حصے کا سب کچھ وصول کر کے پہلے ہی عیاشیوں پر اڑا چکا تھا۔شمشیر کے کردار کی اصلاح کے ساتھ ساتھ گھر کا نظام چلانے کی ذمہ داری بھی نجمہ کو سونپ دی گئی پڑھی لکھی باشعور نجمہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرتے ہوئے شاہراہ زندگی پر شمشیر کے سنگ محوِ سفر ہو گئی۔

نجمہ اور شمشیر کی سوچ، فکر، طرز زندگی اور قول و فعل کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا مگر نجمہ نے اپنے آپ کو شمشیر کی عادات اور خواہشات کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا وہ ہر صورت سہاگ اور گھر کو بچانا چاہتی تھی اگر چہ زندگی اس کی تھی مگر گزارنا شمشیر کی خواہشات کے مطابق تھی وہ کسی بھی صورت کوئی تنازعہ، شکوہ شکایت زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی جب نجمہ شمشیر کی ذہنی سطح کے برابر آ گئی۔ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہونے لگی ایک دوسرے کے مشورے اور فیصلے کو اہمیت دی جانے لگی تو شمشیر بھی یہ بات سمجھنے لگا کہ نجمہ پڑھی لکھی ہونے کی وجہ سے واقعی اس سے زیادہ ذہین ہے اور مسائل سے نبرد آزما ہونے کا فن جانتی ہے یوں جب سوچ فکر ایک ہو گئی تو نجمہ نے اپنے اندر خوابیدہ پڑھی لکھی نجمہ کو جگایا، شمشیر کو ذمہ داری کا احساس دلایا کہ ہمیں معاشرے میں نام پیدا کرنے کے لیے کچھ کرنا ہوگا کام کاج کر کے پیسہ کمانا ہوگا تم حوصلہ نہ ہارو اور کام کرو جب دونوں کمائیں گے تو آمدنی میں اضافہ ہوگا۔یوں اس کی حوصلہ افزائی کر کے کام کرنے پر تیار کیا زمین جو میکے سے ملی تھی وہ ٹھیکے پر دے دی ملنے والی رقم سے گھر کا نظام چلنے لگا۔شمشیر کو ایک فیکٹری میں ملازم کرا دیا۔خود ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانے لگی۔یوں زندگی کی گاڑی آسانی سے چلنے لگی۔وقت گھنٹوں سے دنوں، ہفتوں، مہینوں اور سالوں میں بدلنے لگا درمیان میں کتنے ہی تغیر و تبدل آئے دکھ سکھ کی گھٹائیں کھل کر برسیں، مگر جینے کا قرض تو چکانا پڑتا ہے سو وہ زیست کی راہ پر محوِ سفر ہو گئے۔اس دوران دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے والدین بن گئے زندگی کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا کافی حد تک بچوں کے اخلاق، اقدار سنوارے، زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے دن رات کا سکون غرت کر دیا۔مشکل کی گھڑی میں صبر کا دامن نہ چھوڑا، بچوں کے روشن مستقبل کی راہیں منور کر دیں۔اپنی حیثیت سے بڑھ کر تعلیم دلوائی، بیٹے اور بیٹیوں کو ایم ایس سی تک تعلیم دلوائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نوکری کی تلاش شروع کر دی۔مگر غریبوں کے بچوں کو تو تب نوکری ملے جب بڑے لوگوں کی عورتیں بچے پیدا کرنا چھوڑ دیں۔یہاں تو بڑے آدمیوں کے بچوں کو ہی نوکریاں پوری نہیں آتیں غریبوں کو نوکری کون دیتا ہے۔سفارش ان کے پاس نہیں تھی میکے سسرال نے آج تک خبر نہ لی تھی سو بیٹی عابدہ نے بھی ماں کی طرح ہمت نہ ہاری اور والدین کے لیے سکھ خریدنے کے لیے میدان عمل میں اتر آئی اور تو کوئی حل نظر نہ آیا۔اخبار میں نرسنگ کا اشتہار آیا اس نے بھی درخواست دی جو منظور ہو گئی یوں نرسنگ میں داخلہ کے بعد کسی حد تک مسائل کو گھٹانے کی کوشش کی ٹریننگ کے ساتھ

وظیفہ بھی ملتا تھا یوں کچھ آمدنی بھی ہونے لگی اور خوشحالی کے آثار نظر آنے لگے۔ بیٹا آرمی میں بھرتی ہو گیا یوں خوشی نے ان کے گھر کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا ماں باپ کے کندھے زندگی کی گاڑی کھینچنے کی کوفت سے محفوظ ہو گئے بیٹی ماں کی طرح حسین ہونے کے ساتھ سگھڑ، سلیقہ شعار، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی جوان حسین بیٹی کو دیکھ کر رشتے داروں کے درمیان حائل نفرت کی دیوار گرنے لگی۔ محبتوں کے پھول نچھاور کرنے میں بھائی پیش پیش تھا۔ اس نے اپنے سرکاری ملازم بیٹے کے لیے نجمہ سے عابدہ کا رشتہ مانگ لیا۔ ماں تو گویا اسی انتظار میں بیٹھی تھی غربت کی چکی میں پس کر اس نے ان پڑھ جیون ساتھی کے ساتھ زندگی کا طویل سفر مشکلات کی بیساکھی کے سہارے طے کیا تھا وہ پرانی کہانی ایک دفعہ پھر دہرانا نہیں چاہتی تھی اپنے ہاتھوں بیٹی کو زندگی کے جہنم میں جلانا نہیں چاہتی تھی سو فوراً ہاں کر دی، بیٹی کورس کر رہی تھی بھتیجے کی صورت میں داماد مل رہا تھا جو سرکاری ادارے میں اہم منصب پر فائز تھا یوں بیٹی کا سنہرا مستقبل آنکھوں کے آگے جگمگانے لگا۔ بیٹی کا بوجھ ناتواں کندھوں سے اترنے پر وہ مطمئن تھی لیکن تقدیر دور کھڑی ماں بیٹی کی سوچ پر قہقہے لگا رہی تھی بیٹی سے تو ماں سے بھی بڑی قربانی کا مطالبہ کیا گیا۔

دلہا میاں کی فرمائش پر جلدی نکاح کر دیا گیا تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ ناصر نے مطالبہ کر دیا کہ نرسنگ اچھا شعبہ نہیں بھانت بھانت کے لوگوں کی تیمارداری کرنی پڑتی ہے لہٰذا یہ شعبہ چھوڑ دو کسی اور ادارے میں نوکری کر دو اگر تم نے نرسنگ نہ چھوڑی تو تیرے میرے راستے الگ ہوں گے۔ چنانچہ باہمی رضامندی سے اسکول ٹیچر بننے کا مشورہ پاس ہوا۔ عابدہ نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے بی ایڈ کا کورس کرنا شروع کر دیا سال بعد اعلیٰ نمبروں سے بی ایڈ کا امتحان پاس کیا تھوڑے عرصے بعد پنجاب بھر سے اسکول ٹیچر ملازمین کا اشتہار اخبار میں آیا ناصر کو آگاہ کیا اس نے حکم دیا تم نے اپنے ضلع میں نوکری کی درخواست نہیں دینی، شادی کے بعد ہمارے ہاں ہی مستقل قیام کرنا ہے اس لیے ہمارے ضلع میں نوکری کی درخواست دو ضروری کاغذات کے ساتھ نکاح نامہ بھی لگایا گیا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا یوں پہلی فرصت میں تقرری ہو گئی اور پھر ایک دن چمچماتی کار میں عابدہ کے ساتھ متعلقہ اسکول آیا اور اس کو جوائن کروایا عابدہ کا گھر دوسرے ضلع میں تھا روز آنا جانا ممکن نہ تھا شادی سے قبل ناصر کے گھر رہ نہیں سکتی تھی۔ یوں رہائش کے لیے رشتہ داروں کے ہاں دھکے کھانے لگی کوئی بھی عزیز رشتے دار ایک دو ماہ سے زیادہ عرصہ رکھنے پر راضی نہ ہوا اگر کوئی مہربانی کرتا تو آدھی تنخواہ کا مطالبہ کرتا اسکول گاؤں میں تھا آنے جانے کے مسائل تھے وقت پر اسکول آنا پڑتا تھا ان مشکل حالات سے عابدہ سخت پریشان تھی۔ تنگ آ کر قریبی شہر کے ایک خواتین ہوسٹل میں رہنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی والدین پر زور دینے لگی کہ میری رخصتی کر دو میں دردر کے دھکے کھا کر تنگ آ گئی ہوں۔

بہرحال والدین کو اپنی ذمہ داری کا احساس اور غفلت پر شرمندگی ہوئی گھر میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد نجمہ اکیلی ہی بیٹی کے سپنوں کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے بھائی کے گھر گئی۔ رات ہوئی تو کھانا وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ کافی بحث کے بعد نجمہ اپنا مدعا زبان پر لائی۔ بیٹی کے مسائل سے آگاہ کیا۔ حالات کی نزاکت کا احساس دلایا۔ صبح اس امید پر بھائی نے بہن کو

الوداع کیا کہ بہت جلد فون پر مطلع کر دیں گے۔ نجمہ کے جانے کے بعد سب گھر والوں نے اجلاس بلایا نجمہ اور عابدہ کے مسئلے پر طویل بحث ہوئی۔ ماں بیٹی کی مشکل میں پھنسی جاں پر تمام گھر والوں نے سکھ کا سانس لیا اور اس مشکل سے نجات دلانے کے لیے ان کو ایک دفعہ پھر قربانی کی صلیب پر لٹکانے کا فیصلہ کیا گیا ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ ان کو سکھ تو دیا جائے مگر اس کے بدلے تاحیات ان سے خوشیوں کا جہاں چھین لیا جائے اب ہم جو بھی مطالبہ ان کے سامنے رکھیں گے وہ مجبوری کے چنگل میں پھنسے ہیں۔ ماننا ان کی مجبوری بن جائے گا۔ سو یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر نجمہ اپنے داماد کے نام میکے کی طرف سے دیا گیا ایک ایکڑ زمین کا ٹکڑا لکھوا دے تو ہم فوراً رخصتی کر لیں گے اور اگر اس نے زمین واپس کرنے سے انکار کر دیا تو پھر ہماری طرف سے انکار سمجھے، جہاں اس کا جی چاہے بیٹی کا رشتہ طے کر دے اور ہمارے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رکھے۔ جب یہ اطلاع فون پر نجمہ کو دی گئی وہ تو یہ خبر سنتے ہی بے ہوش ہو گئی سب گھر والے پریشان ہو گئے۔ کافی دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو اس سے حقیقت حال جاننے کی کوشش کی گئی اس نے بھائی کی طرف سے منہ پر نفرت سے مارا گیا طمانچہ اور اس کے کرب سے گھر والوں کو آ گاہ کیا۔ بھائی کی لالچی نیت سے آ گاہ کیا نجانے کب سے اس ایک ایکڑ زمین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ زبان پر لانے کی ترکیبیں تلاش کر رہا تھا کہ موقع ہاتھ آ گیا۔

نجمہ نے بھائی کی طرف سے پیش کردہ شرط کو مسترد کر دیا۔ اتنا بڑا فیصلہ گھر والے اس کو کیسے کرنے کا حق دے سکتے تھے اور اس شرط سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ بھائی رشتہ مضبوط کرنے کی بجائے صرف زمین کے حصول کا خواہش مند ہے اور پھر اس بات کی کیا گارنٹی تھی کہ زمین کے حصول کے بعد عابدہ اپنے گھر میں خوش رہتی۔ اس نے دیگر کئی حوالوں سے بھائی اور بھتیجے کو قائل کرنے کی کوشش کی برادری کے معززین کو درمیان میں ڈالا لیکن اس معاشرے کے ٹھیکیداروں کا ایک ہی سا دل تھا۔

پھر بھائی نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے ایک اور احسان کیا کہ اگر نجمہ مجھے زمین واپس کر دے تو میں عابدہ کے جہیز کا مطالبہ نہیں کروں گا اس کو تین کپڑوں میں بہو بنا کر بیاہ لے جاؤں گا اور کسی قسم کا کوئی اور مطالبہ نہیں کروں گا۔

نجمہ اور عابدہ دونوں ماں بیٹی نے ان لالچی رشتوں کے خریداروں کی کوئی بھی شرط ماننے سے انکار کر دیا جب بھائی کو بہن کی طرف سے انکار کی اطلاع ملی تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً بیٹے سے بھانجی کو طلاق دلوا دی اس پر بس نہ کیا بلکہ اس کی سرکاری ملازمت ختم کرانے کے لیے سر توڑ کوشش کی ان کے گاؤں کا ایک ریٹائرڈ فوجی اسکولوں کا چیکر تھا ان باپ بیٹے نے اس کو گھر بلوایا اور عابدہ کے خلاف شکایتوں کے انبار لگا دیے اور اس کے خوب کان بھرے کہ اعلیٰ افسران کے پاس اس کے کالے کرتوتوں کی رپورٹ بھیجو کہ سرکاری اسکولوں کو بہت نقصان پہنچا رہی ہے۔ اسکول کے تمام فنڈز اور گرانٹ غبن کر جاتی ہے اکثر اسکول سے غیر حاضر رہتی ہے۔ جتنی جلدی ہو اس کو سرکاری ملازمت سے فارغ کیا جائے پھر اس افسر کے کہنے پر خود جعلی شکایت کی درخواستیں لکھ کر محکمہ تعلیم کو بھیجیں۔

ایک ماہ بعد جب چیکر اسکول کے معائنے پر آیا تو آتے ہی عابدہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ہر کام میں نقص

نکالنے لگا گرانٹ میں کرپشن کا الزام لگایا بچوں سے زیادہ فیس لیتی ہو، پڑھانے کے بجائے ذاتی کام کراتی ہو گھریلو استعمال کی چیزیں بچوں سے منگواتی ہو اسی پر بس نہ کیا تحریری شکایت کے ساتھ زبانی بھی بہت کچھ افسران کو بتایا۔ شکایت کی روشنی میں انکوائری کمیٹی بنائی گئی جس دن کمیٹی کے ممبران نے اسکول آ کر انکوائری کرنا تھی عابدہ نے اس دن بچوں کے والدین اور گاؤں کے معززین کو بلوایا۔ کمیٹی کے سوالات کے جوابات عابدہ کی بجائے گاؤں کے لوگوں نے دیے۔ افسر کی طرف سے عائد کردہ تمام الزامات مسترد کر دیے گئے اور اس کو دلیل کے ساتھ جھٹلایا گیا عابدہ کے کام کی تعریف تمام گاؤں نے کی، بہتر انتظام کی وجہ سے طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے والدین نے پرائیویٹ اسکولوں سے بچے اٹھا کر سرکاری اسکول میں داخل کرائے ہیں تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے اسکول کے کمرے کم پڑنے لگے تو عابدہ کی بار بار درخواست پر گورنمنٹ نے دو نئے کمرے اسکول میں بنانے کا آرڈر دیا۔ اس دوران وہ کمرے تعمیر کے آخری مراحل میں تھے عابدہ کی اس کاوش کو کمیٹی کے روبرو پیش کیا گیا کمیٹی کے افسران عابدہ کی اعلیٰ کارکردگی اور لوگوں کی گواہی سے بہت متاثر ہوئے شکایت کرنے والے انسپکٹر کی خوب ہرزہ سرائی ہوئی۔

آفیسر نے انسپکٹر سے عابدہ کی ذات سے مخالفت کی وجہ پوچھی تو اس نے عابدہ کے ماموں اور منگیتر کی سازش بتلائی اور عابدہ سے باقاعدہ معافی مانگی۔ اب آفیسر نے عابدہ سے ماموں کی اس حد تک مخالفت کی وجہ پوچھی تو عابدہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ نکاح سے لے کر طلاق کی وجہ تک ساری روداد بتائی۔

آفیسر بہت رنجیدہ ہوا اور عابدہ کے حوصلے اور جرات کی داد دی۔ انکوائری ختم ہونے کے بعد خوش گوار ماحول میں کھانے پینے کا اہتمام کیا گیا۔ اس دوران آفیسر نے عابدہ کے ابو سے ملنے کی خواہش ظاہر کی عابدہ نے گھر کا ایڈریس دے دیا۔

تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ آفیسر اپنی فیملی کے ہمراہ عابدہ کے گھر کے دروازہ پر دستک دے رہا تھا جب عابدہ نے دروازہ کھولا تو آفیسر کو اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ان کو اندر لے گئی والدین سے تعارف کرایا۔

آفیسر نے آنے کا مدعا بیان کیا کہ میرا بھائی مقابلے کا امتحان پاس کر کے ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز ہوا ہے میں اس کے لیے عابدہ کے رشتے کی خیرات لینے کے لیے آیا ہوں عابدہ جیسی باہمت لڑکی یقیناً ہمارے لیے باعث رحمت ثابت ہوگی۔ اس کا ساتھ میرے بھائی کے گھر کو چار چاند لگا دے گا۔ یہ جوڑی ہمارے خاندان میں مثالی ہوگی۔

والدین نے صلاح مشورے کے بعد یہ رشتہ منظور کر لیا۔ پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کی شادی ہوگئی آفیسر کا گھرانہ اور عابدہ خود بھی ذہین تھی کچھ قسمت نے یاوری کی اور پھر اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر اس کی ترقی ہوگئی آج وہ ہائی اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہے اور انتہائی خوش حال زندگی گزار رہی۔

♥♥♥

رفتار وقت

شاہد جمیل احمد

جولائی کا مہینہ آتا تو گھڑی بیل (Passion Vine) کے پھولوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا۔ پھول ہوں یا پھل، گرم مرطوب علاقوں میں پیشن ایک کریز ہے جو پھولوں اور پودوں سے محبت کرنے والوں کو لاحق ہوتا ہے۔ اسے یوں لگتا جیسے گہرے نیلگوں، جامنی آسمان کے بیچ دودھیا ٹکی میں وقت اپنی گھڑی کی سوئیاں اوڑھ کر سو گیا ہو۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب خوش قسمت لوگ ہی گاؤں سے شہر جایا کرتے تھے۔ دنیا ہو یا دیہہ مگر خوش نصیب لوگ تو گنے چنے ہی ہوتے ہیں۔ چچا اسمٰعیل کا شمار اُن معدودے چند لوگوں میں تھا جن کا شہر آنا جانا تھا۔ اُسے وسط پنجاب کے ایک چھوٹے گاؤں کے جنوبی محلے میں واقع اپنی چھوٹی سی دکان کے لیے سودا سلف کی خریداری کی خاطر شہر جانا پڑتا۔ اس بار تو شاید تین ماہ گزر گئے مگر وہ شہر نہ جا سکا۔ بڑی وجہ مون سُون کی بارشیں تھیں جن کے کارن گاؤں کے سارے رستے اور پگڈنڈیاں جوہڑ کا منظر پیش کر رہے تھے۔ کاتک کے مہینے میں کھیتوں کھلیانوں کا پانی خشک ہوا اور پکی پکی دھان کی فصلوں میں درانتی پڑی تو اسے بھی اپنی دکان کا خیال آیا جس کے ڈھکنا لگے ٹین کے ڈبے سوائے ٹھکر بُورے اور گندگی کے، خالی بھاں بھاں کرتے۔ اسمٰعیل کے شہر جانے کی سب سے زیادہ خوشی تو بیگے کو تھی جس نے دو اڑھائی مہینے پہلے ہی اُسے اپنے بیٹے کے لیے شہر سے نئی کیمی (CAMY) گھڑی لانے کی سائی دے رکھی تھی۔ چھ ماہ پہلے اس نے اسمٰعیل کے ذریعے شہر میں گھڑیوں والی دکان سے گھڑی کی قیمت کا پتہ کیا اور پھر اسے تین سو روپے جمع کرنے میں آدھا سال لگ گیا۔ اِدھر پیسے جمع ہوئے اُدھر موسمی بارشوں کی طویل جھڑی لگ گئی۔ اب جو اسمٰعیل نے شہر جانے کا عندیہ دیا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنے سائیں سے چوری اپنے چھوٹے بیٹے کو اصلی گھڑی خرید کر دینے کا وعدہ کر رکھا تھا، کاکے کے ابا کو پتہ چل جاتا تو وہ اتنے پیسوں سے چھوٹی موٹی کٹی پچھی تو لے آتا پر گھڑی ہرگز نہ خریدنے دیتا۔ بڑی محبت تھی بیگے کو اپنے چھوٹے بیٹے سے۔ پتہ نہیں محبت تھی یا اس کے اندر کا خوف لیکن وہ اس کی کوئی فرمائش نہ ٹالتی۔ دراصل اس سے اُوپر کا چھلے ہی میں اللہ میاں کو پیارا ہو گیا تھا۔ ماں بتاتی تھی کہ اس کا بڑا بھائی پیدا ہوا تو بہت ہی خوبصورت تھا، ستواں ناک اور چری ہوئی موٹی آنکھیں، پیدا ہوتے ہی ٹکر ٹکر دیکھنے لگا، یہ بھی معجزہ ہی تھا، پھر پتہ نہیں اسے کیا ہوا، شاید کسی کی نظر لگ گئی یا کسی سُودک والی کا سایہ پڑ گیا۔ پیدائش کے تیسرے روز اس نے رونا شروع کر دیا اور ماں کے تمام حیلے، جتن کرنے کے باوجود بھی وہ ایک پل کو چپ نہ ہوا، یہاں تک کہ اس کا جسم نیلا ہو گیا اور وہ اللہ کا جی شام سے پہلے ہی اللہ کو جا پیارا ہوا۔ بیگے کو یوں لگا جیسے اس کا اکلوتا بھائی دینو ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے پوہ کی سردی میں زمین کے ننگے فرش پر بیٹھی اس کی ماں کی گود میں مہاجر کیمپ کی ایک ویران شام دم دے گیا ہو اور اس کی ماں نے اسی فرش کو ایک بار پھر پھوڑی بنا لیا ہو۔ اس دن کے بعد بچے کے رونے کا خوف

اس کے دل میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، اس کی کوشش ہوتی کہ کسی بھی طرح اس کا بچہ رونے نہ پائے۔
اب بھی، جب تلے کا یعنی اس کے مرنے والے بیٹے سے چھوٹا گیارہ سال کا ہو گیا تھا اور چھٹی کلاس میں دور پار کے گاؤں سائیکل پر پڑھنے جاتا مگر وہ ابھی تک اس کے رونے سے بہت ڈرتی تھی۔ وہ بیچاری اپنے خاوند اور دیورانیوں، جٹھانیوں سے چوری اس کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرتی مگر اب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس کی فرمائش بھی بڑی ہو گئی، اس نے اپنے ایک کلاس فیلو کی کلائی پر کیسی گھڑی بندھی دیکھی تو اپنی ماں سے ویسی ہی گھڑی دلانے کی فرمائش کر دی اور اس بیچاری نے چار و ناچار حامی بھی بھر لی۔ گھڑی دلا کر ماں نے جیسے ہمیشہ کے لیے وقت کو اس کی کنی میں باندھ دیا، ویسے ہی جیسے اسکول بھیجتے وقت وہ بلوں والے پراٹھے اور اچار کی پھانک کو پونے میں باندھ کر اس کی سائیکل کے ہینڈل سے لٹکا دیتی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد ہے جب پہلے دن گھڑی باندھ کر وہ سائیکل پر ساتھ والے گاؤں سے بھینس کے لیے تعویذ لینے جارہا تھا تو آدھے راستے میں ہی اس نے گھڑی کلائی سے کھول کر جیب میں رکھ لی مبادا سائیکل کا ہینڈل بار بار ہلنے اور گھڑی چھنکنے سے اس کی مشینری خراب نہ ہو جائے۔ عمر کا یہی حصہ تھا جب اسے اپنے گرد وقت کی دوئی کا احساس ہوا۔ ایک وقت جو اس کے باہر یعنی اس کی کلائی پر گھڑی کی صورت بندھا تھا اور ایک وقت جس کے گھڑیال کی سوئیاں اس کے دروں گھومتی تھیں۔ اس کے دماغ میں اندرونی طور ایک خودکار گھڑی فٹ ہو گئی تھی جو اسے ہمہ وقت جگانے، اٹھانے اور بھگانے کے کام آتی۔ اس اندر کی گھڑی پر الارم بھی لگتا تھا، اسے جب جلدی جاگنا ہوتا تو وہ اپنے دماغ میں مطلوبہ وقت پر سوئیوں کی پوزیشن کا تصور کر کے سو جاتا اور پھر عین اس وقت فکرمندی سے ہڑبڑا کر جاگ جاتا، بعد ازاں عمر بھر اسے کسی ظاہری گھڑی پر الارم لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ یہی وہ وقت تھا جب اسے اس کی سوچ کے حوالے سے اولیں بیماری لگی اور جس بیماری کا تعلق بھی وقت سے ہی تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وقت ہمیشہ ایک رفتار سے سفر نہیں کرتا بلکہ موسموں کے ساتھ اس کے گزرنے کی رفتار کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ پتہ نہیں یہ اس کا مشاہدہ تھا یا احساس مگر اسے یوں لگتا جیسے سردیوں میں وقت جلدی گزرتا ہے اور گرمیوں میں تاخیر سے۔ پھر اس نے اپنے احساس کو کسی خاص وقت سے منسوب کر کے دیکھا تو نتیجہ پھر وہی کہ سردیوں میں صبح کے آٹھ جلدی بج جاتے ہیں جبکہ گرمیوں میں دیر سے، پھر اس نے دیکھا کہ شام یا رات کے اوقات میں وقت کی رفتار اس کے متضاد ہے یعنی سردیوں میں رات کے آٹھ بہت دیر سے بجتے ہیں جبکہ گرمیوں میں بہت جلد۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ آخر چکر کیا ہے اور اب تو اس چکر نے اسے جیسے گھن چکر بنا دیا تھا۔ اس سے بھی بڑی مصیبت یہ تھی کہ فقط اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جبکہ اس کے اردگرد کسی شخص کو ایسا مسئلہ یا بیماری لاحق نہیں تھی۔ سردیاں ہوں یا گرمیاں مگر گھڑیوں کی سوئیاں میکانکی ہونے کی بنا پر بظاہر سدا ایک ہی رفتار سے چلتی دکھائی دیتیں مگر اس کے حساب میں وقت کی رفتار مختلف اوقات میں مختلف ہوتی۔ یہ بھی کہ گھڑی کی سوئیوں پر اثر انداز کشش ثقل کا الگ سے کوئی مقیاس بھی نہیں تھا۔ وہ چاہتا کہ ہر کوئی وقت کی کشتی کا اپنے دل کے سمندر کی سطح پر رواں و متزلزل کھینا محسوس کرے اور وقت کی رفتار کے بارے میں فقط یہ نہ کہے کہ گرمیوں میں سورج جلد طلوع ہوتا ہے

اور سردیوں میں تاخیر سے کہ یہ وقت کے سلسلے کی عام تر اور آسان ترین تاویل ہے۔
اب جبکہ رات اور دن چھوٹے بڑے ہوتے مزید پینتیس سال آگے کھسک گئے تو وہ ناسا کی آبزرویٹری میں بڑی دوربین کے پاس بیٹھا اپنے ماضی کے بارے میں سوچ رہا تھا، وقت کے ساتھ اس کی زندگی میں تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، ماں نہیں تھی اور کیمی کی جگہ ٹیگ ہیور، گرینڈ کریرا، ٹیسوٹ اور راڈو نے لے لی تھی۔ وہ زندگی بھر غور و فکر کے تئیں بہت مصروف رہا اور اسے اب صرف اپنی زندگی کے بڑے بڑے پڑاؤ ہی یاد رہ گئے تھے۔ پہلے گاؤں، پھر شہر، پھر کینیڈا اور پھر امریکا۔ اسے اپنے آخری پڑاؤ میں آنے کے بعد غور و فکر کی دوسری بیماری لاحق ہوئی، اس بیماری کی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ اچانک اس کی رُوح کو پھڑکا لگ جاتا اور وہ کچھ لمحوں کے لیے دور خلاؤں میں اُڑ جاتی۔ یوں تو پہلی بیماری بھی پریشان کُن ہی تھی مگر دوسری والی نے تو جیسے اسے ہلکان ہی کر دیا، اُسے یوں لگتا جیسے روح اُڑنے سے اس کا جسم خُلیہ خُلیہ ہو گیا ہو۔ وہ پہلے فکشن نگار تھا اور بعد ماہرِ فلکیات و کونیات۔ کاسمالوجی میں اس کی دلچسپی کا باعث دراصل اس کے فکشن کے تصورات و تخیلات ہی تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اپنی امیجی نیشن کی قوت کے بل پر فکشن نگار ہی کو اعلیٰ سائنسی، ماورائی اور کائناتی تصورات کا موجد ہونا چاہیے۔ یہ تو بعد کا معاملہ ہے کہ تجربہ و تحقیق کی کسوٹی پر پورا اترنے کے بعد کوئی خیال نظریہ بن پاتا ہے یا نہیں پر نہ سوچنے سے خام سوچنا سو درجے ارفع ہے۔ اسے اس آبزرویٹری میں ملازمت اختیار کیے پانچ سال ہو گئے تھے اور یہ سوچ کر اس کے خشک ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگتا کہ اب اس کے ماحول میں فکشن کے تخیل کی اہمیت کو باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور کائنات کی وسعت و حرفت کے بارے میں کچھ لوگوں کو صرف سوچنے جیسے اہم کام پر مامور کیا گیا تھا۔ گیارہویں سمت والے ہوں یا گاڈ پارٹیکل والے یا پھر تخلیقی فکشن والے، سب ایک کنبے کی طرح دکھائی دیتے۔ آج وہ بہت خوش تھا، بظاہر پینتالیس سال کی رائیگانی کے بعد اسے اپنی پہلی بیماری میں افاقے کے آثار دکھائی دیئے، پتہ نہیں افاقہ تھا بھی کہ نہیں پر اسے ایسا محسوس ہوا۔ اب کی بار جب اس کی رُوح اُڑی تو یہ کوڑی لائی کہ بلیک ہول کے قُرب میں وقت کی رفتار سُست پڑ جاتی ہے اور اس کی وجہ کششِ ثقل (GRAVITY) ہے۔ جیسے جیسے کششِ ثقل بڑھتی ہے ویسے ویسے وقت کی رفتار کم ہوتی جاتی ہے۔ اگر ہم ایک گھڑی آسماں کی بلندی پر لٹکا دیں اور دوسری زمین کے پاتال میں رکھ دیں تو زمین کی گہرائی والی گھڑی کششِ ثقل زیادہ ہونے کی وجہ سے آسمان کی اونچائی میں دھری گھڑی سے سُست رفتار ہو گی، اسی طرح اگر ہم کسی بلیک ہول میں گر رہے ہوں تو ہم سیکنڈوں میں بھسم ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی ہمارا پیارا زمین پر بیٹھ کر ہمیں کائنات میں بلیک ہول کے اندر گرتا دیکھ رہا ہو تو اُس کے لیے ہم کھربوں سالوں میں بلیک ہول رسید ہوں گے، تو پھر وقت کی رفتار بھلا ایک جیسی کہاں رہی، وقت کی رفتار ایک نہیں ہے! وقت کی رفتار ایک نہیں ہے! اس کا جی چاہا کہ وہ بھی، ارشمیدس کی طرح، واشنگٹن کی گلیوں میں ننگ دھڑنگ بھاگ نکلے۔

♥♥♥

چھتنار

خلیل جبار

بس کے آنے پر اسٹاپ پر کھڑے مسافروں میں ہلچل مچ گئی تھی اور ہر مسافر آنے والی بس میں جلدی سے سوار ہونا چاہتا تھا۔ صبح کے آٹھ بج چکے تھے اس لیے اسٹاپ پر مسافروں کا رش بڑھ چکا تھا' سب ہی کو جلدی تھی۔ انور بھی ان میں شامل تھا، جیسے ہی بس نزدیک آئی وہ بھی تیزی سے بس میں سوار ہونے کو آگے بڑھا' بس کے دروازے پر مسافروں کی دھکم پیل تھی کوئی اترنا چاہتا تھا کوئی سوار ہونا چاہتا تھا۔ انور بھی مسافروں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا بس کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ کنڈیکٹر بس کے دروازے پر مسافروں کے ہجوم کو کم کرنے کی غرض سے بس کے آگے کے حصے میں مسافروں کو آگے بڑھا رہا تھا' انور آگے بڑھتا ہوا لیڈیز کمپارٹمنٹ تک پہنچ گیا تھا۔

انور ایک سرکاری کالج میں کلرک تھا' وہ روزانہ اپنی موٹر سائیکل پر کالج جاتا تھا۔ کئی دن سے اس کی گاڑی پریشان کر رہی تھی، جب اس نے قاسم مستری کو گاڑی دکھائی اس نے گاڑی ٹھیک کرنے کی غرض سے انجن کھول دیا۔ یہ محض اتفاق ہی ہے کہ دوسرے دن مستری قاسم کی اچانک طبیعت زیادہ خراب ہوگئی اور اسے علاج کے لیے اسپتال میں داخل ہونا پڑ گیا جب تک وہ صحت یاب ہوکر اسپتال سے نہیں آجاتا' انور کی گاڑی بن نہیں سکتی تھی۔ اگر بائیک کا انجن نہ کھلا ہوتا تو وہ کسی بھی مستری سے اپنی بائیک ٹھیک کرالیتا۔ اب جب تک بائیک تیار نہیں ہوجاتی اسے بس میں ہی سفر کرنا تھا۔ انور کی نظر بے اختیار سامنے والی سیٹ پر پڑ گئی' آج وہ لڑکی اسی سیٹ پر بیٹھی دکھائی دی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ جب بھی بس میں سوار ہوتا کنڈیکٹر دوسرے مسافروں کی طرح اسے بھی آگے کی طرف دھکیل دیتا تھا اور آگے کی طرف جگہ خالی ہونے کی صورت میں اسے خواتین کے کمپارٹمنٹ کے پاس کھڑا ہونا پڑتا۔ نجانے اس لڑکی میں ایسی کیا بات تھی کہ نا چاہتے ہوئے بھی انور کی نظریں وقفے وقفے سے اس پر چلی جاتی تھیں۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا جیسے ہی پہلی بار انور نے لڑکی کی طرف دیکھا اس کی بھی انور پر نظر پڑ گئی' بے اختیار لڑکی کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آگئی' وہ بھی اس کے مسکرانے پر مسکرا دیا۔ کئی دن تک یہی سلسلہ چلتا رہا پھر موٹر سائیکل آجانے پر انور نے بس سے سفر کرنا بند کردیا تھا مگر وہ لڑکی انور کے ذہن سے چپک کر رہ گئی اور اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ اس لڑکی کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہے۔ چند دن وہ یہی سوچتا رہا وقت کے ساتھ ساتھ اس کی تصویر دھندلا جائے گی مگر ایسا نہ ہوسکا۔ صبح کے وقت کالج جاتے ہوئے بس پر نظر پڑتے ہی اسے گمان ہوا کہ وہ لڑکی اس میں سوار ہے۔

انٹر کے امتحانی فارم بھرے جارہے تھے' اس لیے انور کو کالج جلدی پہنچنا پڑ رہا تھا جبکہ شام گئے لوٹنا ہوتا تھا۔ رات کو جب تھک کر بستر پر لیٹتا تو صبح ہی آنکھ کھلتی تھی۔ والدہ کا انتقال ہوجانے پر ابو جمال الدین کے لیے اسے ہی ناشتا تیار کرنا ہوتا تھا۔ دوپہر اور رات کا کھانا ابو ہوٹل سے لے آتے تھے' آج جب وہ

رات کا کھانا کھا رہا تھا ابو اس کے پاس ہی بیٹھے تھے۔

''انور بیٹے میں سوچ رہا ہوں اس طرح کیسے کام چلے گا۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' انور چونکتے ہوئے بولا۔

''میرا مطلب ہے، ہم کب تک یونہی ہوٹل سے کھانا لا کر کھاتے رہیں گے۔''

''اس کے بنا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے ابو۔'' انور نے کہا۔

''انو بیٹے ہوٹل کا کھانا کھا کر پیٹ خراب ہو جائے گا ویسے بھی ہمیں ہوٹل کا کھانا کھانے کی عادت نہیں ہے۔'' ابو نے کہا۔

''ہاں ابو ہمیں ہوٹل کا کھانا کھانے کی عادت نہیں ہے، مجبوری یہ ہے کہ عائشہ کی ہم نے جہاں شادی کی ہے وہ یہاں سے اتنی دور ہے کہ وہ کبھی کبھار تو ہمارے لیے آ کر کھانا پکا سکتی ہے لیکن روزانہ نہیں آ سکتی۔'' انور نے کہا۔

''ہاں، ہم عائشہ بیٹی کو روزانہ محض کھانا پکانے کے لیے یہاں آنے کی زحمت نہیں دے سکتے مگر اس گھر میں اب ایک عورت کا ہونا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ہفتے پندرہ دن میں عائشہ بیٹی گھر کی جھاڑ پونچھ کر کے بے حال ہو جاتی ہے، مٹی دھول میں اس کا پورا جسم اٹ جاتا ہے۔'' ابو نے کہا۔

''عائشہ بہن پرائے گھر کی ہو کر بھی ہمارے لیے سوچتی ہے اس کا سسرال نزدیک ہونے پر وہ کبھی بھی ہمیں ہوٹل سے کھانا کھانے نہیں دیتی۔'' انور نے کہا۔

''میں نے عائشہ بیٹی کو کہہ دیا ہے کہ جلدی سے اپنے بھائی کی دلہن تلاش کر لو، ہم مزید ہوٹل کا کھانا کھا کر اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتے۔'' ابو نے کہا۔

''لیکن ابو......''

''بس......بس اب میں تمہارے منہ سے انکار نہیں سنوں گا۔ اس گھر کو سنبھالنے کے لیے ایک عورت کی اشد ضرورت ہے۔'' ابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شادی کا تصور آتے ہی بے اختیار انور کے ذہن میں اس لڑکی کا خیال آ گیا لیکن وہ اس کو کہاں ڈھونڈے اگر وہ ڈھونڈ بھی لے تو نا جانے وہ کس قسم کے لوگ ہوں گے۔ عائشہ بہن اور ابو دیکھ بھال کر ہی رشتہ کریں گے، یہ سوچ کر وہ خاموش ہی رہا۔

دوسرے دن انور جیسے ہی کالج میں داخل ہوا، کلرک آفس کے باہر اس نے ایک لڑکی کو ٹہلتے دیکھا، اس کے ہاتھ میں امتحانی فارم دبا ہوا تھا۔

اکثر لڑکے لمبی قطار سے بچنے کے لیے اپنی والدہ یا بہن کو فارم دے کر بھیج دیتے ہیں۔ کلرک بھی ان سے احتراماً فارم لے کر جمع کر لیتے ہیں وہ شاید اپنے بھائی کو لمبی قطار میں انتظار سے بچانے کے لیے آ گئی تھی، انور نے گاڑی کو ایک جانب کھڑا کر کے کلرک آفس کی جانب بڑھا۔ جیسے ہی انور کی نظر اس لڑکی پر پڑی اسے حیرت کا جھٹکا لگا یہ وہی تھی جو بس میں نظر آتی تھی اسے دیکھ کر انور کو ایک طرح سے خوشی بھی ہو رہی تھی اور حیرت بھی وہ انور کو دیکھ کر مسکرا دی۔

''ارے تم......'' انور کے منہ سے اس سے زیادہ کچھ نہیں نکل سکا۔
''میں اپنے بھائی دلاور کا فارم جمع کرانے آئی تھی' یہاں آ کر پتا چلا کہ کلرک صاحب ابھی آئے نہیں ہیں۔'' وہ بولی۔
''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں آ گیا ہوں۔ آیئے آفس میں چلتے ہیں۔'' انور نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
''اچھا تمہاری نوکری یہاں پر ہے۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
''لائیں' سب سے پہلے مجھے فارم دیں اس کے بعد دوسری بات ہوگی مس......'' انور نے جانتے بوجھتے ہوئے مس کہا تھا۔
''مجھے مس سیمی کہتے ہیں۔'' وہ بولی۔
''کیا کہیں پڑھاتی ہیں؟''
''ہاں صدر کے علاقے میں ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی ہوں۔'' وہ بولی۔
''اس فارم کی وجہ سے آج اسکول سے چھٹی کرنا پڑی ہوگی۔''
''نہیں...... میں نے کل اسکول میں کہہ دیا تھا کہ آج دیر سے آؤں گی۔'' سیمی نے کہا۔
''یہ تم نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے ویسے بھی پرائیوٹ اسکول میں چھٹی لینا بھی بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔'' انور نے کہا۔
''چائے پئیں۔'' چائے آ جانے پر انور نے کہا۔ انور نے چپڑاسی کو کرسی پر بیٹھنے سے پہلے ہی چائے کا اشارہ کر دیا تھا۔
''میں چائے نہیں پیتی۔'' مس سیمی نے کہا۔
''چلیں کسی کا دل رکھنے کے لیے ہی پی لیں۔'' انور نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
''آپ نے بلاوجہ تکلف کرلیا۔'' سیمی بولی۔
''تکلف کیسا اس وقت ویسے ہی ہم لوگوں کے لیے چائے آتی ہے۔'' انور نے کہا۔
''ویسے چائے اچھی بنی ہے۔'' سیمی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔
''ہم چائے اچھی منگواتے ہیں تاکہ ایک بار جو پی کر جائے تو دوبارہ پھر آئے۔''
''میرے لیے دوبارہ آنا مشکل ہے۔'' سیمی نے بھی ذومعنی لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے، ہم کہیں اور مل لیں گے۔'' انور نے کہا۔
''کبھی ہمارے گھر آیئے نا۔''
''تمہارے گھر...... مگر میں نے تمہارا گھر دیکھا نہیں ہے۔''
''عائشہ باجی نے ہمارا گھر دیکھا ہے ان کے ساتھ آ جائیں۔''
''تم عائشہ باجی کو کیسے جانتی ہو۔'' انور بُری طرح چونکا۔
''عائشہ باجی میری بہن شگفتہ کے ساتھ پڑھی ہیں، اس لیے ان کا ہمارے گھر آنا جانا ہے۔'' مس

یمی نے بتایا۔
''اوہ! اچھا میں سمجھا' میں ان کے ساتھ ہی آ جاؤں گا۔'' انور نے کہا۔
ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ عائشہ ان سے ملنے گھر پہنچ گئی' انور اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔
''وہ باجی آج اتوار ہے۔'' انور نے کہا۔
''اتوار ہے میں سمجھی نہیں۔'' وہ بولی۔
''میرا کہنے کا مقصد ہے کہ کیوں نہ آج تمہاری سہیلی شگفتہ کے گھر چلیں' تمہاری ان سے ملاقات ہوئے بہت دن ہو چکے ہیں۔'' انور نے کہا۔
اس کی بات سن کر عائشہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ان کی مسکراہٹ معنی خیز تھی اس لیے انور تھوڑا سا کنفیوز ہو گیا۔
''چلیں چھوڑیں اگر تمہارا موڈ نہیں ہے تو پھر کبھی چلیں گے۔''
''شگفتہ کی شادی ہو چکی ہے اور تم بھی اس کی شادی میں میرے ساتھ ہی گئے تھے' کیا بھول گئے ہو؟''
''اوہ' ہاں ہاں واقعی میں تمہاری دوست کی شادی میں گیا تھا۔'' انور جھینپتا ہوا بولا۔
''اس لیے میں سوچ رہی ہوں کہ شگفتہ کے سسرال جائیں یا اس کی بہن یمی کے گھر چلیں کیوں کہ سسرال میں یمی نہیں ملے گی۔''
''وہ باجی...... میرا...... مطلب ہے۔'' انور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے۔
''زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' مجھے شگفتہ کی زبانی پتا چل گیا ہے کہ تم یمی کو پسند کرنے لگے ہو۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے' وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے یہ اچھا ہے کہ تم دونوں کی شادی ہو جائے۔ سچ پوچھو تو جب ابو نے تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈنے کی بات کی تھی تو میرے ذہن میں یمی کا ہی خیال آیا تھا۔ کل جب شگفتہ سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو' یہ الگ بات ہے کہ تمہاری اس سے زیادہ ملاقاتیں نہیں رہی ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں آج اسی مقصد کے تحت آئی ہوں ابو کو ساتھ لے کر ہم وہاں جائیں گے' انہوں نے اگر رشتے کے لیے ہاں کر دی تو پھر ہم باقاعدہ منگنی کی رسم ادا کرنے ان کے گھر جائیں گے۔'' عائشہ نے کہا۔
اس رشتے میں خاص بات یہ تھی کہ لڑکا اور لڑکی دونوں ہی شادی کے لیے تیار تھے اس لیے یمی کے والدین کا رشتے سے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بات پکی ہونے کے چند ماہ بعد ہی یمی شادی ہو کر انور گھر آ گئی۔ انور بھی اسے پا کر بہت خوش تھا جسے اس نے چاہا وہ اس کی ہو گئی تھی۔ ابتدائی کچھ دن بہت اچھے گزرے مگر پھر انور کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ یمی بے زار بے زار سی رہنے لگی ہے' کئی بار اس نے وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی مگر وہ ٹال گئی۔
ہفتہ کی شام انور نے پروگرام بنایا تھا کہ وہ دونوں تفریح کے لیے جائیں گے' اسی لیے وہ صبح ہی یمی کو کہہ گیا تھا کہ وہ تیار ملے وہ جب شام کو گھر لوٹا تو یمی بدستور گھر کے کام میں لگی ہوئی تھی۔

''ارے بھئی یہ کیا ہے تم ابھی تک تیار نہیں ہوئی ہو؟'' انور نے شکایتی لہجے میں کہا۔
''گھر سے فرصت ملے گی تو تیار ہوں گی نا۔'' سیمی غصے سے بولی۔
''ارے تم تو غصے میں دکھائی دے رہی ہو۔'' انور نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''یہ غصہ انسان کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔''
''کیا کروں دن بھر ماسی کی طرح گھر میں لگی رہتی ہو۔'' سیمی کا غصہ بدستور قائم تھا۔
''تمھیں کس نے ماسی بنا دیا میں تمھیں بیوی بنا کر اس گھر میں لایا ہوں۔'' انور نے کہا۔
''مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں ماسی ہوں۔''
''یہ غصہ ختم کرو اور باہر چلنے کی تیاری شروع کر دو' آج رات کا کھانا ہم باہر کسی اچھے ہوٹل میں کھائیں گے۔'' انور نے مسکراتے ہوئے سیمی کی طرف دیکھا۔
''بہو! انور آ گیا ہے ذرا اچھی سی چائے بنا دو۔'' برابر کے کمرے سے ابو کی آواز آئی۔
''اس طرح کی فرمائشیں آتی رہیں گی تو کیا خاک تیار ہوں گی۔'' سیمی غصے سے بولی۔
''ابو کو کیا معلوم کہ ہمارا آج کہیں گھومنے کا پروگرام ہے۔'' انور نے کہا۔
''دن بھر ایسی ہی فرمائشیں چلتی رہتی ہیں' بہو پانی لے آؤ' بہو یہ لے آؤ' کبھی بہو ہم بوڑھوں کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو' دن بھر کام میں ہلکان ہوتی رہتی ہوں۔'' سیمی کی اس بات پر انور بے ساختہ ہنس پڑا۔
''تم میری بات پر ہنس رہے ہو؟'' سیمی نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔
''بات ہی ایسی ہے میرے والد باتونی بہت ہیں انھیں ایک آدمی سننے کے لیے لازمی چاہیے۔ میری والدہ بھی ان سے اس بات پر تنگ تھیں کہ ان کی باتیں سننے کے چکر میں جو کام ایک گھنٹے میں ہونا چاہیے وہ تین گھنٹے میں ہوتا تھا۔'' انور نے بتایا۔
''میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا ہے' مجھے ڈھنگ سے کام نہیں کرنے دیتے۔ بار بار آوازیں دے کر اپنے پاس بلا لیتے ہیں اور پھر وہی اپنے ماضی کے پرانے گھسے پٹے قصے سناتے رہتے ہیں۔''
''سن لیا کرو' بزرگ خوش ہو جاتے ہیں کہ کوئی تو ہے جو اُن کی باتیں سن رہا ہے۔'' انور نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ایک بار قصہ سننے میں کوئی حرج نہیں لیکن ہر روز وہی قصہ سن سن کر میرے کان پک جاتے ہیں۔'' سیمی نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔
''بہو کیا ہوا چائے تیار ہو گئی؟'' انور نے آواز دی۔
''دیکھ لیا یہ اس طرح مجھے تنگ کرتے ہیں۔''
''کوئی چھوٹا بچہ ہوتا تو اسے ڈانٹ پلا کر خاموش کر سکتے ہیں' وہ میرے ابو ہیں تم خود سوچو میں کس طرح سے انھیں منع کروں پھر وہی طعنے سننے کو ملیں گے کہ بیوی کے آتے ہی بیٹا بدل گیا ہے۔ بیوی کی سنتا ہے والدین کی نہیں سنتا۔'' انور نے کہا۔
''ہاں یہ باتیں ہوتی ہیں یہ نہیں سوچتے کہ بوڑھے والدین بہو کے ساتھ کیا کر رہے ہیں' صرف سسر

ہیں تو اتنا پریشان ہوں ساس صاحبہ کے ہونے پر نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔'' یسمی نے کہا۔
''امی جان کے زندہ ہونے سے تمہیں بہت فائدہ پہنچتا۔''
''وہ کیسے؟''
''وہ ایسے کہ ابو کی باتیں سننے کو امی جان موجود ہوتیں اور تمہیں کام کرتے ہوئے کوئی ڈسٹرب کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔'' انور مسکرایا۔
''کاش ایسا ہوتا۔'' یسمی نے ایک سرد آہ بھری۔
''بہو چائے ذرا اچھی بنانا' تھوڑی دیر پہلے جو چائے تم نے بنائی تھی وہ اتنی مزیدار نہیں تھی۔'' ابو نے پھر آواز دی۔
''بیگم اب چائے بنا ہی دو ورنہ میری شامت آجائے گی۔ وہ مجھے سنا دیں گے کہ تمہاری بیگم کیسی ہے جو سسر کا کہنا نہیں مان رہی۔'' انور نے کہا۔
''اچھا بھئی چائے بنالاتی ہوں۔'' یسمی زمین پر پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔
کاشان کی پیدائش پر یسمی اور انور سے زیادہ خوشی دادا کو ہو رہی تھی۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے' وہ لوگوں سے مبارک بادیں لیتے نہیں تھک رہے تھے۔ ان کے سونے آنگن میں کاشان بہار بن کر آ گیا تھا۔ دادا جان ہر وقت ننھے کاشان سے باتیں کرتے رہتے حالانکہ اس بات کا انہیں بھی احساس تھا کہ کاشان ان کی بات سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہے پھر بھی کاشان سے باتیں کرتے اور اپنے چہرے کو بگاڑ بگاڑ کر اسے ہنسانے کی کوشش میں مصروف رہتے۔ یسمی نے بھی کاشان کے آجانے پر سکون کا سانس لیا تھا' وہ اپنے گھریلو کاموں میں مصروف رہتی اور دادا جان اپنے پوتے سے ڈھیروں باتیں کرتے رہتے تھے۔ گھر میں پوتا کیا آ گیا تھا۔ دادا جان بہو سے چائے کی بار بار فرمائش کرنا ہی بھول گئے تھے۔ وہ یسمی کو زحمت بھی اسی وقت دیتے تھے جب کاشان کپڑے خراب کر لیتا تھا۔
ایک دن کاشان کو بخار آ گیا' رات میں انور دوائی دلا کر لے آیا تھا۔ صبح ہونے پر وہ جلدی کالج کے لیے گھر سے نکل گیا' چند دن اس کی بڑی مصروفیت کے تھے۔ دن میں کئی بار یسمی کی انور کے موبائل پر کال آئی مگر وہ کوشش کے باوجود اٹینڈ نہیں کر سکا۔ رات گئے جب انور گھر پہنچا' گھر میں سناٹا تھا والد صاحب سو رہے تھے۔ یسمی جاگ رہی تھی مگر اس کا چہرہ غصہ سے پھولا ہوا تھا۔
''کاشان کی طبیعت کیسی ہے؟'' انور نے پوچھا۔
''ٹھیک ہے جبھی آرام سے سو رہا ہے' مگر تمہارے والد صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' یسمی غصے سے بولی۔
''کیوں کیا ہوا ہے؟''
''صبح سے میرا جینا حرام کیا ہوا ہے کہ مجھے اور تمہیں کاشان کا بالکل بھی خیال نہیں ہے۔ کاشان ہمارا بیٹا ہے اس کا جتنا خیال ہمیں ہو گا وہ کسی اور کو نہیں ہو گا۔''
''ہاں یہ بات تو ہے بس بوڑھے لوگ کچھ زیادہ ہی بچوں کے لیے پریشان ہو جاتے ہیں۔'' انور

بولا۔
"میں نے مانا کہ پریشان ہوجاتے ہیں مگر دوسروں کو تو پریشان نہ کریں صبح سے مجھے بار بار کہہ رہے ہیں کہ انور سے میری بات کراؤ میں اس سے بات کروں گا' انور کو ذرا بھی میرے پوتے کا خیال نہیں۔ کیا ضروری تھا اس کا آج کالج جانا۔"
"کیا تم نے بتایا نہیں تھا کہ کالج میں انٹر کے امتحانی فارم بھرے جا رہے ہیں۔"
"بتایا تھا مگر وہ میری کہانی سننے والے تھے بس ایک ہی ضد کہ انور سے میری بات کراؤ۔ میں اسے ابھی اور اسی وقت گھر بلا کر کھری کھری سنانا چاہتا ہوں کہ بچے کے بیمار ہونے پر اس کا کالج جانا ضروری تھا اوپر سے تم کال اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔" یمی نے کہا۔
"میں آ گیا ہوں بات سنبھال لوں گا۔" انور نے مسکراتے ہوئے یمی کی طرف دیکھا' یمی منہ بنا کر رہ گئی۔
جمال الدین کی بڑھتی عمر کے ساتھ ان کے مزاج میں چڑچڑا پن بھی آتا جا رہا تھا۔ وہ چائے پی کر بھول جاتے تھے کہ چائے پی چکے ہیں' وہ جب انور کو چائے نہ پلانے کی شکایت کرتے یمی ان کے سرہانے رکھا چائے کا کپ دکھا دیتی اور کپ دیکھ کر وہ مسکرا دیتا اور جب وہ جمال الدین کو چائے کا خالی کپ دکھاتا تو وہ حیرت سے کہتے۔
"ارے یہ چائے کیا میں نے پی لی؟ کمال ہے۔"
انور بھی اکثر ان کی باتوں سے پریشان ہو جاتا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ کیا کرے۔ وہ ان کا مزاج جانتا تھا اس لیے برداشت کر جاتا تھا مگر یمی سے برداشت نہیں ہوتا تھا وہ جب بھی گھر آتا' یمی کا منہ غصے سے پھولا ہوتا تھا۔ ایک شام انور جب گھر لوٹا اس نے دیکھا کہ یمی بریف کیس میں اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔
"یہ کیا ہو رہا ہے؟" انور نے پوچھا۔
"میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔"
"مم...... مگر...... کک...... کیوں؟" وہ گھبرا گیا۔
"اس گھر میں ہم دونوں میں سے ایک رہے گا۔" یمی نے غصے سے کہا۔
"دوسرا کون ہے بھئی؟" انور نے حیرانی سے یمی کو دیکھا۔
"تمہارے والد صاحب جنہوں نے میرا لہو پی لیا۔"
"ابو کی بات کو تم اتنا سنجیدہ مت لیا کرو۔" انور نے یمی کو سمجھانے کی کوشش کی۔
"برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے میں کب تک برداشت کروں' میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔" یمی غصے سے دہاڑی۔
"آہستہ...... آہستہ بات کرو۔"
"میں کسی سے نہیں ڈرتی۔" وہ بولی۔

''میں کب کہہ رہا ہوں تم کسی سے ڈرتی ہو'میں تم سے جو بات کرنا چاہ رہا ہوں وہ چیخنے چلانے سے سمجھ میں نہیں آتی۔'' انور نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس کے کچھ دیر سمجھانے پر یسی نے بریف کیس میں سامان اس شرط پر رکھنا بند کر دیا کہ وہ اپنے والد کو سمجھائے گا کہ وہ آئندہ یسی کو تنگ نہیں کریں گے۔ ابو کے دوبارہ تنگ کرنے پر وہ ایک منٹ گھر میں نہیں رہے گی' انور کے سمجھانے پر جمال الدین نے یسی کو تنگ کر دیا تھا۔ ایک ہفتہ خیریت سے گزرا' دوسرا ہفتہ شروع ہوتے ہی دوسرا ہی دن تھا یسی میکے چلی گئی۔ انور نے جب موبائل پر یسی سے بات کرنا چاہی اس نے کال ہی کاٹ دی۔ اس نے اسی وقت گاڑی نکالی اور یسی کے گھر پہنچ گیا' وہ بہت غصے میں تھی۔

''کیا بات ہے بھئی بغیر کسی اطلاع کے تم میکے آ گئی ہو' خیریت تو ہے نا؟'' انور نے پوچھا۔

''تم سب جانتے بوجھتے ہوئے انجان بن رہے ہو۔'' یسی نے کہا۔

''ابو نے کچھ کہہ دیا؟''

''ہاں' صبح سے تنگ کیا ہوا ہے۔ بہو چائے بنادو' بہو پانی پلادو اوپر سے ستم کہ میں کاشان کا بالکل بھی خیال نہیں رکھتی ہوں بہت کمزور ہو گیا ہے۔ بھلا بتاؤ میں کاشان کی ماں ہوں مجھ سے زیادہ کون اس کا خیال رکھے گا۔''

''مجھے ابو کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا۔'' انور سوچ میں پڑ گیا۔

''ایدھی سینٹر چھوڑ آؤ وہاں ان کی باتیں سننے کو اور بہت بوڑھے مل جائیں گے۔'' یسی غصے سے بولی۔

''میں ابو کو ایدھی سینٹر چھوڑ سکتا ہوں مگر سوچو کہ لوگ کیا کہیں گے۔''

''ٹھیک ہے تمہیں لوگوں کا اتنا ہی خیال ہے تو پھر انہیں ہی اپنے پاس رکھ لو میں میکے میں ہی اچھی لگ رہی ہو۔''

انور نے یسی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی ایک ہی ضد تھی کہ اس گھر میں وہ رہے گی یا پھر اس کے سسر رہیں گے۔ انور مایوس ہو کر گھر چلا آیا' اسے خالی ہاتھ دیکھ کر جمال الدین چونکے۔

''کیا ہوا انور بیٹے' بہو تمہارے ساتھ نہیں آئی۔'

''ابو وہ نہیں آئے گی۔''

''کیوں؟''

''وہ کہتی ہے اس گھر میں وہ رہے گی یا ابو' دونوں میں سے ایک ہی رہے گا۔'' انور نے بتایا۔

''میں بولتا بہت ہوں یہی شکایت تمہاری امی کو بھی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں جانتے ہو کیا ہوا' تمہاری امی نے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا' گھر والوں نے جب نہ جانے کی وجہ پوچھی تو وہ بڑی سادگی سے بولیں کہ میں بولتا بہت ہوں۔ میرے زیادہ بولنے سے اس کے سر میں درد ہو جاتا ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟'' انور نے چونک کر پوچھا۔

''ہونا کیا تھا میرے سسر نے مجھے سمجھا دیا کہ میں شادی کے ابتدائی دنوں میں ذرا کم بولوں پھر جب

وہ مجھے سننے کی عادی ہو جائے گی تو پھر خوب بولنا‘ میں نے ایسا ہی کیا۔‘‘ جمال الدین نے قہقہہ لگایا۔
’’تم صبح بہو کو جا کر لے آنا اور کہنا کہ یہ گھر تمہارا ہے‘ میرا کیا ہے پتا نہیں زندگی کے کتنے دن باقی بچے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائیں گے‘ میں کچھ دن کے لیے اپنے دوستوں کے پاس چلا جاؤں گا۔‘‘ وہ بولے۔
’’مگر کہاں؟‘‘ انور نے پوچھا۔
’’کسی کو بتانا نہیں وہ ایدھی سینٹر میں رہتے ہیں‘ انہیں بھی میری طرح بولنے کی بیماری ہے اسی لیے گھر والوں نے ایدھی سینٹر میں داخل کرا دیا ہے۔‘‘
’’لیکن ابو......؟‘‘
’’انور بیٹے میں اپنی زندگی گزار چکا ہوں تمہارے سامنے بڑی زندگی ہے اسے اچھے انداز میں گزار لو۔‘‘ جمال الدین نے کہا۔
صبح ہونے پر جمال الدین ضد کر کے انور کے ساتھ ایدھی سینٹر چلا گیا‘ سسر کے ایدھی سینٹر چلے جانے پر سیمی خوش خوش گھر چلی آئی۔ اب وہ بہت خوش تھی‘ گھر کے کام خوشی خوشی کرتی رہتی ابھی مشکل سے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ سیمی کو گھر میں بوریت کا احساس ہونے لگا جب وہ کام ختم کر لیتی تو گھر سونا سونا لگتا۔ گھر کے دوران کاشان کے تنگ کرنے پر جھلا جاتی کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ میں کام کروں یا اسے سنبھالتی پھروں‘ اکیلے پن میں نا جانے کیوں خوف محسوس ہوتا تھا۔ انور کے کبھی گھر دیر سے آنے پر وہ غصہ کرتی کہ وہ دیر سے کیوں آیا ہے۔ سونا گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے‘ انور سمجھ رہا تھا کہ سیمی گھر کے کام کرنے اور کاشان کو سنبھالنے کی وجہ سے چڑچڑی ہوگئی تھی۔ اس لیے انور نے گھر کے کام کرنے کے لیے ماسی رکھ لی مگر ماسی بھی خاص وقت میں آ کر اپنا کام کر کے چلی جاتی‘ ماسی کے آنے سے سیمی کی مصروفیت اور کم ہوگئی تھی۔ وہ ٹی وی پروگرام دیکھ دیکھ کر بھی بے زار ہو جاتی تھی۔ اسے گھر میں بات کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی چاہیے تھا‘ کاشان کو ابھی بولنا نہیں آیا تھا اور نہ اس سے باتیں کر کے اپنا جی بہلا لیتی‘ جب اس سے رہا نہ گیا تو ایک دن بول پڑی۔
’’میں اس گھر میں بہت بوریت محسوس کرنے لگی ہوں۔‘‘
’’ہم اکثر شام میں تفریح کے لیے جاتے رہتے ہیں پھر بھی بور ہو جاتی ہو۔‘‘
’’گھر میں مصروفیت میں ہونے سے جی بہلا رہتا ہے۔‘‘
’’کیا ماسی کی چھٹی کر دوں؟‘‘
’’مجھے گھر کے کام کرنے کی عادت ہے میں سوچ رہی ہوں کہ اگر ہم نے ماسی کو چھٹی دے دی تو پھر میرے کام کرنے کے دوران کون کاشان کو سنبھالے گا۔‘‘ سیمی نے کہا۔
’’شروع میں بوریت محسوس ہوتی ہے پھر بچے بڑے ہونے پر ان کی شرارتوں سے دل بہت خوش ہوتا ہے اور ان کے کاموں میں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔‘‘ انور نے کہا۔
’’چھوٹے بچے شرارت کرتے بہت اچھے لگتے ہیں۔‘‘ سیمی نے کہا۔

جمال الدین کو گھر سے گئے ایک ماہ ہی ہوا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں گھر سے گئے ہوئے کئی سال بیت گئے ہوں۔ سیمی کو گھر کا سناٹا کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ اکثر وہ دن میں سو رہی ہوتی تھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے اس کے سسر نے چائے بنانے کے لیے آواز دی ہو وہ اٹھ کر بھاگی مگر سسر کا خالی کمرہ دیکھ کر واپس آجاتی۔ انور ہر ہفتے ابو سے ملنے ایدھی سینٹر چلا جاتا تھا' وہ اپنے دوستوں میں بہت خوش تھے' وہ بھی ان کی طرح باتونی تھے' اس لیے ان کی آپس میں خوب نبھ رہی تھی۔ انور جب بھی ان سے ملنے جاتا وہ سختی سے بہو کا خیال رکھنے کی تاکید کرنا نہ بھولتے تھے۔ ایک شام جب انور گھر آیا سیمی بہت اداس تھی۔

''ابو کا کیا حال ہے؟ تم ان سے مل کر بھی آتے ہو یا نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں' ہاں میں کئی بار ان سے مل کر آچکا ہوں وہ بہت خوش ہیں۔ اصل میں ان کے پرانے باتونی دوست بھی وہاں ہی ہیں' اس لیے ان کا وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔'' انور نے بتایا۔

''ابو کے گھر پر رہنے اور ان کے زیادہ بولنے سے گھر میں رونق رہتی تھی' وہ نہیں ہیں تو گھر میں سناٹا رہتا ہے۔''

''ہاں بزرگوں کے دم سے گھر میں رونق رہتی ہے۔'' انور نے کہا۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم ابو کو گھر واپس لے آئیں۔'' سیمی نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''ابو کے گھر میں رہنے سے کاشان کی قلقاریاں گونجتی رہتی تھیں۔ وہ نہیں ہیں تو کاشان بھی سست سا پڑا رہتا ہے جیسے بیمار ہو گیا ہو۔''

''کیا واقعی؟''

''ابو کاشان کو کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلتے رہتے تھے' کبھی باتیں کرتے' کبھی اس کے گدگدی کر کے ہنساتے' کبھی عجیب وغریب منہ بنا کر کاشان کو ہنسنے پر مجبور کردیتے تھے۔'' سیمی نے کہا۔

''ابو کے پاس یہ فن تو ہے وہ روتے بچے کو ہنسا دیتے ہیں اسی لیے تمہیں ابو یاد آرہے ہیں مگر وہ اب مشکل ہی آئیں۔''

''کیوں کیا...... یہ ان کا گھر نہیں ہے؟''

''یہ ان کا گھر ہے مگر جس شرط پر تم یہاں آئی ہو وہ پھر کس طرح سے آئیں گے۔'' انور نے کہا۔

''وہ میری وجہ سے گئے ہیں اور میں ہی ان کو ایدھی ہوم سے لاؤں گی۔'' سیمی بولی۔

''وہ پھر بھی نہیں آئے تو......؟''

''مجھے پتا ہے کاشان میں ان کی جان ہے وہ کاشان کو دیکھ کر بے چین ہوجائیں گے' اس لیے میں کاشان کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔''

''چلو دیکھ لیتے ہیں۔'' انور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سیمی نے سچ ہی کہا تھا جمال الدین کاشان کو دیکھ کر بے چین ہوگئے اور بے اختیار اسے اپنی بانہوں

میں بھرلیا۔ کاشان بھی انہیں بھولا نہیں تھا، اس لیے بانہوں میں آتے ہی کھلکھلا کر ہنس دیا۔ جمال الدین گھر جانے کی بجائے ایدھی ہوم میں رہنا چاہتے تھے مگر وہ پوتے کی محبت کے آگے مجبور ہو گئے اور انہوں نے ایدھی ہوم میں رہنے کے لیے حجت نہیں کی اور گھر چلے آئے۔

جمال الدین کے گھر آ جانے پر گھر میں پھر سے رونق ہو گئی تھی۔ پہلے کے مقابلے میں اب فرق اتنا تھا' پہلے سمی جمال الدین کو چائے پانی دینے کا کام غصے میں کرتی تھی لیکن اب وہ خوشی خوشی کرنے لگی تھی۔ وہ چائے کا نہ بھی کہتے تو وہ خود سے بڑھ کر پوچھ لیتی تھی۔ انور بھی خوش تھا کہ جو بات وہ سمی کو سمجھا نہ سکا تھا وہ خود بخود اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

♥♥♥

جھٹکا

جاوید احمد صدیقی

اتنی بڑی فیکٹری کے مالک سیٹھ کریم سخت تو بے حد تھے کہ اس کے بغیر فیکٹری کا کام اور لوگوں کو کیسے قابو کر سکتے تھے۔ نچلے عملے کو بھی احساس تھا کہ محاسبہ ضروری ہے اور فیکٹری کے جنرل منیجر، یونٹ منیجر اور مختلف شفٹ انچارج اس بات کا صحیح ادراک رکھتے تھے مگر وہ ایک چیپٹر کو عملاً نافذ نہیں کر سکتے تھے وہ تھا سپروائزر کا' جو مختلف شعبوں کے ورکرز کی ماہانہ آمدنی تو بڑھانے پر قادر نہ تھے ویسے تو وقتاً فوقتاً تنخواہوں اور معاوضوں میں اضافہ ہوتا ہی رہتا تھا مگر اتنا ہرگز نہیں کہ انسان تھوڑا سا سکھ کا سانس لے کر جی لے۔

آخر کار سیٹھ صاحب نے ذرا توجہ اس طرف دینی شروع کی عام عہدے داروں کی گرینڈ میٹنگ بلائی گئی اور میٹنگ میں ہر پہلو سے جائزہ لیا گیا کام اور کام کی کارکردگی کے حوالے سے پروڈکشن میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔ جس کا تقابل انہی دنوں پچھلی کارکردگی سے لیا گیا، دیکھا جائے کہ ہم لوگ کتنے فیصد بڑھے ہیں اور اسی لحاظ سے اکاؤنٹس والوں کی علیحدہ میٹنگ بلائی گئی اور ان سے بھی تمام اعداد و شمار لیے گئے ویسے تو یہ تقریباً ہر سہ ماہی کے بعد پریکٹس کی جاتی تھی تاکہ تمام کام کو صحیح سمت میں رکھا جا سکے معلوم ہوا کہ تقریباً ہر شعبہ نے بڑی اچھی کارکردگی دی ہے اور پورا کا پورا منافع اچھا خاصا بڑھتا رہا ہے اسی کے ساتھ ریزرو رکھا ہوا سرمایہ بھی دو نئے یونٹ لگانے پر خرچ کرنے کے متعلق بھی دو تین دن کانفرنس ہوتی رہی۔ خاص کر تنخواہوں کا جائزہ بھرپور لیا گیا۔

سیٹھ کریم کی ان کئی کانفرنس اور نئے یونٹ بنا کر لوگوں کو نوکریاں دینے کے لیے مثبت رویہ پہلی دفعہ دیکھا گیا۔ کام شروع ہو گیا تھا اور ساتھ ہی ناقابل فہم ہونے تک معاوضوں اور تنخواہوں کو بڑھانے کے لیے ٹھوس تجاویز دی گئیں۔

سیٹھ صاحب اس دن چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے انتہائی گہرے اور جگری دوست تشریف

لے آئے ان کے ورکرز اور ملازم ان سے بے انتہا خوش تھے گپ شپ کے دوران دوست پوچھنے لگا کہ یہ تمام تبدیلی کیسے آئی ہے؟ سیٹھ کریم نے اور باتوں میں الجھا لیا مگر بعد میں خیالوں میں اس کے پس منظر میں قلم چلنا شروع ہو گیا۔

ایک رات سیٹھ کریم سنسان جگہ سے گزر رہے تھے کہ یاد آیا کہ کچھ اور بھی پیسے نکلوا لینے میں بہتری ہے۔ سیٹھ صاحب اے ٹی ایم سے پیسے نکلوائے اور گننے لگے تو اچانک نقاب پوش ڈاکو آن دھمکا، رات کا وقت تھا سنسان سڑک تھی سیٹھ کریم نے اپنے حواس بحال رکھے سارے پیسے ڈاکو کے حوالے کر دیے اور موبائل فون بھی جیب سے نکال کر دے دیا۔ ساتھ ہی بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''میں ایک فیکٹری کا مالک ہوں۔ نوکری کا بندوست بھی کر سکتا ہوں جان کا خطرہ لے کر ڈکیتی کرنے سے بچ جاؤ گے، محنت اور دیانت کی آمدنی سے گھر چلاؤ گے۔'' ڈاکو نے نقاب اتار پھینکا اور کہنے لگا۔

''سیٹھ صاحب مزدوری اور ورکرز کا خون مت نچوڑو تمہاری دی ہوئی تنخواہ سے اگر گھر تھوڑی سی آسودگی سے بھی چل سکتا ہوتا تو پھر میں ڈاکو کیوں بنتا۔'' یہ کہہ کر اس نے چھلانگ لگائی اور فرار ہو گیا۔

اب ہوا یہ کہ اگلے دن سیٹھ صاحب کے شاندار آفس میں سیکرٹری نے فون کر کے کہا کہ سر ایک پرانا ورکر ہے ملنا چاہتا ہے۔ سیٹھ کریم کو رات کی واردات سے خاصا جھٹکا لگ چکا تھا۔

''فوراً بھیج دو۔'' سیٹھ کریم ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ چونکے کہ وہی تھا رات والا نقاب پوش ڈاکو، بڑے مہذب طریقے سے سامنے آیا اور بولنے لگا۔

''سر جو بھی ہوا میری غلطی تھی اور گناہگار ہوں اور آپ کی امانت واپس کرنے آیا ہوں، آپ کی بات دل کو لگ گئی، مجھے معاف کر دیجیے گا، اب بھی ایسی حرکت نہ ہوگی، سیٹھ کریم نے شکریہ سے چیزیں لے لیں نام اور سیکشن پوچھا اور بڑے اچھے طریقے سے جانے کو کہا۔

اور اس دن کے بعد یہ تمام تبدیلیاں شروع ہو گئیں اور جائزہ لے کر تمام لوگوں کی خاص کر ورکرز کی تنخواہوں میں بیک وقت میں فیصد اضافہ کر دیا گیا اور اس شخص کی خاص طور پر اسسٹنٹ سپروائزر کی پوسٹ پر ترقی کر دی گئی اور اگلے ہی دن وہی نقاب پوش سیٹھ کریم کے پاس حاضر ہو کر بے انتہا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ سیٹھ صاحب میری تو نسلیں بھی آپ کی خدمت کریں گی خدا ترس اور دوسروں کی مصیبت کو حل کر کے آپ نے بڑی دعائیں لی ہیں۔ سر تمام ورکرز آپ کے ساتھ ہیں، بے حد شکریہ۔

اور اسی لمحے سے تمام کانفرنسیں اور مختلف میٹنگز شروع ہو گئی تھیں اور اکاؤنٹس سے رپورٹ لے کر بھرپور عمل کیا گیا۔

کتنی دفعہ ایسی حرکت، اچھے ذہن کے مالکان کو بھی اچھا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

❤❤❤

ذوق آگہی

سباس گل

(اس ماہ کا انعام یافتہ اقتباس)

کلمے کی طاقت

اللہ تعالیٰ نے جب بھی باطل کو توڑا، کفر کو مٹایا وہ اس کلمے کی محنت کے سبب توڑا۔ جب اخلاص اور قوت کے ساتھ کلمہ وجود میں آتا ہے تو باطل کو توڑ دیتا ہے۔ جب کوئی قوم ہلاک ہوئی مسلمان ہوں یا کافر، اس لیے ہلاک نہیں ہوئے کہ ان کے پاس طاقت کی کمی تھی یا دنیاوی اسباب نہ تھے اللہ کا دستور ہے اور قیامت تک رہے گا کہ جب لوگوں کے اعمال میرے حکم کے خلاف ہوں گے تو میں انہیں ہلاک و برباد کردوں گا اور کوئی انہیں بچا نہ سکے گا۔ اللہ کی سنت مبارک ہے کہ ہم حق کو باطل پر پھینکتے ہیں تو باطل کا نام ونشان تک مٹ جاتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کلمے والے کلمہ کو سیکھ لیتے ہیں اور کلمے کے مطابق ان کی زندگی ڈھل جاتی ہے۔ فرمایا کہ تم مین سے پہلے لوگوں کو بڑی بڑی حکومتیں اور بڑے بڑے عہدے دیے گئے ان پر بارشوں کے نظام چلائے اور دریا ان کے لیے مسخر کیے گئے جب میرے امر سے نافرمان ہوئے اور میرے ساتھ ٹکرائے تو پھر میں نے ان کو ہلاک کردیا اور اگر میرے رسولوں سے ٹکرائے تو میں نے ان کو ہلاک کردیا جس کی وجہ سے بے شمار بستیاں اور ملک برباد ہوئے۔

حضرت نوح علیہ السلام اس کلمہ کو لے کر اٹھے سامنے پوری دنیا کا باطل ہے لیکن آپ نے پوری محنت کے ساتھ ان تک کلمہ یعنی اللہ کا پیغام پہنچایا لیکن صرف 80 یا 82 لوگوں نے اس دعوت حق کو قبول کیا آپ نے ساڑھے نو سو سال تک لوگوں پر اس کلمہ کی محنت کی۔ نبی اللہ کی عظمت کو خود اپنے اور لوگوں کے دلوں میں بٹھایا ہے ہر نبی کا یہی کام ہے۔

تمام انبیا کلمہ کی محنت کرتے تھے اور لوگوں کو بتاتے تھے کہ لوگو "لا الہ الا اللہ" پڑھ لو کامیاب ہو جاؤ گے۔ کامیابی مال، ملک اور عہدے میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو ماننے میں ہے۔ کلمہ کا یقین دل میں اتارنے سے زندگی بنتی ہے۔ زندگی کا بننا اور بگڑنا اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہے کامیاب کردے اور جسے چاہے ناکام کردے۔ کلمہ ایک خالی بول نہیں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق زندگی کو گزار یعنی اللہ سے سب کچھ ہونے کا یقین اور مخلوق سے کچھ نہ ہونے کا یقین۔ آج بھی اگر مسلمان کی زندگی اس کلمہ کے مطابق بن جائے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس طرح آسکتی ہے۔ جس طرح صحابہ کرامؓ پر اترتی تھی۔ کلمہ بھی وہی ہے اور اس کا مفہوم اور مقصد بھی وہی ہے لیکن کلمہ والے بدل چکے ہیں۔ آج گناہوں کی کثرت کی وجہ سے ہمارے دل سیاہ ہو چکے ہیں اور ہم اللہ پاک ذات اور صفات کو بھول چکے ہیں۔

آج مسلمانوں کے زوال کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری معاشرت، معیشت، سیاست غرض کہ زندگی کے تمام پہلو کلمہ کے مطابق نہیں ہیں۔ ہم اپنی من مانی کی زندگی گزار رہے ہیں اور اسی وجہ سے ہمارے ساتھ اللہ کی مدد اور نصرت نہیں ہے اگر ہم آج بھی کلمہ کے مطابق عمل کرنے والے بن جائیں تو ہمارے اوپر بھی صحابہ کرام جیسی اللہ کی مدد اتر سکتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کلمہ کے یقین کو ہمارے دلوں میں اتار دے، آمین۔

ملک جواد نواز......ڈیرہ اسماعیل خان

کائنات کا نایاب تحفہ

یوں تو کائنات کے خوبرو مصور نے نہ جانے کتنی حسین پیکر تصویریں بنائیں مگر حضرت انسان کو

بہلانے کے لیے عورت دُنیا کا نایاب تحفہ ہے، جس کائنات کے مصور نے تخلیق زن سے پیشتر فرشتوں سے کہا۔

کہ جاؤ گلاب کے پھولوں سے رنگ و دلکشی لاؤ ،کلیوں سے سے معصومیت لو، ریشم سے ملائمیت، چاندنی سے ٹھنڈک، بہاروں سے رونق، قمدی سے نغمہ، ستاروں سے جگمگاہٹ، بلبل سے چہچہاہٹ، کوئل سے راگنی، سیاب سے تڑپ، چکوری سے بے چینی، آبشاروں سے موسیقی، ندی سے خاموشی، آفتاب سے تمازت، چھیرنوں سے طراوت، بادل سے بوندیں، کانچ سے نزاکت، شفق سے لالی، پہاڑوں سے صبر و استقامت، لاجونتی سے حیا، شہد سے ملاوت، شب سے گیئوں سے سیاہی، سرو شمشاد سے بلند قامتی، ہیرے سے چمک اور موجوں سے روانیلو، جب تمام اجزائے نایاب یکجا ہوئے تو عظیم مصور نے ان کو چشم حیوان پانے سے گھول کر پیکر عورت کو تخلیق کیا۔ جب یہ شاہکار حسین بنا تو ملائکہ نے عرض کی، یارب المشرقین والمغربین ،تو نے اپنی طرف سے اس انمول سوغات کو کیا دیا تو رب العالمین نے ارشاد فرمایا۔ ''محبت''۔

مجید احمد جائی...... ملتان شریف

خوش رہنے کا فارمولا

☆ شکوے شکایات کم کیا کریں اور ان نعمتوں کا شکر ادا کیا کریں، جو اللہ پاک نے آپ کو عطا فرمائی ہیں۔

☆ اپنے مسائل کے بارے میں کم سوچیں اور مسائل کو حل کرنے کی بھرپور کوشش کریں، نتائج کے بارے میں فکر مند نہ ہوں۔

☆ اپنے لیے بھی وقت نکالیں، اللہ تعالیٰ سے باتیں کریں۔

☆ صرف اتنی ذمہ داری قبول کریں جتنی کم سکتے ہوں، اپنی سکت سے زیادہ کام لینے سے گریز کریں۔

☆ اپنے اردگرد لوگوں کو اور اپنے گھر والوں کو خوش رکھنے کی کوشش کریں، آپ کو بھی خوشی ملے گی۔

☆ دوسروں کی بُرائیوں پر نظر مت رکھیں اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے رہیں۔

صائمہ نور...... بہاول پور روڈ ملتان

نبض شناس

کہتے ہیں کہ پرانے وقتوں میں کوئی حکیم صاحب تھے جنہوں نے پردہ نشین عورتوں کی نبض دیکھنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ رسی کے ایک سرے پر پردہ نشین خاتون کی کلائی باندھتے اور دوسرا سرا پردے کے باہر حکیم صاحب تک پہنچادیا جاتا حکیم صاحب اتنے ذکی الحس تھے کہ اسی پر اپنی انگلیاں رکھ کر نبض کی کیفیت معلوم کر کے مرض کی تشخیص کر لیتے اور ساتھ نسخہ بھی لکھ دیتے۔ ایک بار کچھ لوگوں کو دل لگی سوجھی وہ نہایت سنجیدگی سے حکیم صاحب کو بلا کر گھر لے گئے گھر کے اندر رسی کے ایک سرے سے بلی کی ٹانگ باندھ دی اور دوسرا سرا حکیم صاحب کو تھما دیا اور بولے۔

''حضور مریضہ کی نبض دیکھ لیجیے۔''

حکیم صاحب نے اپنی انگلیاں رسی پر رکھیں اور فرمانے لگے۔ ''مریضہ کچا گوشت کھا گئی ہے اور وہ ابھی ہضم نہیں ہوا۔

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان

شیطان نے کہا مجھے شکایت ہے

۞ ان لوگوں سے جو دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کا گر نہیں جانتے۔

۞ ان فلمسازوں سے جو ایکشن فلمیں بناتے ہیں لیکن ان میں کوئی قتل نہیں ہوتا۔

۞ ان تاجروں سے جو اپنا ٹیکس وقت پر اور پورا ادا کرتے ہیں۔

۞ ان لوگوں سے جو موقع ملنے پر بھی کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔

❁ ان تاجروں سے جو ذخیرہ اندوزی نہیں کرتے۔
❁ ان طالب علموں سے جو محنت کر کے پاس ہوتے ہیں
❁ ان کارخانہ داروں سے جو ملاوٹ نہیں کرتے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

انمول موتی

☐ دو گھونٹ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ ایک غصہ کا، دوسرا صبر کا۔

☐ دو قطرے اللہ کو بہت پسند ہیں۔ جہاد میں خون کا، دوسرا انتہائی میں خوف خدا میں نکلا ہوا آنسو۔

☐ دو قدم اللہ کو بہت پسند ہیں۔ ایک جو فرض نماز کے لیے اٹھا اور دوسرا جو کسی بیمار کی عیادت کے لیے۔

☐ رشتے درختوں کی مانند ہوتے ہیں بعض اوقات ہم اپنی ضرورتوں کی خاطر انہیں کاٹتے چلے جاتے ہیں اور آخر کار خود کو گھنے سائے سے محروم کر دیتے ہیں۔ ایمان جب انسان کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کر لیتا ہے تو برائی مشکل اور نیکی آسان ہو جاتی ہے۔ دل نرم اور آنکھیں نم رہنے لگتی ہے۔

☐ برائی کی مثال ایسی ہے جیسے پہاڑ سے نیچے اترنا ایک قدم اٹھاؤ تو باقی اٹھتے چلے جاتے ہیں اور اچھائی کی مثال ایسی ہے جیسے پہاڑ پر چڑھنا۔ ہر قدم پچھلے قدم سے زیادہ مشکل مگر ہر قدم پر بلندی ملتی ہے۔

☐ دولت اور حسن کے لالچ میں کبھی اپنی سیرت خراب مت کرنا کیونکہ دولت دنیا میں رہ جائے گی اور حسن مٹی میں دفن ہو جائے گا لیکن اچھی سیرت آخرت تک ساتھ دے گی۔

عائشہ اعوان...... رحیم یار خان

سنہری باتیں

● تمام ڈپلومیسی کسی نہ کسی انداز میں جنگ ہی کا تسلسل ہوتی ہے۔ (چوائن لالی)

● کوئی ایک دماغ ہر بات پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ (کولرج)

● صابر اور مطمئن آدمی کے غضب سے بچو۔ (جان ڈرائیڈن)

● جب تک طاقت عوام کو منتقل نہیں ہوتی قلم کو خنجر اور لفظ کو آگ بنائے رکھنا ہے۔ (بے نظیر بھٹو)

● تعمیر اور صرف تعمیر ہی سب فنون میں سب سے قابل قدر فن ہے۔ (لانگ فیلو)

● سمجھ دار باپ تو سمجھ دار بیٹی، سمجھ دار ماں تو سمجھ دار بیٹا۔ (روسی کہاوت)

● جسے التجائیں کرنے کا شوق ہے اسے سمندر میں کود جانے دو۔ (ہربرٹ)

اشفاق شاہین...... کراچی

اللہ والے

ایک ولی سے ابلیس نے کہا۔ ''تجھے اللہ پر بہت یقین ہے تو پھر اس اونچے پہاڑ پر چڑھ کر چھلانگ لگا دے دیکھتے ہیں کہ تیرا اللہ تجھے بچاتا ہے کہ نہیں۔''

ولی نے جواب دیا: ''نادان، یہ اللہ کا کام ہے کہ مجھے آزمائے میرا کام نہیں کہ میں اس کو آزماؤں۔

جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

حیرت انگیز معلومات

اردو میں لفظ اللہ کے چار حروف ہیں۔ محمد ﷺ کے چار حروف ہیں۔ رسول کے چار حروف ہیں۔ کتاب کے چار حروف ہیں۔ قرآن کے چار حروف ہیں۔ مسجد کے چار حروف ہیں۔ کلمہ کے چار حروف ہیں۔ نماز کے چار حروف ہیں۔ روزہ کے چار حروف ہیں۔ زکواۃ کے چار حروف ہیں۔ جہاد کے چار حروف ہیں۔ سورج کے چار حروف ہیں۔ چاند کے چار حروف ہیں۔ زمین کے چار حروف ہیں۔ سمتیں چار ہیں ہر سمت کے بھی چار حروف ہیں۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، یہ چاروں الفاظ چار چار حروف پر مشتمل

ہیں۔ کعبہ کے چار حروف ہیں۔ زم زم کے چار حروف ہیں۔ نکاح کے چار حروف ہیں طلاق کے بھی چار حروف ہیں۔ دنیا کے چار حروف ہیں آخرت کے بھی چار حروف ہیں۔ بہشت اور جہنم دونوں کے چار چار حروف ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کے دوست بھی چار ہیں یعنی حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ۔ بڑے فرشتے بھی چار ہیں۔ حضرت جبرائیلؑ، حضرت میکائیلؑ، حضرت اسرافیلؑ، حضرت عزرائیلؑ۔ خلفائے راشدین بھی چار ہیں اور آسمانی کتاب بھی چار ہیں۔

منشی محمد عزیز میہ...... حیدرآباد

سچ جو دل کو بھا جائے

⌘ غلطی ماننے اور گناہ چھوڑنے میں بھی دیر مت کیجیے کیونکہ سفر جتنا طویل ہوتا جائے واپسی اتنی ہی دشوار ہوتی ہے۔

⌘ شکر ادا کرتے رہو اس ربّ کا جو برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ سکھ دیتا ہے۔

⌘ زمانہ بُرے لوگوں کی برائی کی وجہ سے خراب نہیں ہوتا بلکہ اچھے لوگوں کی خاموشی کی وجہ سے خراب ہو جاتا ہے۔

⌘ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ پریشانیوں میں گھرا ہونے کے باوجود ہمت اور حوصلے سے آگے بڑھا جائے۔

⌘ موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے بیچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کردی ہیں۔

⌘ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم اللہ کو ایک مانتے ہیں لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اللہ کی ایک نہیں مانتے۔

⌘ ہر حال میں ربّ کا شکر ادا کرتے رہو بے شک خالقِ کائنات وہ جانتا ہے جو ہم نہیں جانتے۔

⌘ ہماری ہر آزمائش کے پیچھے ہماری بھلائی پوشیدہ ہے کہ ہر آزمائش انسان کو کندن بناتی ہے اور نکھار پیدا کرتی ہے۔

⌘ ناکامی جرم نہیں، مقصد کا پست ہونا جرم ہے۔

عاصمہ امداد علی...... گوجرانوالہ

خاموشی

خاموش رہنا بھی کبھی کبھی سوال بن جاتا ہے اگر یوں کہا جائے کہ خاموشی ہے ہی سوال تو غلط نہ ہوگا۔ خاموشی جہاں دوسروں کے لیے سوال بن جاتی ہے وہاں آپ کے لیے اس سوال کا جواب جو کوئی دوسرا فرد آپ کو نہیں دے سکتا۔ خاموشی تنہائی میں آپ کو وقت دیتی ہے خود کو جاننے پہچاننے کا۔

جہاں یہ آپ کا تعلق دوسروں سے توڑ دیتی ہے وہیں آپ سے آپ کا تعلق بے حد مضبوط بنا دیتی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ سب سے اپنا تعلق توڑ لو اور خود میں ہی کھوئے رہو یوں تو ایسا ہوگا کہ آپ ہو یا نہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا اور کبھی کبھی خاموش رہنا بے وقوفی کہلاتا ہے بولو ضرور پر وہاں جہاں بولنا ضروری ہو۔ آپ کے لیے اور سب کے لیے اس طرح خاموشی سوال نہیں بلکہ جواب کے روپ میں سوال بن جاتی ہے۔

مبشرہ سحر...... عبدالحکیم

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

(اس ماہ کا انعام یافتہ کلام)

غزل

میں تیری اک نظر ہی سے گل و گلزار ہوجاؤں
جو میری روح آئے وجد میں، سرشار ہوجاؤں
ترے جذبوں کی میٹھی بانسری دل کی لہک ٹھہرے
میں ترا گیت بن جاؤں تو پھر ملہار ہوجاؤں
دلہن بن کر مجھے سجنا ہے دل کی سیج پر آخر
تری خوشیوں کے پھولوں کا مہکتا ہار ہوجاؤں
جو تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں آجائے میری جاں
زمانے کے ستم کے سامنے تلوار ہوجاؤں
سمندر عشق کا ہے بے کراں لیکن تری خاطر
کسی کچے گھڑے پر تیر کر میں پار ہوجاؤں
دعا کرتی ہوں خانم، اپنے رب سے دل کے جذبوں سے
محبت کرنے والی میں انوکھی نار ہوجاؤں

فریدہ خانم...... لاہور

غزل

اے خدا جب بھی تیرا آسمان دیکھتی ہوں
اس میں بسا ایک جہان دیکھتی ہوں
نجانے کتنے ہی جہانوں کی سیر کرتی ہوں
کھول کر جب تیرا قرآن دیکھتی ہوں
احسان کتنے ہیں تیرے بندوں پر یا رب
جب بھی سورۃ رحمٰن دیکھتی ہوں
تو، تو کہتا ہے رگ جاں سے بھی ہوں میں قریب
پھر پریشان کیوں آج کا انسان دیکھتی ہوں
اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا اے ابن آدم
تجھ پر میں اس کی رحمت کے نشان دیکھتی ہوں

شاعرہ: پروین شاکر

انتخاب: عائشہ اعوان...... رحیم یار خان

کربلا

دینِ اسلام پہ ہی سر کو کٹایا ہم نے
اس کو دشمن کے ہے آگے نہ جھکایا ہم نے
میرے نانا تری امت پہ تھا ظالم قابض
تیر کھائے ہیں مگر اس کو بچایا ہم نے
ہمیں لوگوں نے بلایا کئی چٹھیاں لکھ کر
اس کے باوصف کسی کو نہ ستایا ہم نے
تشنگی میں علی اصغر کا گلہ کاٹا گیا
اپنے ہی خون سے معصوم نہایا ہم نے
خوں چکاں لاشوں کو کاندھوں پہ اُٹھایا اس روز
تیرا فرمانِ عبادت نہ بھلایا ہم نے
گر مسلط ہو کبھی اس پہ یزیدی لشکر
راستہ امتِ احمد کو دکھایا ہم نے
ڈوب کر خوں میں جواں مردی و پامردی کا
سارے سنسار کو پیغام سنایا ہم نے
بازو عباس کے کاٹے گئے بے دردی سے
یوں ترے دین کے بوٹے کو بچایا ہم نے
بے رداز ینب و کلثوم بھی پابند ہوئیں
الغرض جو بھی تھا ہمراہ لٹایا ہم نے
عین پیکار میں قاسم کو بیاہ کر شہزاد
حوصلہ کہتے ہیں کس کو یہ بتایا ہم نے

آصف شہزاد...... فیصل آباد

بے وفا دسمبر

سن اے تنہا دسمبر
لوگ تجھے اداس کہتے ہیں
تو سن......
اک کام تو میرا کر دے

پھر میرا تجھ سے یہ وعدہ ہے
کوئی تجھے اداس بے وفا دسمبر نہیں
کہے گا
دیکھ
تو اب کے برس جاتے جاتے مجھے اس سے
ملا دے
سن اے تنہا دسمبر
روبی علی......سید والا

اسے کہنا......!
اسے کہنا
تمہاری یاد آتی ہے
مجھے ہر پل ستاتی ہے
مجھے بہت رلاتی ہے
اسے کہنا
تمہیں یاد کرتا ہوں
تیری ہی آہ بھرتا ہوں
تیرے لیے جیتا مرتا ہوں
اسے کہنا
دسمبر لوٹ آیا ہے
تیری امید ساتھ لایا ہے
ابھی تم بھی آ جاؤ ناں
اسے کہنا
مجھے تنہا نہیں رہنا
یہ درد مجھے اب نہیں سہنا
تیرے بن مجھے اب اور نہیں جینا
اسے کہنا
تم امید کا ستارہ ہو
میری آنکھوں کا نظارہ ہو
تم ہی جینے کا سہارا ہو
اسے کہنا
زخم بھر دو تم
اتنا سا کام کر دو تم
دل کو اب نرم کر دو تم
اسے کہنا
نہ اتنا یاد آؤ تم
نہ یوں مجھ کو ستاؤ تم
نہ یوں مجھ کو رلاؤ تم
اسے کہنا......!!
ڈاکٹر علی حسنین تابش......چشتیاں

غزل

گمنام رستوں میں لب بام پر آ گیا
پس منظر میں تھا منظر عام پر آ گیا
جس رہگزر میں انمٹ نقوش تیرے
ایسی ہی اب شاہراہ عام پر آ گیا
گردش دوراں کی اس ادھیڑ بن میں
جو بھولتا نہیں اب اسی نام پر آ گیا
تیرے راستے بھی تیرے ہی تابع نکلے
کون سی منزل نا تمام پر آ گیا
جس شہر میں کوئی جانتا نہ ہو مجھ کو
اس شہر میں اب تیرے نام پر آ گیا
یہ جو فاصلے ہیں اب یہی سلسلے ہیں
تجھ سے تعلق کے ابہام پر آ گیا
گھر سے نکلا تھا کتابیں خریدنے مگر
بڑا پر آشوب دور ہے کام پر آ گیا
جو اہل جنوں ہوں گے سر پر بٹھالیں گے
لگتا ہے یوں اپنے منطقی انجام پر آ گیا
سیف الاسلام......لیاقت آباد، کراچی

شام

سمندر کے سفر میں اس طرح آواز دو ہم کو
ہوائیں تیز ہوں اور کشتیوں میں شام ہو جائے

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے پاس رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے
فلک شیر ملک......رحیم یار خان

تلاش
میں نے چاہا کہ خدا کو تلاش کروں
زمین کی وسعتوں میں
سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں میں
روشن چاند ستاروں میں
اونچے اونچے پہاڑوں میں
پھولوں کی خوشبو میں
پرندوں کے گیتوں میں
نادان تھی جان نہ سکی
وہ تو میرے اندر ہے
میری شہ رگ کے نزدیک
میرے دل کے نہاں خانے میں
ریحانہ سعیدہ......لاہور

غزل
جو تیری یاد کے دن تھے
وہ کیسے خواب سے دن تھے
عجب کیا، وہ زمانہ تھا
جسے نہ تم نے جانا تھا
فضائیں گنگناتی تھیں
ملن کے گیت گاتی تھیں
کبھی دل میں بہاریں تھیں
گلابوں کی قطاریں تھیں
نہ اب دل میں بہاریں ہیں
نہ برکھا کی پھواریں ہیں
بس اب ایک یاد ہے باقی
دل ناشاد ہے باقی
نہ تھا ایسا گماں اپنا
جلے گا، آشیاں اپنا
رہی جو زندگی ایسے
کٹے گی زندگی کیسے
مگر ہے آرزو میری
میری ہو، زندگی تیر
وقار، ایسا کریں گے
نہ دل میں غم ہیں ایسے
وقارالرحمان......لاہور

شاعری بولتی ہے
جب تیری زلف فضاؤں میں بکھر جاتی ہے
چاندنی رات میں کچھ اور نکھر جاتی ہے
نشہ عشق سے ندی کی لہر ڈولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے
چاندنی جب میرے آنگن میں اتر آتی ہے
تیری یاد میرے ساتھ لپٹ جاتی ہے
ایک سرگوشی سی کانوں میں شہد گھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے
تیری سانسیں میری سانسوں میں گھلی ہیں جب سے
میری پلکیں تیری آنکھوں پہ جھکی ہیں جب سے
راز سب پیار کے موسم کی ادا کھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے
جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

نظم
ابھی میرے دل سے ضبط کا موسم گیا نہیں
ابھی میرے آنکھوں کے سپنے ٹوٹے نہیں
ابھی مجھ سے میرے اپنے روٹھے نہیں
ابھی میرے خیالوں کے محلات گرے نہیں
مگر......!
ضبط کا موسم بھی جا سکتا ہے

سپنے بھی ٹوٹ سکتے ہیں
اپنے بھی روٹ سکتے ہیں
خیالوں کے محل گر سکتے ہیں
گر......
اب کے بارے اس ساون کے ساتھ
تو نہیں آیا
ہاں گر تو نہیں آیا

ساحل ابڑو......ڈیرہ اللہ یار، بلوچستان

غزل

کسی کی عنایتوں نے یہ دن دکھائے ہیں
میرے اپنے بھی یوں پھر سے پرائے ہیں
کھل کے برستا نہیں آج یوں ابر بھی
ہم زمانے کے ہاتھوں سے ستائے ہیں
فریب دینا ان کا ہے معیار زندگی
حسن والوں نے ہم پہ ستم کئی ڈھائے ہیں
بچھڑ جائیں تو مڑ کے دیکھتا نہیں کوئی بھی
یاروں کی باتوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
دامن پہ گلے داغ دیکھتا کوئی نہیں جاوید
شرارے بھی پھول بن کر پھر جگمگائے ہیں

اسلم جاوید......فیصل آباد

نظم

میں برسوں سے جھیل کا گہرا پانی
تم برسوں سے منزل سے انجان مسافر
چلتے چلتے اک دن تم
میرے ساحل پہ آ بیٹھی
اپنا دل بہلانے کو
تم نے مجھ میں ایک کنکر پھینکا
تب سے اب تک
میری پہروں میں ہل چل ہے
تم نے مجھ سے
میرا جو ٹھہراؤ چھینا
ہے واپس کر دو
یا مجھ کو منزل اپنی جان کر تم
مجھ میں اتر و
اور پھر مجھ میں ایسے گم ہو جاؤ
جیسے جھیل کے پانی میں
گرتی بوندیں بارش کی

ایم ارشد وفا......گوجرانوالہ

غزل

زندگی احسن طریقے سے گزاری دوستو
پھر نہ جانے کیوں ہے دل کی بے قراری دوستو
ہارنے والے اٹھا لیتے ہیں سر پر آسماں
ہم کہ ہیں آشنائے بردباری دوستو
لاکھ دیکھو تم بری باتوں کو پھلتا پھولتا
پھر بھی اچھی بات کا پلہ ہے بھاری دوستو
اپنی جانب بڑھ رہی ہے جو بلائے منشیات
مل کے ہم اس پر کریں گے سنگباری دوستو
یہ حسین لوگوں کے چکر الامان والحفیظ
ہم سنبھل جائیں ہمیں گر جان ہے پیاری دوستو
جو نئی تہذیب کے عفریت ہیں چاروں طرف
اس پر ہم مل کے لگائیں ضرب کاری دوستو
اب اتر آئے ہیں ہم بھی غم کی وادی میں قمر
اشک آنکھوں میں ہیں لب پہ آہ و زاری دوستو

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

آخری حصہ

نامعتبر

ناصر ملک

زندگی کے معتبر اور نامعتبر راستوں میں الجھی ہوئی زندگیاں بسا اوقات اپنی ہویت سے بھی انکار کر دیتی ہیں۔ جو کچھ کھلی آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے، وہ بھی جھوٹ اور افسانوی منظر محسوس ہوتا ہے اور جو دکھائی نہیں دیتا، اس پر دل یقین کی تمام تر دولتیں لٹانے پر کمربستہ ہوتا ہے۔ یہ داستان بھی زندگی سے نبرد آزما شعلہ رو انسانوں کو درپیش آنے والے واقعات کے گرد دیوانہ وار رقص کرتی ہے اور کبھی اعتبار کے زینوں پر قدم رکھتی ہے تو کبھی بے یقینی کی دلدل میں سانسوں تک اتر جاتی ہے۔ وہ اپنی یادوں کی کھوج میں سندر بن آئی تھی اور بھیانک حالات کی بھینٹ چڑھ گئی۔ سزا کے طور پر وہ جسے سونپی جا رہی تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ وہی اس کی زندگی کا حاصل بننے جا رہا ہے۔ وہ ہاتھ سے نکل گیا تو اسے احساس ہوا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ صدیوں چلتا رہا، بے اعتباری کی آگ میں جلتا رہا مگر لب بستہ رہا۔

وہ دو مذاہب کے بیچ لٹکتے ہوئے زندگی گزار رہی تھی اور مایوس ہوئی تو روشنی کی کرن چمک اٹھی۔

اردو ادب کے معتبر قلم کار کے قلم سے ایک نامعتبر مخلص کا احوال





بمشکل چودھویں سن میں...... سنبل نے اسے دوستی کی پیش کش کردی جسے سمیر نے قبول کیا اور اس کی فرینڈز لسٹ میں شامل ہو گیا۔ وہ رومن اُردو میں چیٹنگ کرتا تھا۔ سنبل کے لیے اس کی ذات میں دلچسپی کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ نورنگ شاہ کے گاؤں 'سندر بن' کا رہنے والا تھا۔ راولپنڈی میں اپنے ماموں کی کوٹھی میں نوکری کرتا تھا۔ اس کا ماموں پاکستان کا روایتی امیر شخص تھا مگر اس کی تینوں بیٹیاں اس سے مختلف تھیں۔ وہ اپنے پھوپھی زاد سمیر کو فارغ وقت میں پڑھایا کرتی تھیں اور اسے اپنا کمپیوٹر استعمال کرنے کی اجازت بھی دیا کرتی تھیں۔ سمیر جب تنخواہ کی رقم اپنے گھر دینے جاتا تو بڑی ماموں زاد رقیہ کا ڈیجیٹل کیمرہ بھی ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ سندر بن کے مختلف مناظر کی عکس بندی کر لاتا اور فیس بک پر اپ لوڈ کر دیا کرتا۔ سنبل جب سندر بن کی نت نئی تصاویر دیکھتی تو چیٹ روم میں اس سے مخاطب ہو جاتی۔ اس سے تصویر کے بارے میں کئی جزئیات دریافت کرتی جسے وہ خوشی خوشی بیان کرتا جاتا۔ اس کے کہنے پر سمیر نے پربت شاہ، اس کی حویلی اور دادا کی قبر کی تصاویر بھی اپ لوڈ کیں جنہیں سنبل نے اپنے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا۔

سمیر نے غیر ارادی طور پر سنبل کے دل میں سندر بن کو دیکھنے کا شوق بھر دیا تھا مگر وہ جونہی پربت شاہ کے بارے سوچتی، اس کی تصویر کو دیکھتی تو اپنے شوق پر دبیز چادر اوڑھا دیتی۔ سمیر پربت شاہ کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اسے 'شاہ سائیں' کا خطاب دیا کرتا تھا۔

پھر جب ایک دن اس نے سمیر کو آن نیٹ دیکھا، اس کا حال دریافت کیا تو وہ گویا پھٹ پڑا، اس نے لکھا۔ ''آج مجھے کچھ نہ کہو۔ میں بہت پریشان ہوں۔'' اس نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ پھر پوچھا۔ ''مگر یہ تو بتاؤ کہ تم پریشان کیوں ہو؟''

کافی دیر تک چیٹ روم پر مدھم رنگ میں جملہ 'سمیر اِز ٹائپنگ' آویزاں رہا پھر جو تحریر سنبل کے سامنے آئی، اس نے اس کا دل دہلا کر رکھ دیا، لکھا تھا۔ ''میرا بابا شاہ سائیں کی حویلی میں کام کرتا ہے۔ پرسوں میرے بابا نے شاہ سائیں کی ولایتی گائے کو کسی وجہ سے چھڑی ماردی۔ وہ بدکی تو ایک پتھر پر سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ جس کے نتیجے میں ڈھلوان میں گر گئی اور اس کی پچھلی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ شاہ سائیں کے حکم پر دوسرے نوکروں نے میرے بابا کو اتنا مارا کہ اس کا دایاں بازو اور دائیں جانب کی دو پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ صرف یہی نہیں، گھر کا سامان اٹھانے کی اجازت دیے بغیر میرے گھر والوں کو شاہ سائیں نے وادی سے نکال دیا ہے۔ اب وہ کالکوٹ کے قریب ایک متروک سرکاری عمارت میں دبکے بیٹھے ہیں۔ میرے بہن بھائی دو دن سے بھوکے ہیں۔ کچھ دیر پہلے ہمیں اس قیامت کا پتا چلا۔ ماموں انہیں لینے چلے گئے۔ دعا کریں کہ میرا بابا ٹھیک ہو......''

سنبل کے دل کو گھونسا لگا۔ اس کا سگا چچا اتنا ظالم فطرت ہے اگر اس کے ذہن میں پربت شاہ کی شخصیت کے بارے میں رہا سہا کوئی شک تھا بھی تو وہ ہوا ہو گیا۔ اس نے سمیر کو تسلی دی۔ اسے کہا کہ وہ اپنی کسی ماموں زاد بہن کا اکاؤنٹ نمبر، نام اور شناختی کارڈ نمبر بھیجے تاکہ وہ اسے ایک معقول رقم بطور مدد بھیج سکے۔ سمیر کو منی ٹرانسفریشن کے معاملات کی سدھ بدھ نہیں تھی۔ وہ اپنی ماموں زاد بہن رقیہ کو چیٹ روم میں لے آیا۔ رسمی تعارف میں پتہ چلا کہ وہ ایک اچھے نجی اسکول میں ٹیچر تھی۔ رحم دل لڑکی تھی۔ اسے بخوبی احساس تھا کہ اس کا باپ اپنے بھانجے کے ساتھ اچھا رویہ نہیں رکھتا۔ اس نے اپنا نام، شناختی کارڈ کا نمبر اور اکاؤنٹ کی تفصیل دی۔ ویسٹرن یونین کی ایک برانچ

سنبل کے گھر کے قریب واقع تھی۔ اس نے فوری طور پر پانچ سو یورو رقیہ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیے۔
گھر کے فون نمبر پر رقیہ اور سمیر سے پہلی مرتبہ بات چیت بھی کی، دلاسا دیا اور کہا۔ "رقیہ! سمیر بچہ ہے مگر میرا دوست ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ دوستی میں عمر کی اونچ نیچ نہیں ہوتی۔ میں اس سے اتفاق کرتی ہوں۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ تم اس کا خیال رکھا کرو۔ میں نے کچھ رقم ویسٹرن یونین سے بھجوادی ہے۔ یہ سمیر کے والد کے علاج کے لیے ہے۔ کیا میں یقین رکھوں کہ تم میری بھیجی ہوئی رقم کو غلط جگہ پر استعمال نہیں کرو گی؟"
رقیہ بہت ذمہ داری سے گفتگو کر رہی تھی، بولی۔ "میڈم! میں آپ کو خرچ کی جانے والی رقم کی ڈیٹیل دوں گی۔ آپ خود فیصلہ کر لیجیے گا۔ مجھے اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ میں سمیر کی حق تلفی نہیں کروں گی۔ ابو پر میرا زور نہیں ہے۔ وہ جو کرنا چاہیں، کریں، میں روک نہیں سکتی۔ مگر میں اور میری بہنیں سمیر سے محبت کرتی ہیں کیونکہ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ ہم نے سمیر کو اپنا چھوٹا بھائی مان رکھا ہے۔ آپ یقین رکھیں کہ میں اس کا نقصان نہیں ہونے دوں گی۔"
رقیہ نے پھر سمیر سے بات کرائی۔ وہ چیٹ روم میں بہت کچھ لکھ لیتا تھا مگر بولتے ہوئے شرماتا تھا۔ جو کہنا چاہتا تھا، کہہ نہیں پاتا تھا۔ سنبل کے دل میں سمیر کے لیے اور بھی ہمدردی بھر گئی۔ وہ پربت شاہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی مگر اس کے شر سے متاثر ہونے والے کی تھوڑی سی مدد کر سکتی تھی۔ پانچ سو یورو کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی مگر اسے اندازہ تھا کہ پاکستان میں پہنچ کر یہ رقم سمیر کے باپ کے لیے خاصی کارآمد ہو جائے گی۔ بڑے عرصہ بعد اس نے سمیر اور رقیہ سے اردو میں گفتگو کی تھی کیونکہ بابا کے بعد کسی سے بولنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ دل میں عجیب سی طمانیت بھر گئی۔ رقیہ کا میٹھا میٹھا لہجہ بہت بھلا لگا۔
آنے والے دنوں میں وہ سمیر اور رقیہ سے ٹیلی فونک رابطے میں رہی۔ اسے ان کے باپ کے کاروباری اوقات کا بخوبی علم ہو گیا کیونکہ اس کی موجودگی میں وہ دونوں سنبل سے کھلی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ سمیر کا باپ پنڈی کے ایک سرکاری اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ وقتاً فوقتاً سنبل نے بارہ سو یورو رقیہ کو بھیجے جو نہ صرف اس کے علاج کے لیے کافی ثابت ہوئے بلکہ آدھی سے زیادہ رقم بچ بھی گئی تھی۔ وہ دونوں اس کے بہت ممنون تھے جبکہ ان کی مالی اعانت کر کے سنبل کا دل پرگداز مسرت حاصل کر چکا تھا۔
سنبل کی ایما پر سمیر کے خاندان نے پنڈی کی ایک مضافاتی بستی میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ سمیر کا باپ شہر میں چھوٹی موٹی مزدوری کرنے لگا تھا جبکہ اس کی ماں نے ایک بنگلے میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ان کے بقیہ رشتہ دار بدستور سندر بن میں ہی مقیم تھے۔
یہ معاملہ انجام پذیر ہو گیا مگر سنبل کا ناتا ایک بار پھر سندر بن سے استوار ہو گیا۔ رقیہ کو سرکاری نوکری مل گئی اور اس کی پہلی تعیناتی کالکوٹ کے پرائمری اسکول میں ہوئی تھی۔ اسے خاصا طویل سفر طے کر کے ڈیوٹی اسٹیشن پر جانا پڑتا تھا۔ اکیلے جانے سے ڈرتی تھی اس لیے ہر روز سمیر کو ساتھ لے جاتی۔ اس اسکول میں سندر بن کے بچے بچیاں بھی زیرِ تعلیم تھیں۔ ان میں سمیر کے چند رشتہ دار بھی تھے۔ ان کی وساطت سے سنبل کو سندر بن کے حالات سے آگہی حاصل ہونے لگی۔
سنبل کے لیے یہ حالات دل گرفتگی کا سبب تھے۔ اسے علم ہوا کہ سردار خان نامی ایک شخص جو گزشتہ چند سالوں سے بندرہ والی حویلی میں قیام پذیر تھا، بہت بڑا ڈرگز سپلائر تھا۔ ملک کی سرحدی پٹی کے چند اسمگلرز سے اس کے قریبی تعلقات استوار

تھے جن کے توسط سے وہ باقاعدگی کے ساتھ منشیات کی بڑی مقدار سندر بن منگوایا کرتا تھا۔ یہاں سے اطراف کے تمام علاقوں کے ڈیلرز کو سپلائی دی جاتی تھی۔ یہ ڈیلرز پہاڑی دیہات کے سادہ لوح لوگوں کو پہلے تو منشیات بالخصوص ہیروئن کا عادی کرتے تھے، پھر اس کی قلیل مقدار پیک کر کے 'ٹوکن' بناتے جو مہنگے داموں ان عادی نوجوانوں کے ہاتھ بیچا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ اس تواتر اور قانونی روک ٹوک کے بغیر جاری تھا کہ دیہات کے دیہات برباد ہونے لگے تھے۔ اس مکروہ کام کی سرپرستی پولیس کی کالی بھیڑیں اور مفاد پرست حکام کرتے تھے جن کی تجوریوں کے حجم دن بدن بڑھتے جارہے تھے۔ سردار خان پربت شاہ کی اعانت کے بغیر سندر بن یا بندرہ میں ایک لمحہ بھی گزار نہیں سکتا تھا، اس لیے اس نے شاہ سائیں کو برابر کا پارٹنر بنا رکھا تھا۔ چونکہ سندر بن کی وادی اس خوف ناک دھندے کے لیے آئیڈیل تھی، محفوظ تھی اور عمومی طور پر پولیس کا اس علاقے میں عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا، اس لیے سردار خان اور پربت شاہ کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔

جہاں آس پاس کے دیہات اس مکروہ نشے کی لپیٹ میں آئے، وہاں سندر بن کے ان پڑھ اور سادہ لوح باسی بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ ہر دوسرے گھر کا نوجوان جہاز بن کر گلیوں میں چکرانے لگا۔ یہ صورت حال بہت کریہہ تھی مگر پربت شاہ نوٹ گننے میں مصروف تھا۔ کئی مرتبہ سندر بن کے معمر غریبوں نے پربت شاہ کو دبے دبے لفظوں میں اپنے گھروں کی تباہی کا دکھڑا سنایا۔ اس نے دادرسی کے بجائے ہر مرتبہ ہنس کر کہا۔ "کیا سردار خان گن پوائنٹ پر تمہارے بچوں کو نشہ بیچتا ہے؟"

جب کھلے عام ٹوکن بکنے لگا تو پنڈی سے ایوبیہ تک سندر بن کی بدنامی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دور دراز سے ٹرک ڈرائیور حضرات اور منشیات کے چھوٹے موٹے ڈیلر چرس، ہیروئن اور افیون کی تلاش میں سندر بن کی طرف آنے لگے۔ وادی کے لوگوں کو ان نت نئی دکھائی دینے والوں کی شکلوں سے نفرت تھی مگر وہ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ بولنے کی صورت میں پربت شاہ انہیں مار پیٹ کر علاقے سے نکال دے گا۔ سر پر تنی ہوئی چھت جاتی رہی تو وہ کہاں جائیں گے؟ جہاں علم اور ہمت کی کمی ہوتی ہے وہاں ایسی ہی بزدلی دیکھنے کو ملتی ہے ورنہ غریب آدمی کی گزران کا ماجرا کیا؟...... یہاں کیا، وہاں کیا...... وہ جہاں بھی چلا جائے، ایک سی دنیا، ایک سا ماحول...... جب سارا دن جسم کو سولی پر لٹکا کر شام کو دو لقمے پیٹ میں ڈالنا ہی زندگی ہو تو پھر اس میں ہجرت کا ڈر کیا اور پڑاؤ کے معانی کیا...... کولہو کے بیل کی طرح زندگی کی چکی پیسنے والے ماہ بہ ماہ اپنے جواں سال گھبرو گنواتے رہے، لب بستہ رہے اور آسمان کی طرف دیکھتے رہے...... کسی غیبی مدد کے لیے آنکھیں نم کرتے رہے۔

چند ماہ بعد سنبل کو سندر بن سے ایک عجیب وغریب خبر موصول ہوئی۔ پربت شاہ نے سندر بن کی بستی خالی کرنے کا حکم دے دیا تھا کیونکہ اس نے سردار خان سے مل کر کالکوٹ سے سندر بن تک جدید طرز کی چیئر لفٹ لگانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ پہلے پوائنٹ سے سندر بن گاؤں تک ایک سیدھ میں لفٹ، اپ اینڈ ڈاؤن چل سکتی تھی۔ عین گاؤں والی جگہ پر سٹے ڈیک بنایا جانا ضروری تھا۔ یہاں سے آخری پہاڑی تک کیبل کار کا منصوبہ زیر غور تھا۔ سردار خان نے جس کنٹریکٹر کی خدمات حاصل کی تھیں، وہ چاہتا تھا کہ سندر بن کو ٹورازم پوائنٹ بنا کر پوری طرح کمرشلائز

کر دیا جائے۔ چیئر لفٹ اور کیبل کار کی وجہ سے اس پوائنٹ سے بہت بڑی آمدنی متوقع تھی۔

پربت شاہ نے سندر بن کو مسمار کرنے کے ساتھ نئی بستی کے لیے بندرہ میں تھوڑی سی ناکارہ زمین مختص کر دی تھی۔ سندر بن کے باسیوں کو یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ انہیں اپنے مکانات خود تیار کرنا ہوں گے۔ تین پشتوں سے بیٹھے ہوئے غریب مزدور لوگوں پر قیامت ٹوٹنے کی یہ ہولناک خبر سن کر سنبل کا دل مٹھی میں آگیا۔ یوں لگا جیسے اس کے سینے میں نورنگ شاہ کے دل نے زندگی کی سانسیں لینا شروع کر دی تھیں۔

وہ کئی دن اس سوچ میں مستغرق رہی۔ وہ ان اجنبی لوگوں کے لیے کیا کر سکتی تھی؟ بالآخر اس نے رقیہ سے دریافت کیا۔ "تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں ان لوگوں کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

رقیہ نے آزردگی سے کہا۔ "میڈم! آپ کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔ یہ پربت شاہ کی ذاتی جائیداد ہے۔ وہ اس پر کچھ بھی تعمیر کر سکتا ہے۔"

وہ بولی۔ "مگر میں نے سنا ہے کہ یہ وادی اس کے بھائی کی ملکیت ہے، پربت شاہ کی نہیں ہے۔"

"یہ آپ نے کہاں سے سنا ہے؟"

"جہاں سے بھی سنا، سچ سنا ہے۔" سنبل نے یقین کے ساتھ کہا۔

سمیر سن رہا تھا، اس نے اپنا منہ ریسیور کے نزدیک کیا۔ "آپ کو نہیں پتہ، میں بھی زیادہ نہیں جانتا۔ بابا جانتا ہے۔ وہی تمہیں بتائے گا۔ میں اسے شام کو یہاں لے آؤں گا۔ تم اس وقت فون کرنا۔ اوکے!"

وہ اس سے بہت زیادہ فرینک تھا۔ برابری کی سطح پر دوست بننے کی کوشش کرتا تھا۔ اچھا لگتا تھا۔ برا نہیں لگتا تھا۔ کبھی کبھار فلمی ڈائیلاگ بھی مار دیتا تھا۔ وہ مسکرائی۔ "اوکے باس!"

تین چیزیں

تین چیزیں خلوص دل سے کرنی چاہئیں۔
رحم، کرم، دعا
تین چیزیں کسی کا انتظار نہیں کرتیں۔
موت، وقت، گاہک
تین چیزیں بھائی کو بھائی کا دشمن بناتی ہیں۔
زن، زر، زمین
تین چیزیں پردہ چاہتی ہیں۔
کھانا، دولت، عورت
تین چیزیں یاد رکھنی ضروری ہیں۔
سچائی، فرائض، موت
تین چیزیں انسان کو ذلیل کرتی ہیں۔
چوری، چغلی، جھوٹ
تین شخص تین چیزوں سے پہچانے جاتے ہیں۔
صابر، مصیبت پر۔ بہادر، مقابلے پر۔ بھائی، ضرورت پر۔

کوثر جہاں...... راولپنڈی

شام میں اس کے بابا نے رسمی علیک سلیک کے بعد مقامی زبان میں اسے بتایا۔ اس گفتگو کا اردو میں رقیہ نے ترجمہ کیا۔ "یہ دونوں وادیاں یعنی سندر بن اور بندرہ آگے پیچھے واقع ہیں۔ تقریباً ایک جتنے رقبے پر محیط ہیں۔ اگلی وادی شاہ سائیں کے چھوٹے بھائی نورنگ سائیں کی ہے جو یہاں سے برسوں پہلے چلا گیا تھا۔ اب اس کا کوئی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے، زندہ بھی ہے یا نہیں...... نہ اس کی اولاد کا پتہ ہے۔ اس لیے عملی طور پر اس کا مالک بھی شاہ سائیں ہی ہے۔ ہم لوگ برسوں سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ خدا کسی جانب سے نورنگ سائیں کو اس دھرتی پر اتار دے مگر ابھی تک کسی کی دعا قبول نہیں ہوئی اور وہ نہیں آیا جس کے انتظار میں برسوں سے سیکڑوں آنکھیں راہ پر جمی ہوئی ہیں۔"

سنبل کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کا پاپا اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ان لوگوں کی دعائیں کبھی بھی مراد نہیں پا سکتی تھیں۔ اس نے ابھی تک سمیر کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے پوچھا بھی نہیں تھا۔

سنبل کو اپنے باپ کی خوب صورت جائیداد کے مکروہ استعمال پر دکھ ہوا۔ سوچ میں پڑ گئی کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں کئی دن بیت گئے۔ ایک شام اس نے اپنے تئیں فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان چلی جائے۔ اب ایسا بھی اندھیر مچا ہوا نہیں ہے کہ وہ پربت شاہ اور سردار خان کو اپنے پاپا کی زمین سے لاتعلق ہی نہ کر پائے۔ اسے خون کے رشتوں پر مان تھا۔ جبھی کہ جب وہ سندر بن میں قدم رکھے گی، اس کا حقیقی چچا اس کی راہوں میں پلکیں بچھائے، نہ بچھائے، اس کی راہ میں حائل نہیں ہوگا۔

اس نے آئندہ چند دنوں میں سمیر اور رقیہ سے اور بھی بہت سی معلومات حاصل کیں۔ اسے پتہ چلا کہ پربت شاہ کے تین بیٹے تھے۔ بڑا افروز شاہ تھا جو دن کا بیشتر حصہ سردار خان کے ساتھ گزارتا تھا۔ وہ بہت سخت دل واقع ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ملازموں کی ہڈی پسلی ایک کر دیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار سرحدی علاقے کا ٹور بھی کیا کرتا تھا۔ اس نے پانچ چھ جرائم پیشہ افراد کا ایک مختصر سا گروہ تشکیل دے رکھا تھا جو اس کی ہیبت میں اضافہ کرتا تھا۔ بندرہ والی حویلی میں جہاں سردار خان اکیلا رہتا تھا، وہ بکثرت آتا جاتا تھا۔ آئے روز شراب و شباب کی محفلوں کا لطف اٹھایا کرتا تھا۔ پربت شاہ کی امیدوں کا مرکز ایک وہی بیٹا تھا جو اس کے نقش قدم پر چل کر کامیابیاں سمیٹ رہا تھا۔

دوسرا بیٹا ظفر شاہ تھا۔ وہ انٹر تک پڑھا ہوا تھا۔ سبھی بہن بھائیوں میں سے زیادہ خوبرو تھا۔ نہ جانے کس طرح سردار خان کے دھندے کا شکار ہو گیا۔ پہلے چرس کے کش پھر پنی لگانے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اپنی رگوں میں ٹیکے کے ذریعے 'ٹوکن' اتارنے کا مرحلہ بھی طے کر لیا۔ پربت شاہ نے مختلف شہروں سے اس کا علاج کرایا۔ ہر بار مطمئن ہو تا کہ وہ آئندہ اس لعنت میں نہیں پڑے گا مگر دو چار ماہ بعد اسے پھر فضاؤں کی رکھوالی میں مگن دیکھتا تو پکڑ کر کسی اور اسپتال میں پہنچا دیتا۔ اس کی خوراک پر گھر بھر میں بہت توجہ دی جاتی مگر نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی نکلتا۔

سب سے چھوٹا جمال شاہ بہت منہ زور اور سرکش واقع ہوا تھا۔ بڑے بھائیوں سے بات بے بات مائل بہ پیکار رہتا تھا۔ شاید اس کے مزاج کی گرمی کی بدولت اسے لاہور بھیج دیا گیا جہاں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کا سندر بن کے معاملات سے بظاہر کوئی تعلق نہیں تھا مگر پربت شاہ کا بیٹا تھا۔ اگر افروز اور ظفر سے دو گام آگے نہ ہوتا تو کم از کم پیچھے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پربت شاہ کی بیوی حویلی تک محدود تھی۔ وہ پربت شاہ اور سندر بن کے معاملات میں قطعاً دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ یہی حال پربت شاہ کی دونوں بیٹیوں کا تھا۔ وہ بے دست و پا تھیں۔ پربت شاہ اور افروز شاہ کے رحم و کرم پر تھیں۔ انہیں برا سمجھتی تھیں یا ان کی حمایت کرتی تھیں، اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہو سکا تھا۔

سنبل نے سمیر اور رقیہ کے توسط سے جمال شاہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اس نے انٹرنیٹ کی دنیا کا سہارا لیا مگر وہ شاید اس دنیا کا باسی نہیں تھا، سو نہ ملا۔ پھر دل کو سمجھایا۔ ”وہ پربت شاہ کا بیٹا ہے۔ وہ کیوں اس کا ساتھ دے گا؟“

زندگی مختصر ہے، مختصر نہیں بھی ہے۔ ایک بار ملتی ہے۔ اس کا ایک بار ملنا بھی انعام ہے۔ خود بخود گزرتی جاتی ہے۔ اسے نہ تو بڑھاوا دیا جا سکتا ہے اور نہ مختصر کیا

جا سکتا ہے۔ بس...... اسے رائیگاں کیا جا سکتا ہے یا امر...... سنبل نے زندگی کو رائیگاں کرنے کے بجائے امر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ گہری سوچوں کے تانے بانے یہاں آ کر ٹوٹے کہ اُسے اپنے چچا اور عم زادوں کو راہِ راست پر لانے کی ایک کوشش تو کرنی چاہیے۔ ایک طرح سے اپنے فیصلے سے مطمئن ہو کر اس نے پاکستان جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

شاید پولیس کی کامیاب نوکری نے بھی اسے کسی حد تک دلیری دی ہو...... یا معاملے کی سنگینی کا اسے پوری طرح احساس ہی نہ ہوا ہو...... بہر حال! جو بھی تھا، جیسے بھی تھا، وہ ایک شام اسلام آباد ائر پورٹ پر کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ارد گرد چلتے پھرتے انسانوں کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

وہ زندگی میں پہلی بار پاکستان آئی تھی مگر نجانے کیا احساس تھا کہ اسے اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ شاید اس اپنائیت کی وجہ یہ تھی کہ سمیر نے اسے سندر بن کے علاوہ اسلام آباد اور راولپنڈی کی ان گنت تصاویر ٹیگ کی تھیں۔ اس نے بہت غور سے انہیں دیکھ رکھا تھا۔ اس نے سنڈر لینڈ سے نکلتے ہوئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کسی طور بھی سمیرا اور رقیہ سے رابطہ نہیں کرے گی۔ وہ اس کی حیثیت سے لاتعلق تھے، لاتعلق ہی رہتے تو اچھا تھا۔ آنے والے وقت نے یہ ثابت کیا کہ اس کا یہ فیصلہ کسی حد تک غلط بھی تھا۔

وہ طویل سفر سے تھکی ہوئی تھی مگر سندر بن دیکھنے کے لیے بہت بے تاب تھی۔ تبھی ائر پورٹ سے نکلتے ہی اس نے ییلو کیب ٹیکسی کے ذریعے سندر بن کا قصد کیا۔ گھنے جنگل میں چھپے ہوئے گاؤں سندر بن کا استقبالی موڑ مڑتے ہی ملبے کا وسیع و عریض ڈھیر دکھائی دیا۔ سمجھ میں آیا کہ یہاں سندر بن کی آبادی واقع تھی جسے بلڈوز کر دیا گیا تھا۔ ایک پہلو میں بلند ڈھلانی چھتوں والی بڑی سی حویلی سر اٹھائے کھڑی تھی۔ سنبل کا دل دُکھا۔ سمیر نے اسے گاؤں کے کئی فوٹو گراف دکھائے تھے۔ رنگ برنگی جستی چھتوں والا قصبہ کتنا دل کش تھا۔ اب ملبے سے بھرا نشیب دکھائی دے رہا تھا۔ چونکہ اس کا پربت شاہ یا سندر بن کے کسی شخص سے رابطہ نہیں تھا، اس لیے وہ بھرپور سرپرائز بن کر اپنی حویلی کے پورچ میں اتری۔ ڈرائیور کے سامان نکالنے سے پیشتر ہی اس کے گرد نوکروں کا جمگھٹا لگ گیا۔ وہ شکل اور حلیے سے یورپین سیاح دکھائی دیتی تھی۔ لباس بھی بے حد قیمتی تھا۔ ایک ملازم تھوڑی بہت انگریزی جانتا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے اور کس سے ملنے آئی ہے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”نو...... آئی جسٹ کم بیک ٹو مائی ہوم......“

وہ بھونچکا رہ گیا مگر اس کی شخصیت کے دبدبے کی بدولت خاموش رہا۔ اس نے ٹف ٹائل کے بنے طویل و عریض فرش پر پڑے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ ”سامان کو اندر پہنچا دو۔ ہری اپ!“

اس نے اُردو میں کہا تھا۔ اب سبھی نوکروں کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں۔ جسے یورپین سمجھا تھا، وہ اردو بولنے والی نکلی تھی مگر پاکستانی لگتی نہیں تھی۔ ایک ہکلایا۔ ”آپ کو اُردو آتی ہے کیا؟“

وہ بے پروائی سے بولی۔ ”آتی ہے تو بول رہی ہوں۔ میں یہاں رہوں گی۔ تم جی بھر کر مجھے دیکھ لینا۔ اب یہاں سے جاؤ اور اپنا اپنا کام کرو۔“

چونکہ وہ لڑکی تھی، سامان سمیت آئی تھی، اس لیے اسے بے باکانہ انداز میں حویلی کے اندرونی حصے میں جانے سے کوئی روک نہیں پایا۔ وہ ایک شانِ استغنا سے چلتی ہوئی زنان خانے میں داخل ہوئی۔ اس کی چچی کو اس کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ بھی

حیران تھی۔ اپنی بیٹیوں کے ہمراہ داخلی برآمدے میں استقبال کی غرض سے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھا تو آنکھوں میں حیرت آمیز اجنبیت بھر گئی۔ آگے بڑھی۔ سنبل کو گلے لگا کر، روایتی انداز میں چوم کر بولی۔ "تم کون ہو بیٹی؟"

وہ مسکرائی، پھر گلے میں جھول گئی، بولی۔ "آنٹی...... آئی ایم سنبل...... سوری...... میں سنبل ہوں۔"

"سنبل......کون سنبل......میرا خیال ہے کہ تم غلط جگہ پر آ گئی ہو۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور بھی......"

"نہیں آنٹی...... ٹیکسی ڈرائیور کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں درست جگہ پر آئی ہوں۔" اس نے کہا، پھر اپنی دونوں بہنوں کی طرف دیکھا۔ وہ برآمدے کے ستون سے لگ کر چپ چاپ کھڑی تھیں۔ حیرت سے معمور آنکھیں لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف بڑھی۔ زبردستی گال چوم کر بولی۔ "حیران ہیں ناں آپ لوگ...... میں سرپرائزڈ گفٹ ہوں...... یس؟" پھر ذرا توقف کے بعد، ان کا تجسس مہمیز کرنے کے بعد بولی۔ "آنٹی...... میں سنبل ہوں، نورنگ شاہ کی بیٹی......انگلینڈ سے آئی ہوں۔"

اس کا جملہ گویا بم کی طرح برآمدے میں پھٹ گیا۔ آنٹی کا منہ فرطِ مسرت سے کھل گیا۔ اس کی طرف بڑھنے لگی تو کسی خیال کے تحت رک گئی۔ یکبارگی دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر برآمدے کے فرش پر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں دنیا جہان کی دہشت بھر گئی، کراہنے کے سے انداز میں بولی۔ "نہیں...... بٹی...... خدا کے لیے یہیں سے ہی پلٹ جاؤ۔ اسی وقت یہ علاقہ چھوڑ دو...... پربت شاہ مری گیا ہوا ہے۔ افروز شاہ بندرہ میں ہے۔ ان کے آنے سے پہلے چلی جاؤ۔ میں کہتی ہوں، نہیں...... حکم دیتی ہوں کہ ان کے آنے سے پہلے پہلے اس ملک سے نکل جاؤ۔ وہ تمہارا خون کر دیں گے۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ بولنے سے پیشتر ہی دونوں بہنیں دیوانہ وار چمٹ گئیں۔ خون کی کشش نے باؤلا کر دیا تھا۔ وہ اونچی آواز میں رو رہی تھیں اور اسے پاگلوں کی طرح چوم رہی تھیں۔ اسے بھی رونا آ گیا۔ بہ مشکل انہیں خود سے علیحدہ کر کے فرش پر ہتھیلیاں ٹکائے، آنکھیں پھاڑے بیٹھی چچی کے گلے میں بانہیں حائل کر کے بولی۔

"آنٹی! فکر نہ کرو۔ وہ میرا خون نہیں کریں گے۔ میں نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا اور نہ ہی میں کسی کا نقصان کرنے آئی ہوں۔ میں تو آپ لوگوں کو زندگی میں ایک بار دیکھنے کی خواہش کے تحت آئی ہوں۔ ڈیڑھ ماہ بعد واپس چلی جاؤں گی۔ پھر وہ میرا خون کیوں کریں گے۔"

آنٹی نے پوری سختی کے ساتھ دائیں بائیں سر ہلایا، ہونٹ کاٹ کر بولی۔ "تم پربت شاہ کو نہیں جانتی ہو۔ تم افروز شاہ سے بھی واقف نہیں ہو۔ بس! ان کے آنے سے قبل یہاں سے جان بچا کر بھاگ جاؤ۔"

وہ بولی۔ "آنٹی! کہا ناں، فکر مت کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا۔"

بڑی کزن کا نام ماہتاب تھا۔ پیار سے تابو کہا جاتا تھا۔ وہ ماں کے پہلو میں آ بیٹھی۔ "بی بی! آخر اس بے چاری کو بھائی اور بابا کیوں ماریں گے۔ یہ اتنی پیاری تو ہے......"

چھوٹی بیٹی کا نام نیلم بانو تھا۔ وہ پشت پر آ گئی۔ دونوں کندھے تھام کر بولی۔ "بی بی! تابو ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے، ہم نے اپنی بہن کو دیکھ تو لیا۔ اٹھو آپی...... میرے کمرے میں چلو۔ میں تمہارے لیے چائے پانی کا بندوبست کرتی ہوں۔"

دونوں بہنیں اسے اپنی بانہوں میں لیے اپنے کشادہ کمرے میں لے گئیں جبکہ ماں وہیں مٹی کے ڈھیر کی صورت بیٹھی رہی۔ اس کی سانس حلق میں کہیں اٹک رہی تھی اور آنکھوں کے سامنے ہر شئے لحظہ بہ لحظہ سرخ ہوتی چلی جارہی تھی۔ ایسے میں افروز شاہ تیز تیز قدموں چلتا ہوا زنان خانے میں داخل ہوا۔ ماں کو فرش پر بیٹھے دیکھ کر جھٹ سے قریب آ گیا، پریشانی سے بولا۔ ”کیا ہوا بی بی!“

وہ کراہی۔ ”ہوا کچھ نہیں مگر بہت کچھ ہونے والا ہے۔“

ماں پر سے نظریں ہٹا کر اس نے اردگرد دیکھا۔ ”نوروز کہہ رہا تھا کہ کوئی انگریز لڑکی ادھر آئی ہے۔ ادھر تو نظر نہیں آرہی۔ کہاں ہے؟“

وہ کئی ثانیے تک بیٹے کے چہرے کو یک ٹک دیکھتی رہی۔ وہ گھبرا گیا۔ کندھے جھنجوڑ کر بولا۔ ”بی بی! تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟“ گھبرا کر اردگرد دیکھا۔ زور سے پکارا۔ ”گل زریں...... تابو...... بانو...... تم سب لوگ کدھر مر گئے ہو؟“

گل زریں اس کی بیوی کا نام تھا۔ اس کی دہاڑتی آواز سن کر کچن سے بھاگتی ہوئی نکلی۔ قریب آ کر ادب سے کھڑی ہو گئی۔ وہ بولا۔ ”گھر میں کون آیا ہے؟“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”یہاں تو کوئی نہیں آیا...... یہ بی بی ایسے کیوں بیٹھی ہے؟“

وہ افروز شاہ کو نظر انداز کر کے بی بی کے پاس بیٹھ گئی۔ بی بی نے تھوک نگلا۔ رحم طلب نظروں سے افروز کو دیکھا بولی۔ ”افروز! میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہیں میں نے دودھ پلایا ہے۔ آج اس دودھ کی بتیس دھاروں کی قیمت مانگتی ہوں۔ کیا دو گے؟“

اس کا چہرہ بھک سے اڑ گیا۔ بی بی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ بولا۔ ”بی بی! میں پاگل ہونے لگا ہوں۔ یہ پہیلیاں مت بجھواؤ، صاف صاف کہو، کیا بات ہے۔“

بی بی کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ بیٹے کی طاقتور بانہوں کو روکنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ مامتا کی جذباتیت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس لیے جو تھا، اسے داؤ پر لگا دیا۔ اپنی شال اتار کر بیٹے کے قدموں میں پھینک دی، بولی۔ ”اس کی لاج رکھنا سید زادے...... میری سنبل کو کچھ مت کہنا۔ وہ پردیسن ہے۔ کچھ دن رہ کر واپس چلی جائے گی۔ وہ تم سے، تمہارے بابا اور بھائیوں سے، بہنوں سے صرف ملنے کے لیے آئی ہے۔“

افروز شاہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ کبھی بی بی کا چہرہ دیکھتا، کبھی پیروں میں پڑی سیاہ شال کی طرف نگاہ جاتی...... بی بی کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ بولا۔ ”یہ سنبل کون ہے بی بی؟“

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ بیٹے کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ چہرہ اشکوں سے تر تھا۔ لہجے میں دنیا بھر کی لجاجت بھری ہوئی تھی بولی۔ ”سنبل تمہارے چچا نورنگ شاہ کی بیٹی ہے۔ ہمیں ایک نظر دیکھنے کے لیے ولایت سے آئی ہے۔ خون کی کشش باؤلی کو سندر بن میں کھینچ لائی ہے۔“

”اوہ...... تو یہ جو انگریزن آئی ہے، وہ نورنگ شاہ کی بیٹی ہے؟“ افروز ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں میں لحہ بھر کو خشونت رقصاں ہوئی پھر معدوم ہو گئی۔ لبوں پر بے عنوان مسکراہٹ ابھری اور بولا۔ ”اچھا! تو یوں کہو کہ چاچے نے ولایت میں شادی بھی کر رکھی ہے۔ کہاں ہے وہ؟ میں بھی تو اپنے چاچے کی بیٹی کو دیکھوں۔ کیسی ہے؟ پر بی بی! اس میں رونے کی کیا بات ہے؟“

بی بی اسے تشکیک آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گود میں کھلایا تھا۔ رگ رگ سے شناسا تھی بولی۔ ”افروز! وہ اندر بہنوں کے کمرے

میں ہے۔ پر دیکھ لینا...... تم نے یا تمہارے بابا نے اسے مارا تو میرا ابھی مرا ہوا منہ دیکھو گے۔"

افروز کا چہرہ ایک دم سپاٹ ہو گیا۔ حیرت سے گنگ کھڑی گل زریں کو اچٹتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور اپنی شال کندھے پر درست کرتا ہوا تابو اور بانو کے کمرے کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ بی بی کے بدن میں جیسے بجلی بھر گئی تھی، تیزی سے اٹھی اور بھاگنے کے سے انداز میں اس کے پیچھے لپکی۔ دل میں خوف گھر کر چکا تھا۔ وہ اس پر توجہ دیے بغیر گلا کھنکار کر کمرے میں داخل ہو گیا جبکہ اس کی پشت پر بی بی دونوں چوکھٹیں تھام کر دروازے میں پتھر ہو گئی۔

وہ کمرے کے عین وسط میں جا کر رک گیا۔ بیڈ پر بیٹھی تینوں لڑکیاں کھڑی ہو گئیں۔ بی بی نے دیکھا کہ دونوں بہنوں نے غیر محسوس انداز میں سنبل کو اپنے عقب میں کر لیا تھا۔ افروز چند لمحوں تک سنبل کو بغور دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ "اچھا! تو یہ انگریزنی میرے چاچے کی بیٹی ہے...... ادھر آؤ لڑکی! مجھ سے پیار تو وصول کر لو۔"

سنبل نے بیڈ پر سے چھلانگ لگائی۔ قریب آئی۔ عین مقابل میں سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔ دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ ایسے میں ٹھٹک کر سوچنے لگی کہ پیار کیسے لیا جاتا ہے؟ فوراً سمجھ میں آ گیا کہ اسے پیار لینے کا روایتی طریقہ نہیں آتا تھا۔

افروز اس کی حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ "یہ کیا؟ ایسے پیار لیا جاتا ہے؟"

تابو سمجھ گئی۔ ساری عمر انگلینڈ میں رہنے والی کو سندر بن کی روایات سے کیا کام تھا...... دونوں کے بیچ حائل ہوئی۔ سنبل کی طرف منہ کر کے بولی۔ "غور سے دیکھو...... بڑوں سے ایسے پیار لیا جاتا ہے۔"

تابو نے اسے دکھانے کے لیے اپنی شال درست کی، افروز کے پہلو میں آئی اور مودبانہ انداز میں اپنا سر جھکا کر بولی۔ "السلام علیکم لالہ جی!"

سنبل نے تابو کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا بولی۔ "مگر میرے پاس تو شال ہی نہیں ہے۔"

بانو کی جلترنگ ہنسی عقب میں گونجی۔ ذرا تھم کر بولی۔ "تو کیا ہوا آپی؟ تمہارا سر تو ہے ناں جسے لالہ جی کے سامنے جھکایا جا سکتا ہے۔"

اس نے جھینپ کر سر جھکا دیا۔ افروز نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھے۔ مخملیں بالوں کا لمس عجیب لگا۔ بولا۔ "تم بہت پیاری ہو...... سنبل...... تمہارا نام بھی بہت پیارا ہے۔ یقیناً چاچے نے رکھا ہو گا۔"

اس نے سر اٹھایا۔ اپنے چچا زاد کو بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پر بیک وقت پیار اور درشتی ثبت تھی بولی۔ "تم بھی بہت کیوٹ ہو۔ آئی لو یو......"

"تم اکیلی آئی ہو...... چاچا...... اور ماں...... یا کوئی بہن بھائی...... کسی کو تو ساتھ لاتیں ناں۔" افروز نے اس پر گہری نگاہیں مرکوز رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم شاید نہیں جانتے...... پاپا اور ماما اس دنیا میں نہیں رہے۔ میرے بہن بھائی آپ لوگ ہی ہو، اور کوئی نہیں۔"

"اناللہ......" کبھی کے حلق سے یہی کلمہ برآمد ہوا۔

پربت شاہ کو حویلی پہنچنے سے پہلے ہی یہ خبر مل چکی تھی۔ اس کا رویہ بھی افروز شاہ سے ملتا جلتا تھا۔ گھر کے باہر افروز شاہ نے اسے روک کر کہا۔ "بابا! دل کی بات زبان پر آ جائے تو بنا بنایا کھیل خراب ہو جاتا ہے۔"

"اچھا! تو اب تم مجھے سمجھاؤ گے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا...... واہ افروز شاہ واہ......" پربت شاہ نے استہزائیہ انداز میں ہاتھ نچائے اور لمبے لمبے ڈگ

بھرتا ہوا زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔

❁❁❁

وہ بولتے بولتے تھک کر خاموش ہو چکی تھی۔ احمد نے اب تک اس کے بیان میں دخل نہیں دیا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر آہستگی سے اٹھا۔ لائٹر ٹارچ آف کر کے جیب میں ڈالی اور دہانے کی طرف بڑھا۔ غار کے اندر اندھیرا بدستور مسلط تھا مگر اس کا طنطنہ پہلا سا نہیں رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ سیاہ پتھر اور درخت کے تنے کے درمیان بیٹھا ہوا وادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ اندھیرا چھٹ چکا تھا مگر پہاڑیوں کے دامن میں چکراتے ہوئے گہرے سیاہ بادلوں کی وجہ سے دھوپ نہیں نکلی تھی۔ کمزور اندھیرا طاری تھا اور سرد ہواؤں کا راج بدستور قائم تھا۔

اس نے گردن نکال کر نیچے ندی میں جھانکا۔ پانی اچھلتا کودتا انجان منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سندر بن کی طرف اندھیرا دیکھ کر بڑبڑایا۔ "ادھر ابھی تک بارش ہو رہی ہے۔"

چونکہ کھوہ کشادہ نہیں تھی اس لیے اس نے سنبل کی وجہ سے گریز کرتے ہوئے کافی دیر سے سگریٹ نہیں پی تھی۔ کھلی فضا میں پہنچتے ہی طلب جاگ اٹھی۔ اس نے پتھر سے ٹیک لگائی، سگریٹ نکال کر سلگائی اور گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

وہ سردار خان کو نہیں جانتا تھا مگر پربت شاہ اور افروز شاہ کی سینہ زوریوں سے آگاہ تھا۔ اس نے گزشتہ رات کی ہولناکی اور سنبل کی بیان کردہ ادھوری کہانی سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ پربت شاہ کے لیے سنبل بہت قیمتی اور اہم ہے۔ سنبل کے بہ عافیت یہاں سے جانے پر اسے بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ سندر بن کی وادی اس کے زیر تصرف تو ہے مگر اس کی کامل ملکیت نہیں ہے۔ اس کے سر پر نورنگ شاہ کی لٹکتی ہوئی تلوار عیاں ہوئی تھی۔ وہ اس تلوار کو توڑ کر ہمیشہ کے لیے اس خطرے کا گلا گھونٹ دینا چاہتا ہو گا۔ پانچ سال پہلے والے پربت شاہ کے پاس آٹھ دس نوکر تھے۔ جن میں سے نصف کے قریب اسلحہ بردار اور خونخوار مجرم تھے جنہیں اس نے پناہ دے رکھی تھی۔ آج اس کے پاس موجود نفری کی پوزیشن کیا تھی، اس کا احمد کو اندازہ نہیں تھا۔ دوسرا کردار سردار خان تھا۔ وہ کون تھا، کیسا تھا اور اس کے بازوؤں میں کتنا دم تھا...... اس بارے میں محض قیاس آرائی ہی کی جا سکتی تھی۔

دور دور تک کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا۔ اس طرف کسی کے آنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ سندر بن جانے والی دونوں پختہ سڑکیں خاصے فاصلے پر واقع تھیں۔ اس نے جنوب کی جانب نگاہ دوڑائی۔ کوئی نصف فرلانگ کے فاصلے پر سندر بن کا سرحدی درہ واقع تھا۔ جہاں دونوں پہاڑیوں کے بیچ سے ندی گزر رہی تھی، وہاں سندر بن کی حد ختم ہو جاتی تھی۔ ایک کلومیٹر کی مسافت طے کرنے کے بعد یہ ندی اس سڑک کے نیچے سے گزرتی تھی جو گھوم پھر کر سندر بن آئی تھی۔ اسی سڑک پر احمد کی فور ڈھیل جیپ کھڑی تھی۔ بندرہ یا کالکوٹ کی طرف جانے کے لیے سندر بن کے پاس سے گزرنا پڑتا تھا جو احمد اور سنبل کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یعنی سندر بن سے نکلنے کا فی الوقت یہی ایک راستہ تھا۔ احمد کو یقین کی حد تک شبہ تھا کہ پربت شاہ اور سردار خان کے کارندوں نے اس سڑک کو پوری طرح کور کر رکھا ہو گا۔ وہ اپنی یادداشت پر زور دے رہا تھا، کوئی اور راستہ کھوج رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ جس پہاڑی کی کھوہ کے دہانے پر بیٹھا تھا، اس کے عین پشت پر ایک ناپختہ راستہ نکلتا تھا جو بالترتیب دو گیسٹ ہاؤسز، ایک تبلیغی مرکز اور کیڈٹ اسکول کو چھوتا ہوا ایکسپریس روڈ کی طرف نکل جاتا تھا۔ اس

شاہراہ سے اسے اسلام آباد یا مظفر آباد کے لیے کوئی نہ کوئی سواری میسر آسکتی تھی مگر اس کی دانست میں اس پہاڑی کو عبور کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ کھوہ والی سمت میں پہاڑی کی تمام تر ڈھلان عمودی تھی۔

اسے بھوک لگ رہی تھی۔ جانتا تھا کہ سنبل کی حالت زیادہ خراب تھی۔ وہ بھوک اور نقاہت کا نسبتاً بڑا عذاب بھگت رہی تھی۔ کسی بھی لمحے گر سکتی تھی۔ ایسے میں احمد کی مشکلات میں اضافہ ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس دوران سگریٹ ختم ہوگئی تھی۔ اس نے دوسری سلگالی۔ خالی پیٹ سگریٹ کا ذائقہ بھی کڑوا لگا۔ سگریٹ کیس خالی ہونے والا تھا۔ یہ فکر اضافی تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی۔ زندگی کی طرف قدرے ناگواری سے دیکھا اور ہاتھوں کا بھونپو بنا کر بلند آواز میں بولا۔ ''سنبل! سنبل! کم آؤٹ......''

اس کی آواز سنبل تک پہنچ گئی۔ چند لمحوں بعد وہ بکری کی طرح چوپایا چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ جونہی سیدھی ہوئی، احمد کی نگاہ اس کی گھسی ہوئی شرٹ پر پڑی۔ جلدی سے نظریں جھکا کر بولا۔ ''میں آنکھیں بند کرتا ہوں۔ تم شرٹ اتار کر اس کا اگلا حصہ پیچھے کر دو۔ پچھلا حصہ آگے آجائے گا۔''

اس نے پتے کی بات کی تھی۔ سنبل بڑبڑائی۔ ''اتنی سامنے کی بات میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی؟''

اس نے شرٹ اُتاری۔ چور نظروں سے احمد کو دیکھا۔ وہ آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ شرٹ کو جلد از جلد پہننے کی کوشش میں تاخیر ہونے لگی۔ سٹپٹائی۔ ایسے میں دل دھڑکنے لگا۔ سوچنے لگی، یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میں شرٹ اتارتے اور پہنتے ہوئے بار بار احمد کی طرف کیوں دیکھ رہی ہوں جبکہ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ میں نے آج تک ہر معاملے کو عملی انداز میں دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ آج زندگی میں ایسے فضول سے خیالات کیوں داخل کر رہی ہوں؟''

اس نے شرٹ پہن لی۔ احمد نے درست کہا تھا۔ سینہ اور پیٹ چھپ گئے تھے۔ کمر ننگی ہو رہی تھی۔ خیر تھی بولی۔ ''چلیں......''

احمد نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے دیکھا۔ بظاہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر پہلے دیکھا ہوا منظر اس شرٹ کے میلے کپڑے پر ثبت تھا۔ اس نے جلدی سے رخ پھیرلیا۔ سگریٹ کا کش لے کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ چند قدم چل کر اسے پہلے کی طرح سنبل کی کمر میں بازو حائل کرنا پڑا۔ ناگاہ پتہ چلا کہ رات بھر موت کے ڈر سے خاموش رہنے والا سنبل کا بدن بولنے لگا تھا۔

ایسے میں اس کے چہرے پر نظر پڑی۔ وہ بھی اس ثانیے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کھوہ سے نکلتے ہوئے پانی پیا تھا۔ ہونٹوں تک چہرے کا حصہ گیلا اور صاف تھا۔ نصف بالائی حصہ میلا تھا مگر اس کی رنگت کی تاب کو چھپا نہیں رہا تھا۔ الٹا مہمیز کر رہا تھا۔ حسن توازن سے پیدا ہوتا ہے۔ توازن ترتیب کا دوسرا نام ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے اور شانوں پر بے ترتیبی سے پھیل رہے تھے مگر دیکھنے والے کے دل کو گدگدا گئے۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''سنبل! تم تو قتل کر دینے والا حسن رکھتی ہو؟''

وہ چونکی۔ ''یہ قتل کر دینے والا حسن کیا ہوتا ہے؟''

وہ مسکرایا۔ ''جسے دیکھنے والا دوسری سانس نہ لے سکے۔''

وہ جھینپ سی گئی، بولی۔ ''مگر تم تو لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہو۔''

وہ بولا۔ ''تم اسے اپنی یا میری بدبختی کہہ سکتی ہو کیونکہ مجھے اس وقت اپنی اور تمہاری جان کے لالے

پڑے ہوئے ہیں۔ سڑک کی طرف جانا ناگزیر ہے۔ سڑک پر تمہارے دشمنوں سے ہونے والا ٹکراؤ بھی تصور میں انگارے بھر رہا ہے۔"

سنبل کا دل دھک سے رہ گیا۔ چند لمحوں کے لیے سر پر لٹکتی ہوئی موت کے بھیانک خیال سے پلو چھوٹا تھا۔ احمد کی بات سنتے ہی دل پھر ہولناک اندیشوں سے بھر گیا۔ گھبرا کر بولی۔ "میں اس علاقے سے واقف نہیں ہوں۔ تم ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہو کہ ہمیں کیسے یہاں سے نکلنا ہے۔"

احمد نے اس کے چہرے پر تناؤ دیکھا۔ سنبھل گیا۔ اسے سنبھالنے کے لیے بولا۔ "تم بڑی خود غرض ہو۔"

وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ جواب نہ پا کر چپ رہی۔ اس نے اب تک ایک بار بھی احمد سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اپنے گھر چلا جائے۔ وہ محض سنبل کی وجہ سے خون کی ہولی میں شامل ہوا تھا۔ کچھ سوچ کر بولی۔ "میں سمجھ رہی ہوں جو تم کہنا چاہتے ہو اور کیوں مجھے خود غرض قرار دے رہے ہو..... مگر میں کیا کروں؟ اگر تمہیں گھر جانے کا کہوں اور تم چلے جاؤ تو میں ان پتھروں میں سر پھوڑ پھوڑ کر مر جاؤں گی۔ کبھی سنڈر لینڈ نہیں پہنچ پاؤں گی۔"

دونوں ایک پتھر کے ساتھ چپک کر کھڑے تھے۔ احمد کو اس کے چہرے پر تاسف اچھا نہ لگا۔ اس کا گال تھپتھپا کر بولا۔ "ڈونٹ بی وری..... میں تمہیں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ کہا تھا ناں کہ ائرپورٹ پر پہنچا کر ہی پلٹوں گا۔"

اس نے ممنونانہ نظروں سے اسے دیکھا، بولی۔ "تم بہت اچھے ہو احمد..... میں کبھی بھی تمہیں نہیں بھول پاؤں گی۔"

احمد کے لبوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ ناچی پھر معدوم ہو گئی۔ اسے نرمی سے دھکیلنے لگا۔ کھوہ تک آنا مشکل تھا۔ کھوہ سے ندی کی طرف اترنا اس سے بھی کہیں زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اترنے تک احمد بری طرح ہانپنے لگا۔ ندی کے کنارے پر ابھرے ہوئے پتھر پر بیٹھ گیا۔ یخ پانی پیا۔ سینے میں درد کی لہر اٹھی۔ ہاتھ سینے پر رکھا۔ مسلا۔ کچھ دیر تک بیٹھا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا پھر کھڑا ہو گیا۔ سنبل ندی پر جھکی ہوئی پائن کی ایک شاخ تھام کر کھڑی تھی بولی۔ "کیا ہمیں پانی کے رخ پر جانا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اونچے نیچے پتھروں پر بڑی احتیاط سے چلنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں ماحول پر چھائی ملگجی سی روشنی کم ہونے لگی۔ دونوں نے بے ساختہ اوپر دیکھا۔ بادلوں نے دونوں پہاڑیوں کا بالائی نصف حصہ چھپا دیا تھا۔ چند ہی منٹوں میں بادلوں نے انہیں چھونا شروع کر دیا۔ سردی کم ہو گئی۔ نمی زیادہ ہو گئی۔ احمد نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ بارش سے بچنے کے لیے محفوظ جگہ دکھائی نہ دی تو مایوسی سے بولا۔ "ہم گیلے ہو جائیں گے۔"

سنبل نے جلدی سے دو تین جگہوں کی نشاندہی کی۔ احمد نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے زیادہ وقت درکار تھا۔ بولا۔ "ہمارے پاس ایک کوٹ ہے۔ لگتا ہے کہ اس کی قربانی بھی دینا پڑے گی۔"

وہ اس کا مطلب نہیں سمجھی مگر خاموش رہی۔ ایسے میں پھوار گرنے لگی۔ پانی کے سرد قطرے اچھے لگے۔ جب ان قطروں کی بہتات ہونے لگی تو سنبل پر کپکپی طاری ہو گئی۔ احمد نے ایک طویل سانس لی۔ کوٹ سے متصل کیپ کھینچی اور سر پر اوڑھا دی۔ ایک بڑے مستوی پتھر پر رک کر کوٹ کے بٹن کھول دیے۔ جونہی بارش تیز ہوئی، اس نے کوٹ کے دونوں پلو کھولے اور سنبل کو کوٹ کے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

ایک قدم کا فاصلہ حائل تھا۔ ایک لمحے میں...... یا ایک صدی میں طے کیا جا سکتا تھا۔ اس نے احمد کی آنکھوں میں جھانکا اور قدم بڑھا دیا۔ احمد نے اسے کوٹ میں چھپا لیا اور اس کے گرد بانہیں حائل کر کے کوٹ کے بٹن بند کر دیے۔ کوٹ کے اندر کا موسم بے حد گرم تھا جس نے اسے آن واحد میں گرما دیا۔

پولیس کی نوکری نے اس کے اعصاب سخت کر رکھے تھے مگر اس تربیت کی تمام تر فولادیت اس آنچ پر اپنا آپ برقرار نہیں رکھ پا رہی تھی۔ بدن کے ساتھ ساتھ اعصاب بھی پگھل رہے تھے۔ احمد نے کہا۔ "اپنے پائنچے چڑھالو۔ ندی کا پانی اٹھ رہا ہے۔"

تیز بارش کے ساتھ ہوا کے تیز تھپیڑے برساتی پانی کو مسلسل اچھالا دے رہے تھے۔ جونہی سنبل نے اپنے پائنچے چڑھانا چاہے، احمد کے اور قریب ہو گئی۔ اس سے زیادہ قربت کیا ہوتی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ کوٹ نے انہیں بھیگنے سے بچا لیا تھا مگر دم بدم پانی جذب کر کے بھاری ہو رہا تھا۔ غضب ہوا کہ جس پتھر پر دونوں کھڑے تھے، اس پر ندی پانی اچھالنے لگی تھی۔ احمد بولا۔ "پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ میں نے جاگرز پہنے ہوئے ہیں۔ تم ننگے پیر ہو۔ اپنے دونوں پیر اوپر اٹھالو۔"

پتھر سرد تھا۔ پانی سرد تر تھا۔ بے چارگی سے بولی۔ "مگر کیسے؟"

احمد کا نچلا ہونٹ اوپری ہونٹ پر چڑھ گیا۔ بولا۔ "یہ تمہاری پرابلم ہے، تمہی کو حل کرنا ہو گی۔"

بچپن میں سنبل اپنے پاپا کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر، دونوں گھٹنے موڑ کر لٹک جایا کرتی تھی۔ پاپا اسے گھماتے تھے۔ اسے یہ عمل بہت اچھا لگتا تھا۔ یاد آ گیا۔ اس نے کوٹ کے اندر سے احمد کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ اپنا پورا وزن ڈالا۔ جب محسوس ہوا کہ وہ اس کا وزن اٹھا سکتا ہے تو اس نے دونوں گھٹنے موڑ لیے۔ پاپا کا لمس اور تھا۔ احمد کا لمس اور...... دل کی دھڑکن یکبارگی بڑھ گئی۔ زمین سرد تھی۔ فضا میں آگ لگی ہوئی تھی اور آسمان اندھا تھا...... زندگی عجیب تفسیریں بیان کرتی ہے۔ کوئی سمجھ میں آتی ہے، کوئی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ جس کی سمجھ نہ آئے، اسے جنوں کہا جاتا ہے۔ اس کیفیت کو بھی دل والوں نے جنوں کا نام دے رکھا ہے۔

احمد پر ایک ہی وقت میں اس کا بوجھ گراں بھی تھا اور دل افروز بھی، بولا۔ "تمہاری دھڑکن بہت تیز ہو رہی ہے۔ تم ٹھیک تو ہو؟"

وہ کچھ نہ بولی۔ ماما کہا کرتی تھی کہ جھوٹ بولنے سے خاموش رہنا بہتر ہوتا ہے اور خاموشی سے آنکھیں بند کر لینا بہتر ہوتا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ احمد نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ قدرے بھاری آواز میں بولی۔ "میں ٹھیک نہیں ہوں مگر مجھے تمہاری ہارٹ بیٹ کیوں محسوس نہیں ہو رہی؟"

بارش کا شور بہت بڑھ گیا تھا۔ وقت زیادہ گزر گیا۔ احمد کے پاؤں نہیں تھکے، سنبل کے ہاتھ تھک گئے بولی۔ "احمد! میں تھک گئی ہوں۔"

"اوہ...... میرے دونوں پاؤں گھٹنوں تک بھیگے ہوئے ہیں۔ جاگرز پانی سے بھر گئے ہیں۔ اگر تم نے پاؤں سیدھے کیے تو ٹھٹھر جاؤ گی۔ یقیناً تم اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو پاؤ گی۔"

احمد کو احساس تھا کہ محض باتوں سے سنبل کے ہاتھوں کی توانائی بحال نہیں ہو گی۔ اس نے اپنی بانہیں نیچی کیں۔ گھٹنوں سے کچھ اوپر بانہوں کا شکنجہ بنایا اور سانس روک کر سنبل کو اوپر اٹھا لیا۔ وہ کوئی چھ انچ اوپر اٹھی۔ اس کا سر کوٹ سے باہر نکل آیا۔ کچھ دیر بعد احمد نے اسے بتا کر ہاتھ کھول دیے۔ تھک گیا تھا۔ زیادہ

دیر ہاتھوں پر وزن نہیں لے سکتا تھا۔ ایسے ہی وقت جب کوٹ کے اندر اور باہر موسم کی دونوں انتہائیں عروج پر تھیں، بارش رک گئی۔ بادل بدستور اپنی جگہوں پر قابض رہے۔ چند منٹوں کے بعد ندی کا پانی پتھر سے اتر گیا تو احمد نے کوٹ کے بٹن کھول دیے۔ وہ اپنے پیروں پر لحظہ بھر ٹکی اور پھر نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں ڈال دیا اور احمد کے کئی بار مخاطب کرنے پر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

احمد نے کوٹ اتارا۔ اس کی جیبوں سے سامان نکال کر قمیص کی جیبوں میں ٹھونسا اور اسے ندی کے پانی میں اچھال دیا۔ چونکہ وہ بہت بھاری ہو گیا تھا، اس لیے اسے پہن کر چلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ کوٹ کے گرنے کی آواز سن کر بھی سنبل نے سر نہیں اٹھایا تو احمد کو تشویش لاحق ہوئی۔ اس کے سامنے یا پہلو میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ گھوم کر عقب میں آیا، پیروں کے بل پتھر پر بیٹھا اور سنبل کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”نہیں سنبل! ابھی تھکنا نہیں...... ابھی بہت لمبا سفر طے کرنا باقی ہے۔“

اس نے سر نہیں اٹھایا، اس کے ایک ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، آہستگی سے بولی۔ ”میں ٹھیک ہوں۔ مجھے چند منٹ دے دو۔ اونلی فیو منٹس......“

تھکی تھکی روشنی میں خاصی دور تک دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ بری طرح تھک گیا تھا۔ بھوک اور خنکی سے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ سر درد کی ایک وجہ سر اور پیشانی پر لگنے والی چوٹیں بھی تھیں۔ شکر تھا کہ پاؤں کی موچ کو آرام آ گیا تھا ورنہ چلنا دوبھر ہو جاتا۔ چند منٹ بعد اس نے سنبل کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور پتھروں پر احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ آدھے گھنٹے میں انہوں نے تین چار مرتبہ تھک کر قیام کیا۔ آخر درختوں کے بڑے جھنڈ کے عین درمیان میں واقع ایک بڑے پتھر کے پاس پہنچ کر احمد رک گیا۔ بتانے لگا۔ ”ہم سڑک پر پہنچ آئے ہیں۔ سڑک دکھائی نہیں دے رہی مگر میں جانتا ہوں کہ اس پتھر کے پار سڑک کا نشیبی موڑ ہے۔“

وہ اپنی سانسیں ہموار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ”آگے بار بار چڑھائی آتی ہے۔ ہماری حالت ایسی نہیں کہ ہم پیدل چلتے ہوئے مری روڈ تک پہنچ سکیں۔ اس لیے ہمیں یہاں انتظار کرنا ہوگا۔ جونہی کوئی گاڑی ادھر آئی، میں سڑک پر جا کر اس سے لفٹ مانگوں گا۔“

”کیا ادھر کوئی گاڑی آئے گی؟“ وہ نیم مایوسی سے بولی۔

”توقع رکھنا تو اچھا عمل ہے ناں؟“ اس کے انداز سے لگا کہ وہ بھی زیادہ پرامید نہیں تھا۔

دس پندرہ منٹ تک بیٹھے رہنے کے بعد اچانک سنبل چونک گئی۔ کان لگا کر بولی۔ ”آواز آ رہی ہے۔ شاید کوئی گاڑی ہو......“

احمد نے اپنی قوتِ سماعت آزمائی پھر ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا، بے اختیار اٹھتی ہوئی سنبل کے کندھے پر ہاتھ رکھا، بولا ”نہیں...... تم یہیں بیٹھی رہو۔ میں اکیلا جاؤں گا۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ احمد نے ڈانٹ دیا۔ وہ لاچارگی کی تصویر بن کر ڈھے گئی۔ کچھ نہیں ہوا تھا مگر دل خوف سے دھڑکنے لگا تھا۔ احمد درختوں کے بیچ پتھر کا چکر کاٹ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد سڑک کے کنارے ایستادہ فلک بوس درخت کے پیچھے کھڑا سڑک کے دونوں اطراف دیکھ رہا تھا۔

اس کے سامنے سڑک کا خطرناک موڑ تھا۔ یہاں سے گزرنے والی ہر گاڑی کی رفتار نہایت کم ہوتی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ واقع اس پہاڑی کی چوٹی پر اس کی جیپ کھڑی تھی۔ بائیں ہاتھ پر منزل واقع تھی۔ کانوں

پڑتی آواز قریب آ رہی تھی۔ کوئی گاڑی سندر بن کی جانب سے آ رہی تھی۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ چونکہ پربت شاہ کے علاوہ سندر بن کے کسی شخص کے پاس گاڑی نہیں تھی، اس لیے آنے والا پربت شاہ کا آدمی ہو سکتا تھا۔ احمد اس سے لفٹ نہیں لے سکتا تھا۔ احمد نے جیب سے پسٹل نکالا۔ اس کا بغور جائزہ لینے کے بعد بولٹ چڑھایا اور سیفٹی لاک ہٹا دیا۔

اچانک سامنے آنے والی جیپ نوے ماڈل کی اوپن لینڈ روور تھی۔ یہ یقینی طور پر پربت شاہ کی جیپ نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اسے کھلی چھت والی جیپیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ جیپ کے وسطی حصے میں موٹا آہنی پائپ نصب تھا جس پر تیز بیم لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ اس پائپ کو تھامے دو افراد کھڑے تھے۔ ایک نے سیاہ ملیشیا کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جبکہ دوسرے کا بالائی دھڑ نیلے رنگ کے کوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ احمد نے ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی گنیں پہلی نظر میں دیکھ لی تھیں۔ ڈرائیور نے لانگ کوٹ پہن رکھا تھا جبکہ پسنجر سیٹ خالی تھی۔ تیز پیلے رنگ کی چار بیم لائٹس موٹے پائپوں والے بمپر پر بھی نصب تھیں۔ لمحہ بھر کو احمد پر خوف غالب آیا پھر اچانک درخت کی اوٹ سے نکل کر بھاگتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر پسٹل والا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔

موڑ کی وجہ سے جیپ کی رفتار بہت کم تھی۔ ڈرائیور نے بریک لگا دیے۔ جیپ میں کھڑے ہوئے دونوں گن برداروں نے اسے فی الفور نشانے پر لے لیا۔ کوٹ والا مقامی لہجے میں بولا۔ ”اوئے! تم کون ہو اور ادھر کیا کر رہے ہو؟“

وہ رکی ہوئی جیپ کے عین سامنے کھڑا تھا۔ بولا۔ ”میں پنجاب سے آیا ہوں۔ سیر و تفریح کے لیے۔ ادھر میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ تم نے یقیناً اوپر والے موڑ پر اسے کھڑا دیکھا ہوگا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا، اچھل کر جیپ سے اترا اور اس سے چند قدموں کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ اس نے اپنی گن کا رخ احمد کے سینے کی طرف کیا ہوا تھا۔ بولا۔ ”اچھا! تو وہ تمہاری گاڑی ہے...... کیا تم اسے ایک طرف کھڑا نہیں کر سکتے تھے؟ سڑک کے بیچ کھڑی کر کے راستہ بند کر دیا تم نے۔ پہاڑی علاقے میں آنے سے پہلے ڈرائیوری بھی سیکھ لیتے ناں!“

اس کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔ اس کا ساتھی جو چاق چوبند حالت میں جیپ میں کھڑا تھا، دبنگ لہجے میں بولا۔ ”الو کے پٹھے! دھکا لگا کر ایک طرف کرنے میں ہمیں بھی پسینہ آ گیا۔ کیا اپنی ماں کو سائیڈ پر نہیں کر سکتے تھے؟“

وہ ٹھیٹھ پنجابی تھا۔ لہجہ خاصا جارحانہ تھا۔ احمد نے خون کا گھونٹ حلق میں اتار کر نرمی سے کہا۔ ”میں اکیلا تھا، بڑی گاڑی کو دھکیل نہیں سکا۔“

اس کے مقابل جیپ کے ہڈ کے پاس کھڑا ہوا گن بردار بڑی گہری نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ سر تا پا تنقیدی جائزہ لے کر بولا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو؟ اور تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“

احمد موقع کی تلاش میں تھا جو اسے نہیں مل رہا تھا۔ بولا۔ ”مجھے لفٹ چاہیے۔“

دونوں گن برداروں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ پنجابی بولا۔ ”تم نے ادھر کسی لڑکی کو دیکھا ہے؟“

اس نے حیرانی سے کہا۔ ”اس موسم میں لڑکی کا ادھر کیا کام؟......“

ڈرائیور نے تیز لہجے میں کہا۔ ”یار یہ سوال جواب چھوڑو، اسے پرے ہٹاؤ، ابھی ہمیں سارے علاقے کا گشت کرنا ہے اور اس گشتی کو تلاش کرنا ہے۔ اسے

نجانے پہاڑ کھا گئے ہیں یا آسمان......"

کوٹ والا گن بردار احمد کے ہاتھ والا قضیہ بھول گیا۔ الٹے پیروں پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "ہٹ جاؤ جوان......"

اس نے قدم بڑھایا، جلدی سے بولا۔ "مگر مجھے بھی ساتھ لے جاؤ نا...... ادھر قصبے میں اتار دینا......"

ڈرائیور نے اس کی بات گویا سنی ہی نہیں۔ گاڑی بڑھا دی۔ وہ چھلانگ لگا کر روڈ سائیڈ پر پہنچا۔ جونہی جیپ اس کے برابر پہنچی، اس نے ایک درخت کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ موڑ کاٹتی ہوئی جیپ میں اپنی جانب پشت کیے کھڑے گن برداروں کی طرف پسٹل کی نال کا رخ کیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔ ٹھائیں کی زوردار آواز کے ساتھ ہی کوٹ والا ایک جھٹکے سے پائپ سے الگ ہوا۔ کمر کے بل پہلے جیپ کی باڈی سے ٹکرایا پھر قلابازی کھا کر سڑک پر جا گرا۔ اس کی گن ایک لمحے کے لیے احمد کو نظر آئی پھر سڑک کے کنارے کی طرف لڑھک کر غائب ہوگئی۔

وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ احمد نے بھانپ لیا تھا کہ اس کے سر کے عقبی حصے میں گولی نے سوراخ کر دیا تھا۔ دوسرا گن بردار فوراً جیپ کے اندر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا سر جیپ کی باڈی سے کچھ اوپر تھا۔ احمد نے دوسرا نشانہ لیا۔ چاہا کہ فائر کرے مگر اس دوران جیپ موڑ مڑ گئی۔ وہ نشانے سے باہر ہوگیا۔ احمد نے جست بھری اور لمحہ بھر میں روڈ کے ڈھلوانی کنارے پر تڑپتے ہوئے گن بردار کو جا لیا۔ اس کا بدن آخری جھٹکے لے رہا تھا اور منہ سے ڈراؤنی خرخراہٹ برآمد ہو رہی تھی۔ اس کا ایک نظر جائزہ لینے کے بعد احمد نے کنارے پر اُگی جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔ ایسے ہی وقت میں ماحول فائرنگ کی خوفناک آوازوں سے گونج اٹھا۔ پنجابی بولنے والے گن بردار نے اس درخت کی طرف برسٹ مارا تھا جس کے نیچے احمد چند لمحے قبل موجود تھا۔ درختوں کے علاوہ کئی گولیاں اس پتھر پر بھی لگیں جس کے عقب میں سنبل دبکی بیٹھی تھی۔

احمد کے پیروں میں جیسے برق بلا کوند گئی تھی۔ اس نے جھاڑیوں میں پہنچتے ہی خود کو زمین سے چپکا دیا۔ پھر گردن موڑ کر نیچے سڑک کی جانب دیکھا۔ جیپ موڑ سے کوئی دس بیس گز آگے جا کر رک گئی تھی۔ خالی تھی۔

گن بردار اور ڈرائیور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ یا تو جیپ کی آڑ میں تھے یا کسی پتھر کے پیچھے مورچہ زن ہو گئے تھے۔ سڑک تقریباً پچاس گز کے بعد پھر موڑ لیتی تھی اور نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ یہ چھوٹی سی وادی جس کے عین وسط میں بہت بڑی کھائی تھی، کارزارِ جنگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ گن بردار نے برسٹ مارنے کے بعد کچھ دیر خاموشی اختیار کی پھر اکا دکا فائر کرنے لگا۔ وہ احمد کو دیکھ نہیں سکا تھا اور نہ ہی اس کی پوزیشن کا بہتر اندازہ کرنے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ تین چار فائر کرنے کے بعد اعصاب شکن سناٹا طاری ہوگیا۔

احمد کھائی کی طرف کھسکا۔ نیچے دیکھا۔ وہ کھائی کو عبور کر کے جیپ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جیپ تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ موڑ کاٹتی ہوئی سڑک کے ڈھلانی کنارے پر کھسکتا ہوا اس طرف جائے۔ یہ بہت خطرناک تھا کیونکہ اس کا مورچہ زن دشمنوں کی نظر میں آجانا یقینی تھا۔ چھپکلی کی مانند چپکے رہ کر کھسکنے کے دوران وہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے سڑک کے مخالف کنارے کی جانب سے گن بردار کو دیکھ لیا۔ وہ درختوں کے بیچ چلتا ہوا اپنے ساتھی کی لاش کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ درختوں کی اوٹ لے رہا تھا۔ رک رک کر چل رہا تھا۔ احمد کی سانس رکنے لگی۔ اگر وہ چند قدم اور آگے بڑھتا تو سنبل کو دیکھ لیتا۔

اس سے بعید نہیں تھا کہ وہ اسے گولی مار دیتا۔ مگر اس کے پاس اسے روکنے کا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اس کے پسٹل کی رینج سے باہر تھا۔ اگر اس کا راستہ روکنے کے لیے جھاڑی سے نکلتا تو اس کی شعلے اگلنے کو بے تاب گن کا نشانہ بن جاتا۔ ایسے میں اس کی مدھم سی بڑبڑاہٹ ابھری۔ ''نہیں یار! باہر نہیں نکلنا...... اللہ مالک ہے...... اب جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

اب وہ عین اس جگہ پر پہنچ چکا تھا جہاں سے احمد کے اندازے کے مطابق اسے سنبل کو دیکھ لینا چاہیے تھا۔ یہی ہوا، سنبل اسے نظر آ گئی۔ اس نے خون آشام انداز میں غلیظ گالی دی اور غرا کر کہا۔ ''اے! اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ۔ تم میرے نشانے پر ہو۔''

اس قماش کے لوگ ایسے ہی لب و لہجے سے دہشت پھیلا کر اپنا آدھا مقصد حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ ڈر گئی۔ ہاتھ سر پر رکھے سامنے آ گئی۔ احمد ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ بولا۔ ''شٹ یار! گیم ہی الٹی پڑ گئی۔''

وہ موڑ کی طرف کھسکا۔ ڈرائیور کی طرف سے خطرہ لاحق تھا۔ وہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کے پاس اسلحے کا ہونا یقینی تھا۔ دونوں کا ایک ساتھی قتل ہو چکا تھا۔ ان کے رگ و پے میں بھرے ہوئے غصے کو پیش نظر رکھ کر آگے بڑھنا تھا۔ تبھی بڑی احتیاط سے کھسک رہا تھا۔ ایسے ہی وقت اسے 'چٹاک' کی زوردار آواز سنائی دی۔ اس نے سر نکالا۔ سنبل کی طرف دیکھا۔ گن بردار نے زوردار چانٹا سنبل کے گال پر رسید کیا تھا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا اور اسے بری طرح دہشت میں مبتلا کر کے پوچھ رہا تھا کہ اس کا ساتھی کہاں گیا جس نے جیپ پر فائر کیا تھا۔ وہ 'نہیں نہیں' کا راگ الاپ رہی تھی۔ اس کا دوسرا تھپڑ کھا کر وہ پتھر کے پیچھے زمین پر گری۔ اسے پکڑنے کے لیے گن بردار نے قدم بڑھایا۔ جوش کی حالت میں درخت کی اوٹ سے نکلنے کی غلطی اسے بہت مہنگی پڑی۔ وہ احمد کے پسٹل سے نکلنے والی گولی کی زد میں آ گیا۔ گولی نے اس کا کندھا چھید دیا تھا۔ جب تک سنبھلتا، دوسری گولی پہلو کے رخ دل میں اتر گئی۔ اگلا قدم اختیار سے نکل گیا اور وہ پہلو کے بل ایک درخت سے ٹکرایا۔ گن کا رخ احمد کی طرف کیا مگر ٹرائیگر نہ دبا سکا۔ گن چھوٹ گئی۔ ہاتھ سینے پر جا پہنچا۔ 'ہاہ' کی لمبی صدا لگا کر درخت کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ سخت جان تھا۔ یکبارگی گن اٹھا کر کھڑا ہوا۔ احمد کی جانب رخ کیا۔ تین چار گولیاں جھونک دیں۔ احمد نے سر نیچے کر لیا۔ چوتھے فائر پر احمد کے عقب میں دردناک چیخ ابھری جو فائر کی خوفناک آواز کے جلو میں اپنی بازگشت چھوڑ گئی۔ پلٹ کر دیکھا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ اسی دوران موت سے لڑنے والا بازی ہار گیا۔ اس کے ہاتھ میں گن جھول گئی اور وہ کراہتا ہوا زمین پر گر گیا۔ اس کی جان بڑی ظالمانہ ادا سے نکل رہی تھی اور اسے بری طرح تڑپا رہی تھی۔ منٹ بھر کے بعد وہ ساکت ہو گیا۔ احمد کو اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا مگر عقب میں ابھرنے والی چیخ نے بے چین کر رکھا تھا۔ بجا طور پر کوئی جیپ کے قریب چھپا ہوا تھا جسے گولی لگی تھی۔ وہ زندہ تھا، بے ہوش یا مردہ...... اس بارے میں احمد فوری طور پر کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں سنبل دکھائی دی۔ وہ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی لاش کے قریب پہنچی۔ اس نے گن مردہ ہاتھ سے نکال لی۔ پھر الٹے قدموں کھسک کر پتھر کے عقب میں چلی گئی۔ احمد کو اس کی یہ حرکت بھلی لگی۔ پہلی مرتبہ اس نے بہادری کا مظاہرہ کیا تھا ورنہ اب تک وہ روایتی لڑکیوں کی طرح تعجب، خوف اور دہشت کا اظہار کرتی آئی تھی۔ اس کی کسی بھی ادا سے نہیں لگتا تھا کہ وہ سنڈر لینڈ پولیس کی اسسٹنٹ

سارجنٹ تھی۔

احمد سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ ایسے میں سنبل چھلانگ لگا کر اس درخت کے عقب میں پہنچی جس کی جڑ میں لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے ماہر نشانہ بازوں کی طرح پوزیشن لی اور گن نکال کر جیپ کی طرف فائر کیا۔ دو تین فائر کرنے کے بعد تھم گئی۔ سامنے آگئی۔ بلند آواز میں بولی۔ "احمد! تم کہاں ہو؟"

وہ چیخا۔ "میں ادھر ہوں۔"

"آجاؤ، تینوں مر چکے ہیں۔" سنبل سڑک کے بیچ آکر رک گئی۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ احمد کہنیوں کے بل سڑک پر چڑھا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ استعجاب آمیز لہجے میں مستفسر ہوا۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا کہ جیپ میں تین افراد تھے؟"

وہ بولی۔ "جب تم یہاں کھڑے تھے تو میں نے جھانک کر جیپ کو دیکھ لیا تھا۔ جب میں گن اٹھا کر پلٹی تو میں نے تیسرے حرامزادے کو جیپ کے نیچے لیٹے دیکھا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بھی مر چکا ہو۔ میں نے صرف تسلی کی خاطر اس پر فائر کیے تھے۔"

احمد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور جیپ کی طرف تیزی سے بڑھا۔ "میرا خیال ہے کہ فائرنگ کی آواز سندر بن تک پہنچی ہوگی۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

یہ کہتے ہی وہ دوڑنے لگا۔ سنبل کو گن کی وجہ سے دوڑنے میں دقت ہو رہی تھی مگر ایسے تیسے بھاگ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ جیپ کے پاس تھے۔ سنبل کا اندازہ درست تھا۔ جیپ کے نیچے لیٹا ہوا شخص زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ اس کے عین دل کے مقام پر سینے میں سوراخ ہو چکا تھا جس سے بھل بھل کرتا ہوا گاڑھا خون نکل کر سڑک پر جوہڑ بن رہا تھا۔

احمد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ سنبل اچھل کر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ چابی اگنیشن میں تھی۔ وہ چابی گھما کر بولا۔ "نہیں سنبل...... تم پیچھے چلی جاؤ۔ ابھی ہمارے سر سے خطرہ نہیں ٹلا۔ گن کو فائرنگ پوزیشن میں رکھنا۔"

وہ دونوں سیٹوں کے بیچ سے گزر کر عقب میں چلی گئی۔ جیپ کا انجن بیدار ہو گیا۔ احمد نے ایک جھٹکے سے ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ گاڑی کا عقبی ٹائر لاش پر چڑھ کر اترا جس کی وجہ سے جیپ کو بدترین جھٹکا لگا۔ وہ جلد از جلد سامنے والا موڑ عبور کر لینا چاہتا تھا تاکہ عقب سے آنے والے شکاریوں کی رینج سے فی الوقت نکل جائے۔ اگلے منٹ میں وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا اس خطرناک سڑک پر سرزد ہونے والی غلطی کا انجام بہت بھیانک تھا۔ کوئی تین چار کلو میٹر کا سفر طے کرنے کے بعد اس نے ایک "U" شکل کا موڑ کاٹتے ہی خطرناک انداز میں بائیں ہاتھ واقع درے میں جیپ ڈال دی۔ بادی النظر میں یہ راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ادھر سڑک نہیں تھی مگر آٹھ دس فٹ ناپختہ راستہ پہاڑی کے دامن کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا درختوں کے ایک جھنڈ میں گم ہو جاتا تھا۔ اچھلتی ہوئی جیپ کے خطرناک انداز میں جھٹکے لیتے اسٹیئرنگ وہیل پر اس کے ہاتھ اس مضبوطی سے جمے ہوئے تھے کہ پشت کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ سنبل کی لرزتی ہوئی آواز کانوں میں پڑی۔ "یہ ہم کدھر جا رہے ہیں احمد؟"

وہ بولا۔ "یہ راستہ مشکل ضرور ہے مگر ہمارے لیے خطرناک نہیں ہے۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر ہم ایکسپریس روڈ پر جا نکلیں گے۔"

وہ راستوں کا بھید نہیں جانتی تھی۔ مخل نہیں ہوئی۔ پوچھنے لگی۔ "کیا میں سیٹ پر آجاؤں؟ ادھر بہت جھٹکے

لگتے ہیں۔"

اس نے 'اوہ لیں' کہا تو وہ سیٹوں کے درمیان سے گزر کر فرنٹ سیٹ پر آ گئی۔ یہ راستہ نہ صرف زگ زیگ تھا بلکہ خاصا اونچا نیچا اور غیر ہموار تھا۔ جنگل بہت گھنا تھا۔ راستے کے دونوں طرف سر بفلک درخت ایستادہ تھے۔ بعض جگہوں پر راستہ اتنا تنگ ہو جاتا تھا کہ احمد کو جیپ روک کر گزرنا پڑتا تھا۔ وہ سیٹ پر برائے نام بیٹھے تھے جبکہ عملی طور پر اچھل کود رہے تھے۔ سنبل بے ساختہ جھلا کر چیخ پڑی۔ "ہائے احمد! میری پسلیاں چٹخنے کو آ گئی ہیں۔ روک دو اسے......"

اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ جیپ روکی نہ رفتار کم کی۔ انہیں ابھی تک اطراف میں کوئی گھر دکھائی دیا تھا نہ ہوٹل...... تاحدِ نگاہ درخت، پہاڑی ناہمواری اور پتھر...... کوئی چار کلو میٹر چلنے کے بعد اس بدن شکن راستے سے دائیں ہاتھ نسبتاً تنگ راستہ نکلتا دکھائی دیا۔ احمد نے جیپ روکی۔ چند لمحے سوچا، پھر اسٹیئرنگ گھما دیا۔ ایک نیم دائروی موڑ کاٹتے ہی ایک سرخ ڈھلانی چھت والی مختصر سی عمارت دکھائی دی۔ راستہ اس کے عین بیرونی برآمدے کے سامنے جا کر پتھریلی پورچ کی شکل اختیار کر گیا۔ جیپ روک کر احمد نیچے اترا۔ اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور بھاگتا ہوا برآمدے میں داخل ہو گیا۔ سنبل کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ عمارت خالی ہو۔ کوئی ذی نفس نظر آ رہا تھا نہ کوئی آواز ابھر رہی تھی۔

احمد مرکزی دروازے کے سامنے چند منٹ رک کر پلٹا۔ جیپ تک آیا۔ عقبی حصے میں سے ایک راڈ اٹھا کر دروازے پر گیا۔ چند لمحوں میں اس نے قفل توڑ دیا اور اندر گھس گیا۔ اس کی واپسی پانچ منٹ کے بعد ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں راڈ کے بجائے ایک سفید اور نیلے رنگ کا شاپنگ بیگ اور منرل واٹر کی دو بوتلیں دبی ہوئی تھیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے شاپنگ بیگ سیٹوں کے درمیانی خلا میں رکھ دیا جبکہ پانی کی بوتل سنبل کو تھما دی۔ وہ بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جیپ کو ریورس کیا۔ پھر اسٹیئرنگ گھما کر واپسی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسی راہ پر تھا جس سے اتر کر اس نے عمارت کا رخ کیا تھا۔ سنبل متجسس تھی مگر شاپنگ بیگ میں جھانک کر دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ پانی زیادہ ٹھنڈا تھا۔ دو چار گھونٹ بمشکل پیا گیا۔ احمد سے باتیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کی بے محابا سنجیدگی کے سبب خاموش بیٹھی سکرین کے پار دیکھنے لگی۔ کچا راستہ ایک ٹوٹی پھوٹی پختہ سڑک پر اختتام پذیر ہوا تو سنبل کی جان میں جان آئی۔ اچانک احمد نے بریک لگا دیے بولا۔ "یہ شاپنگ بیگ اٹھاؤ اور اس پتھر کے پیچھے چلی جاؤ۔ اس میں کپڑے ہیں۔ کوئی وقت ضائع کیے بغیر پہن لو۔ اس میں جوتے بھی ہیں۔ ہری اپ!"

سنبل نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ کچھ پوچھنا چاہا مگر احمد نے موقع نہ دیا کہا۔ "ڈونٹ ویسٹ دی ٹائم پلیز...... اور یہ گن بھی ساتھ لیتی جاؤ۔ اسے وہیں چھوڑ دینا۔"

اس نے شاپنگ بیگ اور گن اٹھائی اور جیپ سے اتر کر پتھر کے پیچھے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اس کی جون بدل چکی تھی۔ سرخ کڑھائی دار بھاری قمیص، سفید شلوار اور باریک سٹیپس والے شوز...... اس نے ہاتھوں میں شال بھی تھام رکھی تھی۔ بولی۔ "اس کا کیا کروں؟"

"اسے اوڑھ لو۔ اگر نقاب کرنی آتی ہے تو نقاب بھی کر لو۔ تمہیں تلاش کرنے والے دھوکا کھا جائیں گے۔" احمد نے اسے دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھا۔ یہ لباس سنبل کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ وہ پہن لینے کے بعد بری طرح نروس ہو رہی تھی۔ جھجک رہی تھی۔

اس نے اپنی چچازاد بہنوں کی شالیں دیکھ رکھی تھیں۔ ان کے سراپاؤں کو نظر میں رکھ کر شال اوڑھنے کی کوشش کی۔ کامیاب نہیں ہوئی تو سر پر ٹکا کر دونوں ہاتھوں میں تھامے سیٹ پر آبیٹھی بولی۔ "میں نے اپنا لباس وہیں پھینک دیا ہے اور ہاں! یہ شال مجھے پہنادو۔"

اس نے شال کے دونوں پلو تھامے۔ چاہا کہ چہرے پر لپیٹ دے۔ سرخ رنگ کی ستاروں بھری شال نے چہرے کی رنگت کے ساتھ ایسا کنٹراسٹ دیا کہ وہ دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ ایسے ہی ٹکٹکی باندھ کر کئی لمحے گھورتا رہا۔ وہ جھینپ گئی بولی۔ کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا میں نے کوئی غلطی کرلی ہے؟"

اس نے پلو چھوڑ دیے۔ سگرٹ کیس سے آخری سگرٹ نکال کر سلگائی، ایک لمبا کش لیا اور گیئر لیور پش کردیا۔ بولا۔ "بس ایسے ہی ٹھیک ہے۔"

وہ کچھ بھی، کچھ نہ سمجھی مگر اپنے جوتوں کو دیکھنے لگی۔ پیروں کو تنگ کررہے تھے مگر آنکھوں کو بھلے لگ رہے تھے۔ جونہی جیپ آگے بڑھی، اس نے پوچھا۔ "احمد! تم صرف یہ لباس لینے کے لیے اس عمارت میں چوروں کی طرح داخل ہوئے تھے؟"

احمد نے کہا۔ "چوروں کی طرح نہیں، ڈاکوؤں کی طرح کہو۔ میرا اندازہ تھا کہ وہاں سے کچھ کھانے پینے کے لیے مل جائے گا نہیں ملا۔"

"وہ کسی کا گھر ہے؟"

"ہاں! وہ ایک فیملی ریسٹ ہاؤس ہے۔ سرگودھا کے ایک بڑے زمیندار کی ملکیت ہے۔ وہ گرمیوں کے دو چار ماہ اپنی فیملی سمیت یہاں آکر رہتا ہے۔ باقی سارا سال یہاں پر ایک چوکیدار رہتا ہے جو اس عمارت کا خیال رکھتا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کڑاکے کی سردی میں وہ بھی کہیں جا کر دبکا بیٹھا ہو گا۔ عمارت خالی ملی۔ اس کی ایک الماری میں مجھے دو تین زنانہ سوٹ دکھائی دیے۔ جوتے بھی مل گئے۔ میرے پہننے کے لیے وہاں کچھ نہیں تھا، نہ پیٹ میں ڈالنے کو کچھ تھا ورنہ اٹھالاتا۔"

"مگر تم نے یہ کیوں کیا؟"

"تم بے وقوف بھی ہو۔ اوئے عجیب وغریب سارجنٹ! اُس لباس میں مین روڈ پر چڑھتے تو ہر کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کر تجھے دیکھتا۔ پولیس دھر لیتی۔ تمہیں کوئی کچھ نہ کہتا، میری درگت بن جاتی۔ اتنی سامنے کی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔" اس نے بظاہر غصے سے کہا مگر سنبل کو اچھا لگا۔ "تھینک یو" کہہ کر باہر دیکھنے لگی۔ چند ہی لمحوں میں وہ ایک دورویہ کشادہ سڑک پر تھے۔ احمد نے بتایا کہ یہ پنڈی سے مظفرآباد جانے والی مرکزی شاہراہ ہے۔ اس نے یہ بھی تسلی دی کہ اب وہ پربت شاہ اور سردار خان کی رینج سے باہر نکل چکے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد احمد نے ٹول پلازہ کے برابر پہنچ کر روڈ سائیڈ میں جیپ روک دی۔ اسے اترنے کا اشارہ کیا پھر ساتھ لے کر سڑک عبور کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ مری روڈ پر کھڑے تھے۔ سنبل نے پوچھا۔ "اب کیا ارادہ ہے؟"

احمد کی حالت بہتر نہیں تھی مگر اس نے مسکرا کر دیکھا کہا۔ "اب تم آزاد ہو۔ کیا تمہیں کسی ٹیکسی پر بٹھا کر اسلام آباد روانہ نہ کردوں؟"

وہ گھبرا گئی۔ جلدی سے بولی۔ "نہیں احمد...... تم مجھے ایسے نہیں چھوڑ سکتے ہو۔ پلیز...... فار گاڈ سیک...... میرے ساتھ چلو۔ تم نے کہا تھا......"

"کہ تمہیں ائرپورٹ پر چھوڑ کر آؤں گا۔ ہیں؟" احمد نے چھیڑنے کا سا لہجہ اختیار کیا۔ ایسے میں ٹول پلازہ سے نکلتی ہوئی ویگن پر نگاہ پڑ گئی۔ قدم بڑھا کر ہاتھ لہرانے لگا۔ ویگن رک گئی۔ ان کے بیٹھنے پر چل پڑی۔ کنڈیکٹر کے استفسار پر احمد نے جیب میں ہاتھ

ڈالا۔ پرس سے ایک نوٹ کھینچا اور کہا۔ "بارہ کہو......"

کنڈیکٹر نے اسے کریدتی نگاہوں سے دیکھا مگر کچھ کہے بغیر کرایے کی رقم کاٹی اور بقایا اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بارہ کہو کے موڑ پر کھڑے تھے۔ احمد اسے لیے چند میٹرو ویگن کے پیچھے چلا پھر بائیں ہاتھ گلی میں مڑ گیا۔ سڑک بلند تھی۔ گلی بتدریج پستی میں جا رہی تھی۔ ایک موڑ مڑنے کے بعد عین سامنے والی عمارت پر ہوٹل کا بورڈ آویزاں دیکھ کر سنبل کے حلق سے طویل سانس خارج ہوگئی۔ وہ احمد کی تمام تر پلاننگ سمجھ گئی تھی۔ اس نے گاڑی کو ایکسپریس وے پر چھوڑ کر اس سے جان چھڑائی تھی اور اب کچھ کھانے پینے اور آرام کرنے کے ارادے سے ہوٹل کا رخ کیا تھا۔ ایک گھنٹہ انہی امور میں گزر گیا۔ احمد بھرپور انگڑائی لے کر بیڈ پر دراز ہوگیا بولا۔ "سوری سنبل! میں نے کاؤنٹر پر تمہیں اپنی بیگم لکھوایا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو کاؤنٹر مین ہمیں کمرہ نہ دیتا۔"

سنبل قالین پر بیٹھ گئی۔ بیڈ کے ساتھ کمر ٹکا کر بولی۔ "یہ معذرت خواہانہ بات نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم نے بہ امر مجبوری جھوٹ بولا ہے۔"

"اب تم کافی بہتر حالت میں ہو۔ پیٹ بھر جائے تو انسان کو بہت کچھ سوجھتا ہے۔ تم بھی اپنے دماغ پر زور ڈالو اور اپنا آگے کا لائحہ عمل طے کرو۔ عملی طور پر میرا کام ختم ہوگیا ہے مگر میں چاہوں گا کہ تم پھر پربت شاہ کے ہاتھ نہ لگ جاؤ۔ بتاؤ...... تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

"احمد! میں نے تمہیں کھوہ میں اپنی کہانی سنائی تھی۔ وہ مکمل نہیں تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے مکمل کروں تاکہ تم میری مدد کر سکو۔ مجھے بہتر مشورہ دے سکو۔"

احمد نے کچھ کہنا چاہا مگر دروازے پر دستک ہوئی۔ احمد کے اشارے پر سنبل نے دروازہ کھولا۔ روم سروس مین تھا۔ سگریٹ کیس دینے آیا تھا۔ سنبل نے کیس لے کر دروازہ مقفل کر دیا۔ احمد نے سگریٹ نکال کر سلگائی، لائٹر کو پیار سے دیکھا اور بڑبڑایا۔ "تم کتنے پیارے ہو۔ تم نے رات بھر ساتھ دیا ورنہ کوئی لمحہ بھر ساتھ نہیں دیتا۔ تم میرے سینے میں دھواں بھرتے تھے، رات کو روشنیاں بھرتے ہو۔"

سنبل بڑی محویت سے احمد کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کھانے سے قبل غسل کیا تھا۔ دھلا دھلا چہرہ دل کو بھا رہا تھا۔ وہ 'ایوریج' میں شامل نہیں تھا۔ 'اسپیشل' لسٹ میں تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے سنبل کی محویت تاڑ لی۔ مسکرایا بولا۔ "مجھ سے متاثر ہو رہی ہو؟"

وہ جب سے احمد کو ملی تھی، پہلی مرتبہ کھلکھلا کر ہنسی۔ آنکھیں جذبات خیز انداز میں چندھیا کر اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "ہاں! تم بہت اچھے ہو۔ آئی کیئر اباؤٹ یو......"

اسے سنبل کا یوں دیکھنا اچھا لگا۔ ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ دیسی لباس اس پر قیامت کی طرح جچ رہا تھا۔ طویل کش پھیپھڑوں میں اتار کر بولا۔ "تم اپنی آپ بیتی مکمل کرنے جا رہی تھیں......"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند لمحے آنکھیں موند کر کچھ سوچتی رہی پھر بجلی کے سوئچ بورڈ پر نظریں جما کر بولنے لگی۔ سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا، جہاں اس نے چھوڑا تھا......

❀❀❀

آنے والے دو تین دنوں میں ایسا لگا کہ افروز شاہ اور پربت شاہ کو اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انہوں نے اسے اتنی اہمیت بھی نہیں دی تھی کہ دوسری مرتبہ مل لیتے یا اس سے نورنگ شاہ کے بارے دریافت کر لیتے۔ البتہ حویلی کی خواتین نے اسے خصوصی

پروٹوکول دیا۔ خوب آؤ بھگت کی۔ دو دن ایسے ہی گزر گئے۔ اس دوران تابو نے اسے حویلی، سندر بن اور بندرہ کے بارے میں بہت سی کارآمد باتیں بتائیں۔ اس نے منشیات فروشی، سردار خان اور چیئر لفٹ کے منصوبے کے بارے میں بھی خاصی باتیں بتائیں۔

زریں گل کچھ مختلف مزاج کی مالک تھی۔ وہ زیادہ گھلی ملی نہیں مگر اس نے خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔

وہ حویلی سے باہر نکل کر سندر بن کی سیر کرنا چاہتی تھی۔ چٹان کے نیچے پناہ گزین لوگوں سے ملنا چاہتی تھی۔ اس خواہش کا اظہار اس نے تیسرے دن آنٹی سے کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ تابو اور بانو اس کا ساتھ دیں مگر آنٹی نے یہ کہہ کر اسے پریشان کر دیا۔ ''تمہارے انکل نے حکم دے رکھا ہے کہ تم حویلی سے باہر نہیں جاؤ گی۔''

''مگر کیوں؟ وہ یہ حکم کیوں کر دے سکتے ہیں؟'' سنبل نے دریافت کیا۔

''میں بیاہ کر آئی تھی تو مجھے یہی حکم ملا تھا۔ آج تک اس پر عمل کر رہی ہوں۔ تمہاری دونوں بہنوں کے لیے بھی یہی قانون رائج ہے۔ ظاہر ہے، تم بھی باہر نہیں جا سکو گی۔'' آنٹی کے لہجے میں یاسیت تھی۔

وہ اٹھی۔ کچھ کہے بنا بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ پربت شاہ مہمان خانے میں تھا۔ وہ اس کے پاس جانا چاہتی تھی مگر دروازے کے عین سامنے کھڑے گن مین نے روک دیا۔ ''بی بی! تم گھر سے باہر نہیں جاؤ گی۔''

''کیوں؟'' اس نے قدم نہیں روکے۔

وہ عین سامنے آ گیا۔ قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ''بی بی! مجھے شاہ سائیں نے حکم دے رکھا ہے۔ میں تمہارا دل سے احترام کرتا ہوں مگر مجبور ہوں۔ مجھے امتحان میں مت ڈالو۔''

وہ رک گئی، بولی۔ ''میں شاہ سائیں کے پاس جا رہی ہوں؟''

''ادھر مہمان آئے ہیں۔ تم واپس جاؤ۔ میں شاہ سائیں کو بتا دیتا ہوں۔ وہ زنان خانے میں آ کر تم سے مل لے گا۔'' گن مین کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی بھی قیمت پر سنبل کو حویلی سے نکلنے نہیں دے گا۔ وہ بھڑک گئی۔ اسے ایک جانب دھکیل کر تیز تیز قدموں سے مہمان خانے کی طرف بڑھی۔ گن مین اس کے ساتھ ساتھ دوڑتا آیا۔ اسے روکنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ نہ رکی۔ گن مین کسی خوف کے مارے اسے چھونے سے گریز کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مہمان خانے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ سامنے پربت شاہ اپنے احباب کے دائرے میں بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ تیزی سے اس کے پاس آیا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''تم ادھر کیوں آئی ہو؟''

اس نے کہا۔ ''اس نے مجھے دروازے پر کیوں روکا انکل؟ یہ کہہ رہا ہے کہ میں حویلی سے باہر نہیں جا سکتی۔''

پربت شاہ نے پلٹ کر مہمانوں کی طرف دیکھا۔ پھر گن مین کو گھورا۔ بولا۔ ''یہ انگلینڈ نہیں ہے سنبل بیٹی...... یہ سندر بن ہے۔ یہاں عورتوں کا باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور پھر اس لباس میں...... ناممکن...... تم حویلی کے اندر جاؤ۔''

وہ اڑ گئی۔ ''نہیں بابا! میں یہاں حویلی میں قید ہونے کے لیے نہیں آئی۔''

''تو کیا کرنے آئی ہو؟'' پربت شاہ چونکا۔

''میں اپنا علاقہ دیکھنے آئی ہوں۔ میں باہر جا رہی ہوں۔''

''نہیں...... تم ابھی گھر جاؤ۔ شام کو افروز خان آ جائے گا۔ وہ تمہارے ساتھ جائے گا۔ تمہیں سارا علاقہ دکھالائے گا۔''

شام کو آنے والا عین اسی وقت پہنچ گیا۔ مہمان خانے کے باہر گاڑی رکنے کی آواز ابھری۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ افروز شاہ دو گارڈز کے ہمراہ مہمان خانے کی طرف بڑھا۔ باپ کو سنبل کے ساتھ کھڑے دیکھ کر غصے سے بولا۔ ''یہ یہاں کیا کر رہی ہے بابا؟''

پربت شاہ نے اس پر خفگی بھری نگاہ ڈالی اور کہا۔ ''یہ سندر بن کی سیر کرنا چاہتی ہے۔ حویلی میں اس کا دم گھٹنے لگا ہے۔''

اس کے لہجے میں طنز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ سنبل کا ماتھا ٹھنکا۔

افروز شاہ نے گارڈز کو دور جانے کا اشارہ کیا اور کڑک دار لہجے میں اسے کہا۔ ''مہمانوں کے سامنے ہمیں تماشا نہ بناؤ، حویلی چلو، وہاں تم سے بات ہوگی۔''

اس نے سنبل کے جواب کا انتظار کیے بغیر اسے بانہہ سے تھاما اور تقریباً گھسیٹتا ہوا مہمان خانے سے نکل گیا۔ چند لمحوں میں بی بی تک پہنچا کر بولا۔ ''بی بی! اسے سنبھال کر رکھو۔ اگر یہ دوبارہ باہر نکلی تو میں تمہارا خیال بھی نہیں کروں گا۔''

بی بی کی زبان مقفل رہی۔ اسے تھام کر تابو کے کمرے میں لے گئی۔ سمجھانے لگی کہ وہ ان لوگوں کے بارے غلط اندازے نہ لگائے۔ وہ انسانوں کی کھال میں درندے ہیں جو اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ وہ اس کا پینٹ شرٹ میں باہر نکلنا کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کریں گے۔

وہ خاموش ہو گئی۔ فیصلہ کن انداز میں بات کرنے کے لیے پر تولنے لگی۔ پھر موقع مل ہی گیا۔ رات کو کھانے پر بھی کی موجودگی میں پربت شاہ سے مخاطب ہوئی۔ ''انکل! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

وہ چونکا۔ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''کیا بات ہے؟''

''یہاں کچھ ایسے کام ہو رہے ہیں جو خاندان کی بے عزتی کا سبب بن رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہمارے خاندان کو معتبر رہنا چاہیے۔'' اس نے ادب کا دامن تھامے رکھا تھا۔

پربت شاہ کا جبڑا بھنچ گیا بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں۔ ایسا تو کوئی کام نہیں ہو رہا۔ سندر بن ہماری وادی ہے۔ ہم جو چاہیں، کریں۔ کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کسی کو اعتراض ہے تو وہ یہاں سے چلا جائے۔''

افروز نے یکے بعد دیگرے باپ اور سنبل کی طرف دیکھا۔ درشتی سے بولا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

بی بی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سنبل کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ نظر انداز کر کے بولی۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ سندر بن میں منشیات کا کاروبار کھلے عام ہو رہا ہے۔ اس معاملے میں علاقے بھر میں یہ وادی بدنام ہو چکی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سردار خان نامی شخص کا یہاں کوئی کام نہیں ہے مگر وہ بندرہ کی حویلی پر نہ صرف قابض ہے بلکہ اس نے غنڈوں کی ایک فوج پال رکھی ہے۔''

اس نے سانس لینے کے لیے توقف کیا۔ افروز نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''اور کچھ؟''

''انکل! آپ لوگوں نے دادا کے زمانے سے بیٹھے ہوئے لوگوں کے مکان گرا کر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ وہ بے چارے اس سردی میں گھر اور گھروں کا سامان گنوا کر چٹان کے نیچے بے آسرا پڑے ہیں۔ اگر چیئر لفٹ اور کیبل کار کا منصوبہ اتنا ہی فائدہ مند نظر آ رہا تھا تو اس کے لیے بندرہ وادی بھی موجود تھی جو سندر بن سے

زیادہ سرسبز ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ درختوں کی کٹائی کا زیادہ رجحان یہاں پر ہے، بندرہ میں نہیں ہے۔"

افروز کا ضبط دیدنی تھا۔ اسے کڑی نظروں سے گھورتا رہا، پھر بولا۔ "تم وہ بات کہو، جو کہنے کے لیے ولایت سے یہاں آئی ہو۔ گھما پھرا کر باتیں کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

اس نے انکل اور افروز کی شعلہ اگلتی آنکھوں کی پروا نہیں کی بلکہ حتمی انداز اختیار کیا۔ "میں چاہتی ہوں کہ جس طرح دادا کے زمانے میں وادی کا نظام چلتا تھا، ایسے ہی اب بھی چلے۔ یہاں کوئی غیر قانونی دھندا نہ ہو جس سے وادی کی بدنامی ہو اور غریبوں کا خیال رکھا جائے۔ اگر آپ لوگ کسی بھی وجہ سے مجبور ہیں تو اپنے دھندوں کو بندرہ تک محدود کر دیں۔"

پربت شاہ اس لہجے اور اندازِ تخاطب کا عادی نہیں تھا۔ بھڑک کر بولا۔ "خاموش رہو ورنہ......"

افروز نے ہاتھ بڑھایا۔ پربت شاہ کے فرطِ اشتعال سے کپکپاتے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ سنبل سے مخاطب ہوا۔ "تمہارا اِن معاملات سے کیا تعلق ہے؟"

وہ بولی۔ "یہ وادی میری ہے۔ اس سے بڑا تعلق کیا ہوگا؟"

"ہوں...... تو یہ وادی تمہاری ہے؟" افروز کی آواز بے حد درشت ہو گئی۔ وہ پختہ کار نہیں تھی ورنہ تیور سمجھ کر خاموش ہو جاتی۔ بولی۔ "یقیناً...... اور میں اپنے بابا کا نام بدنام ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ اگر آپ لوگ میری بات پر توجہ نہیں دیں گے تو میں اپنی جائیداد اپنی تحویل میں لینا چاہوں گی۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس کا جملہ بم کی طرح کھانے کی میز پر پھٹ گیا۔ پربت شاہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ افروز شاہ کی آنکھیں فرطِ حیرت سے کھل گئیں۔ حیرت کی

اقوال زریں

✦ خوش کلامی ایک ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔

✦ صبر سے بڑھ کر کوئی چیز میٹھی نہیں۔

✦ روشنائی جلد خشک ہو جاتی ہے۔ آنسو نہیں۔

✦ کیڑے آپ کو اس وقت کھاتے ہیں جب آپ مردہ ہوں لیکن غم آپ کو زندہ ہی کھا لیتے ہیں۔

✦ مشکل ترین کام بے کار رہنا ہے۔

✦ پیٹ سے بڑھ کر کوئی بدترین برتن نہیں۔

(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

انتخاب: نور فاطمہ...... کراچی

جگہ رفتہ رفتہ اشتعال لینے لگا۔ ان میں سے کسی کو بھی اس مطالبے کی توقع نہیں تھی۔ بی بی کا ہاتھ دل پر جا ٹکا۔ یہ مشکل خیر مانگی تھی۔ خیر ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شا کی نظروں سے سنبل کی طرف دیکھا۔ رحم طلب انداز میں اپنے شوہر اور بیٹے کو دیکھا۔ نادان نہیں تھی۔ سمجھ گئی کہ اب اسے سنبل کا دکھ دیکھنا پڑے گا۔

"اچھا! تو تم اس چکر میں یہاں آئی ہو......" افروز نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "بی بی! سن لیا ناں...... تم نے کہا تھا کہ یہ اپنے خونی رشتوں کو ایک نظر دیکھنے آئی ہے۔ نورنگ شاہ جیسے بے وفا شخص کے خون میں اتنا دم کہاں کہ پلٹ کر دیکھے۔ اوئے لڑکی! کان کھول کر سن لو۔ یہ ہمارے باپ دادا کی دھرتی ہے۔ اس کے ہم وارث ہیں۔ تم نہیں۔ میرے بازوؤں میں اتنا دم ہے کہ تم جیسے کیڑوں مکوڑوں کو مسل کر رکھ دوں۔ مگر بی بی کی وجہ سے تمہیں اب تک برداشت کرتا آیا ہوں مگر اب نہیں کروں گا۔ آئندہ اگر تم نے حویلی سے باہر قدم

رکھنے کی کوشش کی یا اپنی گندی زبان سے ہماری جائیداد کا نام لیا تو بہت برا ہوگا...... اتنا برا کہ تم نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔"

بات بڑھ گئی تھی۔ بی بی نے ہمت دکھائی۔ سنبل کو بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔ سمجھانے لگی۔ اپنی مجبوری اور کمزوری کا اظہار کرنے لگی۔ "سنبل! تم میرا نہیں، انہی لوگوں کا خون ہو مگر ان سے واقف نہیں ہو۔ انہوں نے نورنگ شاہ کا ورقہ خاندان کی کتاب سے پھاڑ پھینکا ہے۔ ویسے بھی یہ لوگ عورتوں کو وراثت میں سے حصہ دینے کے عادی نہیں ہیں۔ خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ تم نے بتایا تھا کہ تمہارے پاس بہت دولت ہے۔ جاؤ، اس پر عیش کرو۔ سندربن کا خیال دل سے نکال دو ورنہ یہ ظالم لوگ تمہاری چھاتی سے دل نکال کر کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔"

وہ بی بی کے سامنے خاموش ہو گئی مگر پربت شاہ اور افروز کے ردعمل سے ڈرنے کے بجائے ضد پکڑ گئی۔ اگلے دن اس نے حویلی سے باہر جانے کی ضد کی۔ افروز نے اسے اپنی جیپ میں بٹھایا، نوری نامی ایک گن مین کو ساتھ لیا اور آدھے دن کا بھرپور وزٹ دیا۔ اس دوران سنبل نے اسے اپنے موقف پر قائل کرنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا بلکہ سنی ان سنی کرتا رہا۔ جب سہ پہر میں واپسی ہوئی تو اس نے جیپ سے اترنے سے قبل کہا۔ "لالہ! دیکھو تو سہی...... کتنا پیارا گاؤں آباد ہوا کرتا تھا یہاں جسے آپ لوگوں نے چند روپوں کے لالچ میں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔"

افروز کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ثبت ہو گئی۔ کچھ بولنے کے بجائے آنکھوں سے سمجھانے لگا، "تم اپنی زندگی سے دشمنی کرنے لگی ہو سنبل بی بی...... ابھی بھی وقت ہے، پلٹ جاؤ ورنہ اس کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔"

وہ جس کمیونٹی کی پروردہ تھی، وہاں ایسی جنگیں قلم، قانون اور دلیل سے لڑی جاتی تھیں۔ اسے تین دن بعد پتہ چلا کہ وہ کتنی کمزور تھی۔ وہ تابو کے کمرے میں سوئی تھی۔ بیدار ہوئی تو ایک دم اچھل پڑی۔ وہ ایک نامانوس کمرے کے سالخوردہ بیڈ پر پڑی تھی۔ سیاہ پتھروں کی بنی ہوئی دو دیواریں اسپاٹ تھیں۔ باقی دو میں چوبی دروازے نصب تھے۔ وہ بھاگ کر سامنے والے دروازے میں آئی۔ دروازہ کھولا، کھل گیا مگر وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹی۔ یہ باتھ روم تھا۔ دوسرے دروازے میں آئی۔ دل دھک سے رہ گیا جب دروازے کو باہر سے مقفل پایا۔ حلق کے بل زور سے چیخی۔ ایک بار...... دو بار...... پھر بار بار...... کافی دیر بعد دروازے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ دروازہ کھول کر، ہاتھوں میں ٹرے تھامے اندر داخل ہونے والا خاصا بدصورت تھا۔ اس کی آواز بھاری اور ڈراؤنی تھی بولا۔ "شور نہ کرو۔ میں ناشتہ لے آیا ہوں۔ خاموشی سے کھالو۔"

اس نے بہت کچھ پوچھا۔ بہت چیخی چلائی۔ مگر ناشتہ لانے والے کی صحت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی، اسے دکھانے کے لیے ارادتاً ایک چمکدار خنجر نکال کر بلٹ بیلٹ میں اڑسا اور کہا۔ "ادھر غسل خانہ ہے۔ پانی ختم ہو جائے تو بتا دینا۔ جب بھوک لگے، کھانا کھالینا۔ میں جا رہا ہوں۔ تم نے جو کچھ پوچھنا ہے، وہ شاہ سائیں سے پوچھنا۔ وہی بتائے گا۔"

"اسے بلاؤ...... میں ابھی پوچھتی ہوں اس سے۔"

وہ دانت پیس کر بولی۔

"وہ شام کو آئے گا۔" اس نے کہا اور چلا گیا۔ اپنے پیچھے دروازہ مقفل کرنا نہیں بھولا تھا۔

وہ نادان تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ یہ سمجھ نہ پاتی کہ اسے تابو کے کمرے سے اغوا کر کے یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہ ملی۔ مایوس ہو کر نہ کھایا جا سکنے والا کھانا کھانے لگی۔ رونے کی عادی نہیں تھی مگر جب باتھ روم کی حالتِ زار دیکھی تو رونے بیٹھ گئی۔ شام کو پربت شاہ کے آنے تک اس کی حالت خاصی دگرگوں ہو چکی تھی۔

وہ جب کمرے میں داخل ہوا تو اس کے عقب میں نوری کھڑا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں خوفناک شکل والی گن جبکہ بائیں ہاتھ میں ہلکے سبز رنگ کی فائل تھامی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

سنبل نے چیخ چیخ کر اغوا ہونے پر احتجاج کیا۔

پربت شاہ جواباً طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے دروازے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جب سنبل کا گلا بیٹھ گیا، روہانسی ہو کر بیڈ پر گر گئی تو وہ قریب آ گیا۔ اس نے اس کے بال مٹھی میں بھرے اور بے دردی سے بیڈ سے نیچے کھینچ لیا۔ مارے تکلیف کے اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ آنے والے وقت میں یہ طے ہوا کہ یہ تکلیف بہت معمولی تھی۔ پربت شاہ نے اسے اس ظالمانہ انداز میں پیٹا کہ وہ بلبلا اٹھی۔ اسے دھکا دے کر دیوار کی جڑ میں پھینک دینے کے بعد وہ کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ ہانپ رہا تھا، سانسیں برابر کرتے ہوئے بولا۔ ”اب وہ سب بکو اس کروناں جو حویلی میں کر رہی تھی...... کتیا کی بچی......“

اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ گالی سن کر یکبارگی غرائی۔ ”میں نہیں، تم کتے ہو...... بے غیرت ہو...... بے حس ہو۔ آئی ول شوٹ یو......“

وہ بھڑک کر بڑھا۔ پھر کسی خیال کے تحت رک گیا۔ پلٹ کر نوری کے پاس گیا۔ اس کے ہاتھ سے فائل لے کر بولا۔ ”اسے بتاؤ کہ یہ کس کو گالیاں دے رہی ہے۔“

اس کا انداز بہت جارحانہ تھا۔ نوری نے قدم بڑھایا۔ سنبل کو دونوں ہاتھوں میں بچے کی طرح اٹھا کر دیوار میں دے مارا۔ اس کے حلق سے بلند چیخ نکلی۔ ساتھ میں اس نے انگریزی میں پربت شاہ کو دو چار گالیاں دیں۔ نوری نے اس پر تھپڑوں، لاتوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ چند ہی لمحوں میں سنبل نے سپر ڈال دی۔ اس کا بے جان وجود دیوار کی جڑ میں متوازی پڑا تھا اور اس پر نوری کی ٹھوکروں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ نوری نے پربت شاہ کے حکم پر اس پر ٹھنڈا پانی ڈالا۔ وہ ہوش میں آ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پربت شاہ کو دیکھنے لگی۔

وہ اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔ ”لڑکی! سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تم میری بھتیجی نہیں ہو۔ تمہاری رگوں میں میرے باپ دادا کا خون نہیں، بلکہ ایک انگریز عورت کا خون ہے۔ اسے بہتا دیکھ کر مجھے ترس نہیں آئے گا۔“

پربت شاہ نے کچھ توقف کیا۔ وہ کچھ کہنے لگی تو ہاتھ اٹھا کر روک دیا کہا۔ ”دوسری بات یہ ہے کہ یہ دونوں وادیاں میری ہیں۔ ان میں کسی الو کے پٹھے کا ایک پتھر بھی موجود نہیں ہے، خواہ وہ نورنگ شاہ ہی کیوں نہ ہو...... اور تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ تمہارا دنیا سے رابطہ کٹ چکا ہے۔“

اس نے رک کر شعلہ بار نظروں سے اسے سر تا پا گھورا۔ دہشت طاری کرنے والا لہجہ اختیار کیا۔ سلسلہ کلام جوڑا۔ ”تم پردیسن ہو۔ تم پر ترس کر سکتا ہوں۔ تمہیں ولایت بھیج سکتا ہوں مگر اس کے لیے تمہیں دو میں سے ایک آپشن کا انتخاب کرنا ہوگا۔ پہلا آپشن یہ ہے کہ تم ان کاغذات پر دستخط کرو گی۔ میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھتا۔ صاف بتاتا ہوں کہ ان پر

دستخط کرنے کے بعد تمہارا اسکندر بن سے قانونی طور پر تعلق ختم ہو جائے گا۔ دوسرا آپشن یہ ہے کہ تم میرے دونوں میں سے ایک بیٹے کے ساتھ شادی کرو گی۔ ان میں سے کوئی بھی آپشن قبول کرنے پر تمہیں زندہ سلامت یہاں سے نکال دیا جائے ورنہ......"

اس نے ہونٹ کچکچائے۔ اپنی آواز میں خوفناک تاثر پیدا کیا۔ "تمہیں علم ہوگا کہ تمہاری موت کے بعد یہ جائیداد میرے نام منتقل ہو جائے گی۔ یعنی تمہیں......"

اس نے اپنی گردن کے برابر ہتھیلی لہرائی۔ "نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری......اب فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے۔"

وہ ڈر گئی۔ سہمے سہمے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔ "انکل! تم نے مجھے انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے۔ میں یو کے سیٹیزن ہوں۔ مجھے قتل کرو گے تو بہت برے انجام سے دوچار ہو جاؤ گے۔ میں نہ ہی سائن کروں گی اور نہ ہی تمہارے گندے خون والے بیٹوں سے شادی کروں گی۔"

اس کا لہجہ اٹل تھا۔ چند لمحے کھڑا رہ کر گھورنے کے بعد پربت شاہ نے اسے سوچنے کا وقت دیا اور کمرہ چھوڑ دیا۔ اس کی آواز سنبل کے کانوں پڑی۔ "نوری! تم بھی آنکھیں کھلی رکھنا۔ یہ کتیا بھاگنے لگے تو گولی مار دینا۔ میں نے اسے زندہ رہنے کی بہت تھوڑی سی مہلت دی ہے۔"

بھاگنے کی راہ مسدود پا کر اس نے دو نہایت تکلیف دہ دن رونے اور سوچنے میں گزارے۔ اس کا سارا بدن دکھتا تھا مگر کوئی مرہم نہیں تھا۔ بخار ہوا مگر شام تک اتر گیا۔ بدن میں شدید نقاہت چھوڑ گیا۔ گن میں دو وقت کمرے کے اندر آتا تھا۔ کھانے کی ٹرے رکھنے کے دوران چوبند رہتا۔ وقتاً فوقتاً نوری بھی آن دھمکتا۔ وہ اسے دہشت میں مبتلا کرنے لیے قتل کی دھمکیاں دیتا یا دو چار ہاتھ رسید کر دیتا۔ سنبل نے ان چند دنوں کو اپنی زندگی کا بھیانک مرحلہ قرار دیا تھا۔

تیسرے دن، سہ پہر میں اس نے بڑی احتیاط سے چوبی میز کی ایک ٹانگ نکال لی۔ شام میں جب گن مین کھانا دینے آیا، سنبل نے باتھ روم میں پانی ختم ہونے کا کہا۔ وہ ٹرے رکھ کر باتھ روم میں گیا۔ بالٹی اٹھا کر کمرے سے نکلا۔ جاتے ہوئے دروازہ مقفل کرنا نہیں بھولا تھا۔ جب پانی کی بالٹی اٹھائے واپس آیا اور باتھ روم میں جانے لگا تو سنبل کو اس کی غفلت کا مختصر سا وقت مل گیا۔ اس نے دبے پاؤں اس کی پشت پر پہنچ کر دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا میز کا پایہ اس کے سر میں دے مارا۔ وہ کراہ کر پلٹا تو اس کے سر میں دوسری زوردار ضرب لگی۔ پانی سے بھری ہوئی بالٹی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور پانی فرش پر بہہ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھاما اور زمین پر بیٹھ گیا۔ سنبل نے دانت کچکچا کر تیسرا اور فیصلہ کن وار کیا۔ وہ ڈھیر ہو گیا تو سنبل نے باہر کا رخ کیا۔ وہ ایک مختصر سا پہاڑی مکان تھا۔ چھوٹا سا صحن تھا جو اس وقت بالکل خالی تھا۔ کسی کو نہ پا کر بھاگتی ہوئی بیرونی دروازہ عبور کر گئی۔ سامنے وادی کی خوبصورت سبز ڈھلان تھی جس پر سردی اور کمزور اندھیرے کا راج تھا۔

جونہی اترائی میں پہنچی، سمتوں کا تعین بھول گئی۔ ادھر ادھر چکرانے لگی۔ حویلی کی بتیوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اترتی شام اپنے جلو میں گہرا اندھیرا، ہڈیوں میں اترنے والی سردی اور بادلوں کو کھینچ لائی تھی۔ دوڑتے دوڑتے رک گئی۔ خیال آیا کہ ایسے دیوانوں کی طرح کب تک دوڑتی رہے گی۔ ایک جگہ بیٹھ کر سوچنے لگی کہ وہ اس خون آشام وادی سے کیسے نکل سکتی ہے؟ سمجھ میں نہ آیا کیونکہ اس نے اس

علاقے کو اچھی طرح دیکھا بھالا نہیں تھا۔ ایسے میں حویلی میں ہلچل کا احساس ہوا۔ پھر ملبے پر گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس چمکیں۔ چند لوگ بھاگتے دوڑتے نظر آئے۔ سمجھ گئی کہ اس کا فرار مخفی نہیں رہا تھا اور اس کی تلاش کا کام زوروشور سے شروع ہو چکا تھا۔

پتھروں پر دوڑنے سے آہٹ پیدا ہوتی تھی۔ زمین پر گری پائن کی سوکھی ٹہنیاں بھی آواز پیدا کرتی تھیں۔ اس لیے وہ دبے پاؤں حویلی سے دور ہونے لگی۔ اس نے یہ ترجیح ذہن میں رکھی کہ زیادہ سے زیادہ جھاڑیوں میں چھپی رہ کر سفر جاری رکھے۔ اس کی یہ ترکیب کامیاب رہی۔ اسے تلاش کرنے والے کئی مرتبہ اس کے اتنے قریب پہنچے کہ اسے سانس روک کر خود کو چھپانا پڑا۔ موت کا خوف سردی کے احساس پر غالب رہا مگر سردی اپنا کام دکھاتی جا رہی تھی۔ اس کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ جب وہ حویلی کے مخالف سمت والی پہاڑی پر چڑھ رہی تھی تو اسے بار بار رکنا پڑ رہا تھا۔ متعدد بار اس کے ہاتھ شل ہوئے جنہیں زور زور سے رگڑ کر اس نے بحال کیا۔ برہنہ پائی کی وجہ سے پاؤں بالکل سن ہو چکے تھے۔

جب آس پاس، کہیں قریب، کہیں دور ٹارچ لائٹس کا ہالہ چکراتا دیکھتی تو وہ جہاں ہوتی، وہاں بلی کی طرح دبک جاتی۔ شاید رات نے آدھا سفر طے کر لیا تھا جب وہ گھنے جنگل میں سے گزر کر اس سڑک کے قریب پہنچی۔ اسے علم نہیں تھا کہ وہ اس ننھے سے درے کو عبور کر کے سڑک پر پہنچ جائے گی۔ وہ تو بس پہاڑی پر چڑھ کر اس وادی سے نکلنا چاہتی تھی۔ عام لباس میں تھی۔ اس پر مستزاد خوف کے شدید عالم میں تھی۔ جونہی اس نے برف کے مانند یخ پتھر پر دونوں ہاتھ رکھے اور اوپر اٹھنا چاہا، اس کا جسم یکبارگی زور سے کانپا۔ گرنے سے بمشکل بچی۔ یوں لگا جیسے پھیپھڑوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ پوری قوت سے سانسیں لینے لگی۔ ایسے میں اس کا ذہن سونے لگا۔ گہری نیند...... پابے ہوشی...... اس کے پاس اس تفریق کی مہلت بھی ختم ہو گئی تھی۔ ابھی اس کا آتش کدہ بجھا نہیں تھا مگر اسے احمد کی شکل میں ایک بہترین اور ہمدرد معاون مل گیا تھا جو ایک طویل جدوجہد کے بعد اسے بارہ کہو کے اس ہوٹل تک پہنچانے میں کامیاب رہا تھا

❀❀❀

اس کی داستان ختم ہو چکی تھی۔ اس نے سر گھما کر بیڈ پر نیم دراز احمد کو دیکھا جو بڑے انہماک سے سگریٹ کے کش لینے میں مشغول تھا۔ سنبل کو لگا کہ وہ اس کی کہانی سن ہی نہیں رہا تھا۔ بولی۔ ”احمد! کیا تم میری اسٹوری میں انٹرسٹڈ نہیں ہو؟“

وہ چونکا بولا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ تم جو کہہ چکی ہو، وہ سن چکا ہوں۔“

”تم نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔“ اس کی آواز میں مایوسی کا رچاؤ تھا۔

وہ اسے دیکھے بغیر بولا۔ ”تم نان اسٹاپ بول رہی تھیں۔ روکنا اچھا نہیں لگا۔“

احمد کا ردعمل عجیب لگا۔ بولی۔ ”اٹ از او کے...... اب مجھے کیا کرنا چاہیے، یہ بتا دو۔“

وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔ ”کیا تم اپنی جائیداد حاصل کرنا چاہتی ہو؟“

وہ سوچ کر بولی۔ ”میرے نزدیک پہلے بھی وہ اتنی قیمتی نہیں تھی جتنے وہ لوگ جو بے آسرا ہو گئے ہیں۔ میں سندر بن کو دوبارہ ان لوگوں کے لیے آباد کرنا چاہتی تھی۔ مگر مجھ سے اب یہ بھی نہیں ہوگا۔ میں بس واپس جانا چاہتی ہوں۔“

احمد نے ایک دو ننھے ننھے کش لیے، سگریٹ کو کافی دیر تک ایش ٹرے میں مسلتا اور بغور دیکھتا رہا، پھر سر

اٹھائے بغیر بولا۔ "سنبل! یعنی تم نے پربت شاہ اور افروز شاہ سے ہار مان لی۔ ایسا ہی ہے ناں؟"

وہ کچھ نہ بولی۔

"اوکے! میں سمجھ گیا۔ تمہارا انسانی ہمدردی کا بھوت اتر گیا ہے۔ تم واپس جانا چاہتی ہو۔ ایک بات بتاؤ، کیا سنڈر لینڈ میں تم جیسی احمق لڑکیوں کو اتنی بڑی پوسٹ دے دی جاتی ہے؟"

وہ براہِ راست چوٹ پر تلملائی۔ "کیا مطلب؟ میں نے کیا حماقت کی ہے؟"

"ہاں!" وہ مسکرایا۔ "ایک نہیں...... کئی حماقتیں سرزد ہوئی ہیں۔"

"میں نے کوئی غلطی نہیں کی احمد!" وہ یقین سے بولی۔

"اچھا! تو پھر غور سے سنو! تم نے اتنے اہم مشن کے لیے ہوم ورک نہیں کیا۔ تم نے نجانے کیوں یہ طے کر لیا کہ تمہارے حویلی میں پہنچتے ہی سب معاملات اوکے ہو جائیں گے۔ تم نے پاکستان آنے کے بعد اپنے امور کو کسی وکیل سے ڈسکس نہیں کیا۔ ریونیو ڈیپارٹمنٹ سے رابطہ نہیں کیا۔ انگلینڈ کے سفارت خانے سے رجوع کرنا ضروری تھا، نہیں کیا۔ تم نے سندر بن کے قریب جا کر اس کے بارے میں چھان بین نہیں کی۔ نہ سمیر سے رابطہ کیا اور نہ اپنے دفاع کے لیے کوئی قانونی آڑ لی۔ پولیس کو چیک نہیں کیا...... نہیں، میری جان! زندگی ایسے احمقانہ انداز میں کیسے گزاری جا سکتی ہے؟ میں تو شکر کرتا ہوں کہ تم بھیانک موت مرنے سے بچ گئی ہو۔"

احمد کی باتوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ کئی ثانیے خاموشی سے قالین کریدتی رہی، پھر شکست خوردہ انداز میں بولی۔ "ہوں...... میں نے بہت بڑی غلطی کی کہ منہ اٹھائے سندر بن پہنچ گئی۔ تم درست کہہ رہے ہو۔ میں احمق ہوں۔ جب میں اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تو میں لوگوں کو کیسے خطرات سے بچاپاؤں گی۔ یقینی طور پر میں سنڈر لینڈ پہنچتے ہی پولیس ڈیپارٹمنٹ چھوڑ دوں گی۔"

"پلیز! انگلش نہیں...... اُردو بولو۔ اس سے مجھے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔" احمد کے لبوں پر شوخ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

سنبل نے یہی بات اُردو میں دہرائی۔ وہ بولا۔

"اگر تم اپنے اس ارادے کی تکمیل چاہتی ہو جو تمہیں پاکستان لایا، تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ اگر تم شکست تسلیم کر کے بھاگنا چاہو گی تو بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔ اب میں چند سوال پوچھنا چاہوں گا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اغوا ہونے کے بعد جب پربت شاہ نے تمہارے سامنے دو آپشن رکھے تو تم نے پہلا آپشن قبول کیوں نہیں کیا؟ جائیداد، جس کی تمہارے نزدیک زیادہ اہمیت بھی نہیں، چھوڑ کیوں نہیں دی؟"

وہ بولی۔ "سندر بن میرے آنجہانی بابا کی وادی ہے۔ میں اسے مکروہ دھندوں کے لیے استعمال ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"اوکے! آئی ایگریڈ وِد یو...... باوجود کہ اب تم اسی پربت شاہ کی تحویل میں چھوڑ کر وطن واپس جا رہی ہو۔ نیکسٹ آپشن۔ تم اپنے خونی رشتہ داروں کے لیے محبت کا پیام بن کر یہاں آئی۔ تم نے یہی ظاہر کیا۔ ٹھیک؟ اب یہ بتاؤ کہ تم نے پربت شاہ کی بہو بننا قبول کیوں نہیں کیا؟"

احمد کی تیز، چبھتی ہوئی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ گڑبڑائی۔ احتیاط لازم تھی۔ سو کچھ دیر سوچ کر بولی۔ "مجھے پربت شاہ اور اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔ مجھے اس خیال سے بھی گھن آتی ہے تو میں اس کے کسی بیٹے سے

شادی کروں۔"

وہ بدستور اسے دیکھتا رہا، بولا۔ "ہر انسان اپنے عمل کا جواب دہ ہے۔ تم نورنگ شاہ کی بیٹی ہو۔ تمہاری رگوں میں وہی خون دوڑتا ہے جو پربت شاہ اور اس کی اولاد میں...... پھر تمہیں اپنے آپ سے نفرت کیوں نہیں ہوئی؟"

اس کے بھرے بھرے لبوں سے سیٹی برآمد ہوئی۔ توقف کے بعد بولی۔ "اوہ کم آن احمد! یہ تم کیا ٹاپک لے بیٹھے ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس حویلی کے تمام مردوں کے چہرے بھیانک اور کریہہ ہیں۔ میں کیسے اس گھر میں شادی کر سکتی ہوں۔ افروز بدکردار اور ان پڑھ ہے۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود ہوسیلا ہے۔ اس کی فطرت میں رچی ہوئی درندگی میں دیکھ چکی ہوں۔ دوسرے کو میں نے دیکھا تک نہیں۔ البتہ آنٹی نے بتایا تھا کہ ظفر شاہ منشیات کا عادی ہے۔ کئی مرتبہ علاج کے بعد بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ نہیں احمد! تم سندربن کے رہنے والے ہو۔ یقیناً تمہارا گھر بھی مسمار ہو گیا ہے۔ تم مجھ سے کہیں بہتر طور پر پربت شاہ اور اس کے خاندان کو جانتے ہو۔"

"ہاں! میں بھی کو جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ پربت شاہ تمہاری شادی اپنے تیسرے بیٹے سے کرنا چاہتا ہو۔ اس کا نام جمال شاہ ہے۔ وہ ان پڑھ نہیں اور نہ ہی نشہ کرتا ہے۔ یونیورسٹی لیول میں ہے۔" احمد نے کہا۔ "تم نے اسے دیکھے بغیر کیسے رد کر دیا؟"

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ احمد نے ٹھیک کہا تھا، بولی۔ "اوں...... تم ٹھیک انداز میں سوچتے ہو۔ مگر احمد! وہ بھی تو پربت شاہ کا بیٹا ہی ہے۔ اسی کا خون ہے۔ اس کے زیر تربیت پلا بڑھا ہے۔ میں اس پر کیسے اعتبار کر سکتی ہوں؟ یقیناً وہ ان سے بھی دو چار قدم آگے ہوگا۔ نو احمد نو! آئی ہیٹ ہم...... آئی ہیٹ آل...... مجھے ان کے کردار سے گھن آتی ہے۔"

اس کا لہجہ حتمی تھا۔ احمد نے کہا۔ "اوکے...... تم نے یقیناً سمیرا اور اس کے خاندان کو اس لیے اس معاملے میں نہیں ڈالا کہ تمہارے نزدیک وہ بہت کمزور لوگ ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔" احمد اس سے پوچھ نہیں رہا تھا بلکہ اپنا قیاس آشکار کر رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ احمد نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "لیکن تم نے موت کے ڈر سے انسانی ہمدردی کے جذبے کو بھی سلا دیا، یہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"احمد پلیز! میں واپس جانا چاہتی ہوں اور بس...... مجھے مت اکساؤ۔ یہ سارا ملک گندا ہے۔ یہاں کے رہنے والے گندے ہیں۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔" اس کی آواز میں زہر ہی زہر بھرا ہوا تھا۔

احمد بیڈ سے اترا۔ اس پر ترحم آمیز نگاہ ڈال کر کمرے کی عقبی کھڑکی کی جانب بڑھا۔ طاق کھولے۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا۔ آنکھیں بند کر کے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ ایسے میں سنبل اس کے عقب میں آ گئی۔ اس کی بغلوں سے ہاتھ نکال کر کمر سے چپک گئی۔ اس کا لباس گندا تھا مگر سنبل کو احساس نہیں تھا۔ اس کے سینے پر دونوں پھیلے ہوئے ہاتھ پھرتے ہوئے بولی۔ "احمد! ویری سوری...... میں جوش میں غلط کہہ گئی۔ یہ تمہارا ملک ہے۔ گندا نہیں ہے۔ کچھ لوگ گندے ہیں۔ تم بہت اچھے ہو۔ میں ہرگز اچھی نہیں ہوں۔ تمہارے مقابلے میں اچھا نہیں بول پائی، مجھے معاف کر دو۔ مگر میں یہاں سے جلد از جلد جانا چاہتی ہوں۔ میری مدد کرو۔ میں تمہاری مدد کو کبھی بھی بھول نہیں پاؤں گی۔"

احمد نے روح کو گدگداتے ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے، بولا۔ "ڈونٹ وری سنبل! میں تمہاری مدد

کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں دل کی بات کرتا ہوں کہ تم سندربن کو اپنی تحویل میں لے کر سنڈرلینڈ جاؤ۔"

"یہ ممکن نہیں ہے ناں!" سنبل نے آہستگی سے کہا اور اس کے کندھے پر اپنا گال رکھ دیا۔ سکون ملا۔ ہولے ہولے رگڑنے لگی۔ یوں لگا جیسے زندگی میں مرد کا پہلا جاگتا ہوا لمس ملا تھا جس نے روح تک میں سرشاری بھر دی تھی بولی۔ "وہ لوگ بے حس ہیں۔ انہیں رشتوں کی قدر کا علم نہیں۔ وہ صرف پتھروں کے طلبگار ہیں۔ میں انہیں پتھر دے آئی ہوں۔ اپنی زندگی بچا لائی ہوں۔ کیا یہی کافی نہیں ہے؟ اور احمد! وہ مجھے قتل کر دیں گے مگر مجھے سندربن نہیں دیں گے۔ میں چٹان کے نیچے پڑے ہوؤں کے لیے زندگی بھر کڑھتی رہوں گی مگر کچھ کر نہیں پاؤں گی۔ میرے پاس اتنی بھی دولت نہیں ہے کہ میں انہیں کہیں اور آباد کر دوں۔"

احمد بڑی آہستگی سے پلٹا۔ یوں کہ اس کی بانہوں کی سلطنت کے اندر رہا۔ اس کا گلابی چہرہ ہاتھوں میں لے کر کئی ثانیے تک اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "سنبل! تم سندربن لے سکتی ہو۔ اس کے لیے تمہیں اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بس تھرو پراپر چینل چلنا ہوگا۔ تم برٹش ہائی کمیشن میں جاؤ گی۔ اپنا تعارف کراؤ گی۔ ہائی کمشنر سے اپنے پولیس چیف کی فون پر بات کراؤ گی۔ وہ تمہارے معاملے کو بہت بہتر انداز میں ہینڈل کریں گے۔ چونکہ تمہارے ٹریولنگ پیپرز اور سامان سندربن میں پڑا ہے۔ اسے لانا ضروری ہے۔ پولیس کی مدد سے ہائی کمشنر بہ آسانی وہ سامان اٹھالے گا۔ اسی طرح وہ تمہاری پراپرٹی کیس پر بھی کام کرے گا۔ تم کسی بڑی فرم کے ساتھ لینڈ لیز ایگریمنٹ سائن کرو گی۔ سفارت خانہ ریونیو ڈیپارٹمنٹ کی مدد سے وہ ساری زمین پربت شاہ سے واگزار کرا کر فرم کی تحویل میں دے دے گا۔ تمہیں سامنے آنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔.....بس! کیا تم اتنا سا کام بھی نہیں کر سکو گی؟"

احمد نے ہتھیلی پر سرسوں جما کر دکھادی تھی۔ سنبل کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ گالوں پر سرکتا ہوا ایک ہاتھ تھام کر لبوں سے لگایا، بولی۔ "رئیلی؟"

اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے استعجاب نے پوچھا۔ "اے دلیر انسان! کیا یہ اتنا ہی آسان کام ہے؟"

احمد مسکرایا۔ اسے بڑی آہستگی سے سینے سے لگا کر آنکھوں سے بولا۔ "اے خوب صورت لڑکی! میں تمہارے ساتھ ہوں ناں!"

سنبل نے اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا۔ لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ ایسے میں نیند بھی آنے لگی۔ آہستگی سے علیحدہ ہو کر انگریزی میں بولی۔ "مجھے سونے کی تھوڑی سی مہلت دے دو۔ میں شاید اپنے آپ سے الگ ہو رہی ہوں۔"

احمد اسے قدم قدم چلاتا ہوا بیڈ پر لایا۔ اسے رسان سے لٹا کر پہلو میں بیٹھ گیا۔ پیار بھرے انداز میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ کہنے لگا۔ "تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ سو جاؤ۔ جاگنے پر بہتر فیصلہ کر پاؤ گی۔ گو اہیڈ فار آ پنک ڈریم......"

احمد کا داہنا ہاتھ بالوں سے نکل کر گداز گالوں، لبوں اور گردن کی وادیوں میں آوارگی کرتا رہا اور وہ پر تحفظ لمس کے تابع گہری نیند میں چلی گئی۔ چند منٹوں میں ہی اس کا جسم بیڈ پر منتشر ہو گیا جبکہ احمد نے بیڈ چھوڑ دیا، سنبل پر کمبل ڈالا، کھڑکی بند کی اور ہوٹل کی ریسیپشن پر جانے کے لیے کمرے سے نکل آیا۔ اسے ابھی چند کام کرنا تھے۔ ریسیپشن پر چائے کا آرڈر نوٹ کروا کر ہوٹل کی لابی میں آبیٹھا۔ وہ سپر ٹ ٹی کا عادی نہیں تھا مگر اس درمیانے درجے کے ہوٹل میں یہی چائے ملتی تھی۔ اس کے ایما پر نیلی یونیفارم میں ملبوس ایک چودہ

پندرہ سالہ لڑکا سڑک کے کسی چھپر ہوٹل سے چائے لینے کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔

اس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال سا تنا ہوا تھا۔ وہ گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ نجانے کیوں اس کا دل اس لڑکی کی بھرپور مدد پر مائل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے آج نہیں تو کل سنڈر لینڈ روانہ ہو جانا تھا۔ پربت شاہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے، اسے کوئی تعرض نہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ خود کو آگے بڑھنے سے روک نہیں پا رہا تھا۔ ایسا زندگی میں کم کم ہوتا ہے۔ پرائی آگ کو اپنے ہاتھوں پر لپیٹنا اور سینے سے لگالینا بہت مشکل ہوتا ہے مگر وہ اسے آسان کرنے پر تلا ہوا تھا۔

چائے پینے کے دوران اس نے اپنا پرس نکالا۔ نوٹ گنے۔ دل ہی دل میں حساب کتاب کیا۔ مطمئن ہو گیا۔ بڑبڑایا۔ ''نہیں یار! تم نے ہمیشہ ناکارہ زندگی گزاری ہے۔ اب زندگی کو ڈھنگ کا ایک کام مل ہی گیا ہے تو بزدل کیوں بنتے ہو...... زندگی کی قیمت چکانے کے لیے دنیا کے کسی ایک شخص کے کام تو آ ہی جاؤ ناں......''

اپنے جملے پر جوابا مسکرایا۔ واپس کمرے میں آیا۔ سنبل بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اس کے قریب کھڑا بغور دیکھتا رہا۔ وہ بلاشبہ حسن کا مکمل شاہکار تھی۔ توازن کی جیتی جاگتی مثال تھی۔ ہاتھ، پاؤں، چہرہ، گردن...... اور سب کچھ...... قدرت نے ہر لحاظ سے فراخی برتی تھی۔ وہ کافی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس پر کمبل درست کر کے قالین پر پہلو میں بیٹھ گیا۔ خوابیدگی نے کروٹ بدلی۔ ایک ہاتھ رخسار کے نیچے جبکہ دوسرا بیڈ کے باہر لٹک گیا۔ احمد نے نرمی سے اس کا اس کا ہاتھ تھاما، لبوں سے لگایا پھر لبوں اور آنکھوں پر رگڑنے لگا۔ اس نے پہلی چوری کی تھی۔ ایسے میں بے ساختہ لبوں سے نکلا۔ ''نہیں یار! تم اچھے نہیں ہو۔ تم بھی ہزاروں لاکھوں مردوں کی طرح ہو جو موقع نہ ملنے پر سادھو ہوتے ہیں جبکہ موقع ملنے پر گدھ بن جاتے ہیں۔''

اس کا ضمیر بول رہا تھا۔ دل مسکرا رہا تھا۔ اپنی سیرابی میں مگن تھا۔ وہ سیکڑوں میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لاکھوں ہزاروں کی ایوریج لسٹ میں اپنا نام لکھوانا چاہتا تھا۔ اسے خبر تھی کہ سنبل بہت تھکی ہوئی تھی۔ کافی دیر بھوک پیاس میں گزارنے کے بعد پیٹ بھر کر کھا چکی تھی۔ جلد جاگنے والی نہیں تھی مگر ضمیر نے ہاتھ سے بس کلائی تک جانے کی مہلت دی، پھر مسلسل کچوکے دے کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اٹھ کر ایک مرتبہ پھر ہوٹل سے نکل آیا۔ بازار میں گھوم پھر کر اپنے لیے لباس اور جوتے خریدنے میں محو ہو گیا۔ ریسٹ ہاؤس سے ملنے والا لباس سنبل پر فٹ نہیں تھا۔ اس نے اندازے کے مطابق اس کے لیے بھی ایک سادہ مگر گرم سوٹ خریدا۔ ریسٹ ہاؤس سے ملنے والے جوتوں کے تلووں کی لمبائی ایک بالشت سے انچ بھر کم تھی۔ وہ اسے پورے تھے۔ اسی سائز کا ایک جوڑا خرید لیا۔ یہ مقامی ڈیزائن میں تھا اور زیادہ مہنگا بھی نہیں تھا۔ کچھ اس کے لیے، کچھ اپنے لیے ضروری سامان خرید کر کمرے میں آ گیا۔ وہ بدستور سو رہی تھی۔ اس کے ضمیر اور دل کی جنگ پر آمادہ تھی۔ اس نے نگاہیں چرائیں اور باتھ روم میں وضو کرنے گھس گیا۔ چند لمحوں بعد وارڈ روب سے جائے نماز نکال کر خدا کے دربار میں حاضر ہو گیا۔

عصر ہو چکی تھی۔ مغرب ہونے کو تھی۔ اس نے پہلے عصر، پھر کئی نوافل اور کانوں میں اذان کی آواز پڑنے پر مغرب کی نماز ادا کی۔ دل میں اطمینان کی طاقت ور لہریں موجزن ہو گئیں۔ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سنبل پر ڈالی۔ دل کو اس کی الگ صورت نے پہلے کی طرح گدگدایا نہیں تو مطمئن ہو کر جائے نماز چھوڑ دی

اور صوفے پر آ گیا۔ سگریٹ سلگا کر، اسپرنگ دار انرجی سیور کو گھورتے ہوئے بولا۔ "یار احمد! کیا یہ پہلی لڑکی ہے جسے تمہاری آنکھ نے دیکھا؟ یا آخری حسن کو دیکھ رہے ہو جس کے بعد زندگی میں کسی کے آنے کی توقع نہیں ہے؟ یا تم اتنے ہی فضول واقع ہوئے ہو کہ اپنی زندگی کی تمام تر مصروفیات ترک کر کے اس کے خدائی مددگار بنے پھرتے ہو؟......"

جواب میں اپنے اندر بسیط خاموشی کا راج دیکھ کر ڈر گیا۔ دل بھی چپ نہیں رہا تھا۔ تڑخ کر جواب دیتا تھا۔ کیا اس نے سنبل کو دیکھنے کے بعد احمد کے سوالوں کو اہمیت دینا ہی چھوڑ دیا تھا؟ بولا۔ "ہوں! سمجھ گیا ہوں۔ تم پٹڑی سے اتر گئے ہو۔ فکر نہ کرو۔ تمہیں راہِ راست پر لانے کا ہنر رکھتا ہوں۔"

اس نے سر جھٹکا۔ ذہن پر اور تفکرات لادے اور سگریٹ پینے میں منہمک ہو گیا۔

وہ دس بجے بیدار ہوئی۔ کسلمندی چھٹی، احمد کو نماز میں مستغرق دیکھا پھر اسے پورے انہماک سے دیکھتی گئی۔ وہ دوزانو بیٹھا تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ آنکھیں جائے نماز پر ٹکی ہوئی تھیں۔ چہرے کی معصومیت کے تقاضے کچھ اور نظر آئے۔ اختیار نہ رہا تو باتھ روم میں گھس گئی۔ تین چار منٹ بعد اس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ آج اس نے غیر ارادی طور پر اس دربار سے رجوع کیا تھا جس دربار سے سب کچھ ملتا ہے۔

روم سروس سے کھانا کمرے میں ہی منگوا کر کھا لیا تو احمد نے ویٹر کو سنبل کے لیے کوارٹر سیٹ ٹی اور اپنے لیے چھپر ہوٹل کی چائے لانے کے لیے بھیج دیا۔ سنبل نے اچھی نیند لے لی تھی۔ احمد نہیں سویا تھا۔ اب سر بوجھل ہو رہا تھا۔ سنبل کے سوالوں کا 'ہوں، ہاں' میں جواب دے کر اپنی عدم دلچسپی ظاہر کر رہا تھا۔ وہ ہائی کمیشن کے ممکنہ تعاون کے بارے متفکر تھی۔ احمد شاید زیادہ علم نہیں رکھتا تھا، شاید زیادہ بولنا بھی نہیں چاہتا تھا، وہ گومگو کی کیفیت میں رہ کر بھی سمجھ گئی بولی۔ "تم میرے ساتھ ہی سو جاتے تو اچھا تھا۔"

اس دوران چائے آ گئی۔ سنبل اپنے لیے چائے بنانے لگی جبکہ اس نے ٹوٹی کناری والا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا بولا۔ "میں نے ہوم ورک مکمل کر لیا ہے۔ ابھی رات ہے۔ جی بھر کر سوؤں گا۔ صبح اٹھ کر تمہیں تفصیل سے آگاہ کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھ پر اعتبار کرو گی۔"

وہ چونکی۔ ایسے انسان پر، جس نے اسے زندگی لوٹائی ہو، کیوں کر بے اعتباری کی جا سکتی تھی؟

❀❀❀

علی الصباح سنبل اس سے پہلے تیار ہو چکی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اپنے سراپا کا جائزہ لینے کے بعد احمد کی خریداری کی دل ہی دل میں داد دے رہی تھی۔ احمد بھی بھرپور نیند لینے کے بعد انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اپنا لباس اٹھا کر باتھ روم جانے لگا تھا جب سنبل نے اسے آئینے میں اپنے پیچھے دیکھ کر کہا۔ "احمد! تمہاری تمام تر خریداری ٹھیک ہے۔ تم نے اتنے درست اندازے کیسے لگا لیے؟"

اس نے جماہی لی۔ اپنے سامنے اس کے ریشمی لہراتے بالوں والی کمر اور آئینے میں چہرہ دیکھ کر بولا۔ "میری ایک دوست تھی، ظفرین، میرے ساتھ کام کرتی تھی۔ ہم اکثر ساحل پر نکل جایا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھار میری قریب آ جایا کرتی تھی۔ ایسے میں اس کا قد بھی تمہاری طرح میری تھوڑی تک پہنچتا تھا۔ اس کا وزن بھی تمہارے جتنا تھا۔ پچپن کلو گرام اور ہم خریداری کے لیے بھی اکٹھے نکلا کرتے تھے۔ بس...... تمہارے لیے سامان خریدتے ہوئے وہی معلومات کام آ گئیں۔"

وہ چونکی بولی۔ "یو مین گرل فرینڈ؟ ہُم...... کیا اب بھی تمہاری اس سے دوستی ہے؟"

وہ بولا۔ "دوستی رہتی ہے، دوست ساتھ رہے یا نہ رہے۔ اسے ایک اچھا موقع ملا۔ دبئی چلی گئی۔ آخری مرتبہ، کوئی ایک سال پہلے، اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گارمنٹ فیکٹری میں اسسٹنٹ مینیجر بن گئی تھی۔ اچھا کمانے لگی تھی۔ پھر رابطہ نہیں ہوا۔"

"یعنی اس نے نیا فرینڈ بنا لیا، تم نے کوئی اور...... ہے ناں؟" سنبل نے بال سنوارتے ہوئے دلچسپی لی۔

"اس کے بارے کچھ نہیں جانتا۔ اپنے بارے جانتا ہوں۔ کسی نے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید میں بھی اکتا گیا ہوں۔"

"یعنی تم نے بہت سی گرل فرینڈز بنائیں؟"

"نہیں تو...... بس ایک وہی تو تھی جو دوست بنی تھی۔"

"تو پھر اُکتا کیسے گئے؟ میں سمجھتی ہوں کہ اُکتا جانے کا عمل کسی مسلسل عمل کے نتیجے میں انجام پذیر ہوتا ہے۔" وہ بولتے بولتے پلٹی۔

احمد مسکرایا بولا۔ "احمق ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہو۔" آدھا جملہ اس نے باتھ روم میں گھس کر ادا کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ تیار ہو کر باتھ روم سے نکلا تو وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ اس نے جائے نماز چھوڑی تو احمد کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کے پہلو میں بیڈ پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ شاید اس کے اندر کی دنیا بدل گئی تھی، یا احمد دم بہ دم بدل کر بہت ہینڈسم ہو گیا تھا۔ یا شاید اُجلے لباس کا کمال تھا۔ کچھ تھا جو دل پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ احمد نے نماز سے فارغ ہو کر انٹر کام پر روم سروس کو ناشتے کا آرڈر دیا۔ صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگائی۔ وہ بولی۔ "جاگتے ہی سگریٹ پینے لگے ہو۔ یہ غلط ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔"

اس نے مسکرا کر ٹال دیا۔ اُدھ کھلی آنکھوں اسے دیکھا۔ بہت مقدس اور نایاب لگی۔ کھلے کھلے رنگ سے سوٹ بہت میچ کر رہا تھا۔ بولا۔ "گھنٹہ بھر بعد ہم سفارت خانے کے لیے نکلیں گے۔ کیا تم نے سندر بن کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ بولی۔ "نہیں احمد! میں بس واپس جانا چاہتی ہوں۔ پلیز! مجھے مجبور نہ کرو۔ جانے دو۔ آئی ڈونٹ کیئر اباؤٹ سندر بن ناؤ......"

احمد کے چہرے پر مایوسی کا رنگ لہرایا مگر ثانیہ بھر میں معدوم ہو گیا بولا۔ "او کے! میں مصر نہیں ہوتا۔ مگر تمہیں اپنے کاغذات کے لیے ایک مرتبہ سندر بن جانا پڑے گا۔"

اس کی آنکھوں میں تشویش اور خوف جاگزیں ہوا۔ ٹھہر کر بولی۔ "ہاں! یہ تو ہے۔ مگر تم میرے ساتھ ہو گے ناں!"

اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ بولا۔ "میں تمہارے ساتھ سندر بن نہیں جاؤں گا کیونکہ وہ میرا علاقہ ہے۔ وہ لوگ مجھے دیکھتے ہی میرے دشمن ہو جائیں گے۔ تمہارے جانے کے بعد مجھے بھی ہمیشہ کے لیے سندر بن چھوڑنا پڑے گا۔ امید ہے تم میری مجبوری سمجھ رہی ہو؟"

وہ سمجھ گئی۔ ڈر بھی گئی۔ احمد کے بغیر سندر بن نہیں جا سکتی تھی۔ جانا بھی ضروری تھی۔ کندھے اچکا کر بولی۔ "او کے! ابھی ہائی کمیشن چلتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ اگر مجھے سندر بن جانا پڑا تو میں پربت شاہ سے اپنی وادی چھیننے کی کوشش بھی ضرور کروں گی۔"

احمد کی آنکھوں میں جاندار چمک پیدا ہوئی۔ ایسے میں ناشتہ سرو کر دیا گیا۔ نو بجے، جب وہ کمرہ چھوڑنے لگے تو احمد نے اسے صوفے کے پاس روک لیا۔ سنبل

کے کندھے پر مفلر کی طرح رکھی ہوئی نئی شال کو دونوں ہاتھوں میں پھیلایا۔ آنکھوں سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھی مگر تھوڑا غلط سمجھی۔ قریب آکر رکنے کے بجائے احمد کی کھلی بانہوں کے نیچے سے ہاتھ نکال کر لپٹ گئی۔ وہ خود کو سنبھال نہ پایا۔ کمر کے بل دیوار سے ٹکرایا، بولا۔ ''اوئے اوئے! یہ کیا کر رہی ہو؟''

وہ شرارت سے بولی۔ ''تم نے خود ہی تو مجھے بلایا تھا۔''

اس نے بلایا نہیں تھا مگر بن بلائے مہمان کو خود سے علیحدہ کرنا بھی مشکل ثابت ہوا۔ سانسوں کے مدوجزر سے پہلوتہی کرتے ہوئے اس نے شال اوڑھا دی کہا۔ ''پلیز! ون سٹیپ بیک وارڈ!''

وہ الگ ہو کر تھوڑا پیچھے ہٹی۔ اس نے شال کا ایک پلو گھمایا، چہرہ چھپا کر دوسرے رخ پر ڈال دیا، بولا۔ ''ایک ہاتھ سے شال کو پکڑ لو۔ نہیں...... ادھر سے نہیں...... اِدھر سے پکڑو......''

وہ شال میں چھپ گئی۔ یورپین لڑکی کا روپ اوجھل ہو گیا۔ مقامی دکھائی دینے لگی۔ احمد نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا، بڑبڑایا۔ ''اب ہمیں سفر میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

ہوٹل سے چیک آؤٹ لینے کے بعد احمد اسے لیے مین روڈ پر آ گیا۔ موڑ پر ایک گیس پمپ پر قطار میں ٹیکسیاں نظر آئیں۔ چند ایک کالی پیلی گاڑیاں تھیں۔ چند ایک سفید رنگ کی بڑی کاریں تھی۔ اس نے ایک سیاہ شیشوں والی کار کا انتخاب کیا۔ اس سے کرایہ طے کیا اور سنبل کو لیے پچھلی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ چند لمحوں بعد گاڑی کھلی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ ایمبیسی پہنچ کر احمد کے کہنے پر سنبل نے نقاب اتار دی۔

دونوں کے پاس شناختی دستاویزات نہیں تھیں۔ اس لیے غیر متوقع اور کئی اعصاب شکن مراحل سے گزر کر وہ اسسٹنٹ فارن کمشنر کے آفس میں داخل ہوئے۔ اندازاً پچاس سالہ چاق چوبند گورے نے میز کے پیچھے بیٹھے رہ کر ان کا استقبال کیا۔ سنبل نے گھٹنے موڑ کر سیلوٹ کیا، کہا۔ ''اسسٹنٹ سارجنٹ سنبل شاہ...... فرام سنڈرلینڈ پولیس۔''

وہ چونکا۔ صوفے کی طرف اشارہ کر کے انگریزی میں مخاطب ہوا۔ ''بیٹھو۔ مجھے تمہارے آنے کی خوشی ہوئی۔ بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

سنبل نے اپنا مکمل تعارف کرایا، پاکستان آنے کی غرض و غایت بیان کی اور پیش آنے والے واقعات اس کے سامنے رکھ دیے۔ ساتھ ہی اس نے احمد کا مختصر تعارف بھی کرایا۔ احمد نے بارہ کہو کے ہوٹل کا کمرہ چھوڑنے سے پہلے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ وادی سے فرار کے دوران قتل ہونے والوں کا بالکل تذکرہ نہیں کرے گی۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب تک سنبل بولتی رہی، میزبان آفیسر یکسوئی سے سنتا رہا، اپنے رائٹنگ پیڈ پر نوٹس لکھتا رہا۔ اس کے خاموش ہونے پر بولا۔ ''مس سنبل شاہ! ابھی تمہاری شناخت کی تصدیق باقی ہے۔ کیا تمہارے پاس سفری کاغذات ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''نو سر! میں اپنے بیان کے دوران آپ کو بتا چکی ہوں کہ میرا سامان سندر بن کی حویلی میں ہے۔ میں جان بچا کر بھاگی ہوں۔ اگر میں کاغذات کے چکر میں پڑتی تو ماری جاتی۔''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''پھر بھی میں تمہیں اپنی شناختی تصدیق کے لیے کہوں گا۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ خالی ہاتھ تھی۔ ایسے میں احمد نے اسے مخاطب کیا۔ اُردو میں کہا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ تم فیس بک استعمال کرتی ہو جس کے ذریعے سمیر سے تمہارا رابطہ ہوا تھا۔ یعنی تم انٹرنیٹ یوزر ہو۔ تمہارا فیس

بک کے علاوہ ای میلنگ آئی ڈی بھی ہوگا۔ ہوسکتا ہے تم نے کسی بھی ضرورت کے تحت اپنے ڈاکومنٹس کسی ادارے کو بھیجے ہوں۔ ایسی صورت میں 'سینٹ میل' باکس سے تم وہ پیپرز حاصل کرسکتی ہو۔"

سنبل نے اسے تحسین آمیز نظروں دیکھا۔ خوشی سے بولی۔ "یس سر! آئی ہیوا یوری تھنگ ان مائی میل باکس...... یاد ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے سنڈر لینڈ چھوڑنے سے قبل اپنے تمام کاغذات اسکین کرکے اپنے میل باکس میں رکھے تھے۔ تھینک یو احمد! تم نے میری بہت بڑی مشکل آسان کردی ہے۔"

آفیسر نے مسکرا کر ایک بٹن پش کیا۔ اپنے ماتحت کو بلایا۔ اسے سنبل کو کمپیوٹر اور نیٹ کی سہولت فراہم کرنے کا حکم دے کر سنبل کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ احمد صوفے پر بیٹھا رہا۔ سنبل آدھے گھنٹے بعد لوٹی۔ تب تک کمرے میں خاموشی حائل رہی۔ آفیسر بڑے انہماک سے فائلوں میں مستغرق رہا۔ سنبل نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل مودبانہ انداز میں میز پر رکھ دی۔ آفیسر نے اپنا کام نمٹا کر اس کی فائل کا معائنہ کیا۔ مطمئن ہوکر بولا۔ "مس سنبل شاہ! تمہارے پیپرز مکمل ہیں مگر اوریجنل کا پیپر نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم سنڈر لینڈ نہیں جاسکتی ہو۔ اگر تم اپنے سامان کا نقصان برداشت کرلو اور اپنی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالو تو تمہیں سندر بن جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس فائل کو اپنے پازیٹو کمنٹس کے ساتھ ہز ایکسی لینسی ہائی کمشنر کو ریفر کردیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری واپسی کا موزوں بندوبست کردیں گے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کا ردعمل مختلف تھا۔ سنبل خوش تھی جبکہ احمد پر مایوسی نے حملہ کر رکھا تھا۔ وہ بولی۔ "تو مجھے اب کیا کرنا ہوگا؟"

"تم ایک گریٹ کنٹری کی معزز شہری ہو۔ پاکستان

عقیدے

٭ اسلامی ملک مالدیپ کے باشندوں کا عقیدہ ہے کہ اگر انہیں کسی نے کھاتے دیکھ لیا تو دیکھنے والے کا پیٹ بھر جائے گا اور وہ خود بھوکے رہ جائیں گے۔

٭ امریکا میں اگر گائے دُم اوپر اٹھائے تو بارش کا امکان ہوتا ہے۔

٭ برصغیر میں مسلمان صفر میں شادی نہیں کرتے تھے۔

٭ قدیم یونانی اپنے بدصورت بچوں کو چٹانوں سے نیچے پھینک دیتے تھے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

میں تمہاری حفاظت اور مدد کرنا اس دفتر کی ذمہ داری ہے۔ تمہارے کاغذات کی متعلقہ محکموں سے جانچ پڑتال، ریٹرن ٹکٹ پر سیٹ ریزرویشن اور باقی معاملات کے لیے ہمیں دو دن درکار ہیں۔"

"یعنی میں تھرس ڈے کو دوبارہ یہاں آؤں؟"

"نہیں...... میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔ تمہارے ساتھ کوئی بھی غیر متوقع صورتِ حال پیش آسکتی ہے۔ ہائی کمیشن تمہاری رہائش اور حفاظت کا بندوبست کرے گا۔" اس نے ایک کاغذ اور بال پوائنٹ میز پر اس کی طرف سرکائی۔ "تم مجھے انہی سہولیات کے مطالبے پر مبنی درخواست لکھ کردو۔ میں اسے بھی متعلقہ شعبے کو ریفر کر دیتا ہوں۔ میرا آفس بہترین کوشش کرے گا کہ تمہیں پاکستان میں کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔"

اس نے احمد کی مدد سے درخواست لکھی۔ آفیسر کے حوالے کی۔ اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے تھمایا کہا۔ "تم جہاں جانا چاہو، چلی جاؤ۔ تمہارے پیپرز کی

تصدیق ایک گھنٹہ میں ہو جائے گی۔ تم دو سے تین گھنٹوں بعد فون پر مجھ سے رابطہ کرو گی تو میں تمہیں گائیڈ کروں گا۔"

سنبل نے کارڈ احمد کو دیا اور سیلوٹ کر کے دفتر سے نکل آئی۔ چند لمحوں بعد دونوں ایمبیسی کے باہر کھڑے تھے۔ احمد نے پوچھا۔ "ہمیں کسی پارک کا رخ کرنا چاہیے یا ہوٹل کا؟"

اس نے کندھے اچکائے، بولی۔ "میں اس بارے میں موزوں جواب نہیں رکھتی۔"

"قریب ترین ہوٹل بہت مہنگے ہیں۔ چونکہ میرے پاس اتنی زیادہ رقم نہیں ہے، اس لیے ہمیں تھوڑا دور جانا پڑے گا۔ اگر تم مناسب خیال کرو تو ہمیں دو چار گھنٹے گزارنے کے لیے مانومنٹ کی سیر کر لینی چاہیے۔"

"وہ کیا ہے؟" سنبل چونکی۔

"ایک ثقافتی اور تفریحی مقام ہے۔" احمد نے اس کا اشتیاق جگایا۔ وہ تیار ہو گئی۔

تین گھنٹے گزرتے دیر نہیں لگی۔ سنبل نے کہا۔ "ماحول نے لطف دیا مگر تم نے بور کیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں میرا واپس جانے اور سندربن نہ جانے کا فیصلہ پسند نہیں آیا۔"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ تم جو کرنا چاہو گی، میں اس میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ اب ہمیں کال پوائنٹ پر جا کر تمہارے آفیسر سے رابطہ کرنا چاہیے۔ اس نے یقیناً تمہاری سیکورٹی اور رہائش کا بندوبست کر دیا ہوگا۔"

سنبل نے اقرار میں سر ہلایا۔ کال پوائنٹ پر پہنچ کر احمد نے نمبر ملایا۔ ریسیور سنبل کو تھمایا۔ ایکسچینج کے خودکار کمپیوٹر کی محفوظ شدہ آواز سنائی دی۔ "برٹش ایمبیسی فار......"

اس نے کمپیوٹر پر دی جانے والی ہدایات کے مطابق مختلف بٹن پش کیے۔ آفیسر سے رابطہ ہونے پر اپنا نام بتایا۔ اس نے کہا۔ "تمہاری تصدیق کر لی گئی ہے۔ تمہارے لیے ایک ہوٹل میں کمرہ ریزرو کرا دیا گیا ہے۔ ہوٹل کا نام اور روم نمبر نوٹ کر لو۔ وہاں تمہاری حفاظت کا مناسب انتظام موجود ہے۔ اگلی اطلاعات تمہیں وہیں بہم پہنچائی جائیں گی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق پرسوں شام کو ٹیک آف کرنے والی فلائیٹ میں تم گریٹ کنٹری روانہ ہو جاؤ گی۔ وِش یو گڈ لک......"

احمد بھی ریسیور سے کان لگائے آفیسر کی ہدایات سن رہا تھا۔ اس نے کاغذ نہ پا کر اپنی ہتھیلی پر ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر لکھ لیا تھا۔ کال پوائنٹ سے نکل کر احمد کی نظریں ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگیں۔

ٹیکسی میں ہوٹل کی طرف عازم سفر سنبل کے گویا دماغ سے بہت بڑا بوجھ اتر چکا تھا۔ مسکرا کر بولی۔ "کیا میں نقاب کر لوں؟"

احمد نے کہا۔ "ہاں! کیونکہ اس میں تم بہت اچھی لگتی ہو۔"

❀❀❀

ائر پورٹ کے لاؤنج میں دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ سنبل کے کندھے پر ایک قدرے بڑا پرس جھول رہا تھا۔ چند قدموں کے فاصلے پر ایک پولیس مین گن تھامے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ سفارت خانے کے تین اہلکار تھے جو سنبل اور احمد کو ہوٹل سے ائر پورٹ لائے تھے۔

احمد مطمئن تھا کہ چھ بجے کی فلائیٹ کے زمین چھوڑتے ہی اس کی خود ساختہ ذمہ داری بہ احسن انجام پذیر ہو جائے گی۔ اس کے باوجود اس کا چہرہ روشن نہیں تھا۔ وہ پہلے کی طرح چہک نہیں رہا تھا۔ سنبل ائر پورٹ

پر آنے سے قبل بہت خوش تھی۔ کئی مرتبہ زبانی اور تین مرتبہ عملی طور پر اس کا شکریہ ادا کر چکی تھی۔

کافی سارا وقت بے عنوان خاموشی کی نذر ہو گیا۔ سنبل نے لب کشائی کی۔ ''احمد! کیا ہمیں جدا ہونے کے آداب بھی معلوم نہیں یا اب ہمارے پاس گفتگو کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں رہا۔''

احمد مسکرایا بولا۔ ''نہیں سنبل! میں بہت خوش ہوں کہ میری محنت تمہارے کام آ گئی اور تم بہ حفاظت اپنے وطن سدھار رہی ہو۔''

''کیا تم واقعی خوش ہو؟'' سنبل نے سنجیدگی بھری نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں۔

وہ چونکا، بولا۔ ''ہاں تو..... مگر تم نے ایسا کیا محسوس کیا ہے؟''

سنبل نے سر جھکا لیا۔ اٹھایا تو احمد بھونچکا رہ گیا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں دو ننھے ننھے ستارے چمک رہے تھے۔ نم آواز میں بولی۔ ''میں ایک ہی وقت میں کامیاب فرار پر خوشی محسوس کر رہی ہوں اور شکست پر غم زدہ ہو رہی ہوں۔''

اس نے سنبل کا ہاتھ تھاما۔ تھوڑا دبایا۔ سمجھایا۔ ''تم جاتے ہوئے دل گرفتہ مت ہو سنبل! یہ زندگی ہے۔ کبھی ہار کبھی جیت۔ سب چلتا رہتا ہے۔ پربت شاہ اکیلا نہیں ہے، یہاں اس قماش کے لاکھوں افراد ہیں جن کی وجہ سے کروڑوں غریبوں کا جینا محال ہو کر رہ گیا ہے۔ تم اگر ایک پربت شاہ سے جیت بھی جاتیں تو کچھ بڑا کام نہ ہوتا۔ تم موت کی وادی سے زندہ نکل رہی ہو، تمہارے نزدیک یہی سب سے بڑی کامیابی ہونی چاہیے۔''

سنبل اس کے ایک ایک لفظ کو لبوں پر سے تھام رہی تھی۔ اس کے سرخ تر ہونٹ کپکپائے۔ ''نہیں احمد! میں اس شکست کی بات نہیں کر رہی ہوں۔''

دو بھائیوں کا قصہ

ایک سردار کے دو لڑکے مصر میں تھے۔ ایک نے علم حاصل کیا' دوسرے نے مال جمع کیا۔ آخر کار ایک بہت بڑا عالم بن گیا اور دوسرا بادشاہ ہو گیا۔ اس کے بعد یہ مال دار اپنے بھائی عالم کی طرف ذلت کی نظر سے دیکھتا تھا اور کہتا تھا کہ میں سلطنت تک پہنچ گیا اور تو ویسے ہی عاجزی اور غربت میں رہا۔ اس عالم نے جواب دیا: اے بھائی! اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر مجھ پر تجھ سے زیادہ واجب ہے اس لیے کہ میں نے پیغمبروں کی میراث یعنی علم حاصل کیا اور تجھ کو فرعون اور ہامان کی میراث ملی یعنی ملک مصر کی بادشاہت۔

فائدہ: قناعت (تھوڑے پر مطمئن رہنا) بڑی نعمت ہے اسی کے ذریعہ غریب بھائی نے علم نبوت کی دولت حاصل کر لی تھی۔

مرسلہ: عبدالرشید...... پشاور

وہ استعجاب انداز میں گویا ہوا۔ ''کیا مطلب؟ تم پھر کس کی بات کر رہی ہو؟''

اس نے اپنا آزاد ہاتھ اٹھایا۔ اس کے سینے پر انگلی رکھی بولی۔ ''مجھے تم نے ہرا دیا ہے احمد! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کسی لالچ کے بغیر کوئی شخص دنیا میں کسی دوسرے کے کام بھی آتا ہو گا۔''

اس نے گہری سانس لی اور مسکرانے پر اکتفا کیا بولا۔ ''سنبل! پاکستان بہت خوب صورت اور مکمل ملک ہے۔ تم نے اس کا حسن نہیں دیکھا۔ بدقسمتی سے تمہارا طیارہ گندگی کے ڈھیر پر لینڈ کر گیا تھا۔ تم نے جو دیکھا، وہ پاکستان نہیں تھا۔ یہ اپنے ذہن میں لے کر جانا۔''

وہ اسے اتنے غور سے دیکھ رہی تھی کہ اسے نظریں چرانا پڑیں۔ وہ بولی۔ ''ابھی فلائیٹ میں کچھ دیر باقی ہے۔ تم میری طرف دیکھو ناں!''

اس نے دیکھا۔ دل کٹ کر رہ گیا۔ چند ہی لمحوں میں دمکتا چہرہ دہک کر بجھنے لگا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ جدائی اس پر قیامت توڑ رہی تھی۔ اس کا ہلکی آنچ میں دہکتا ہوا ہاتھ چھوڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ بولا۔ ”تم جا رہی ہو۔ فی امان اللہ! مگر یہ دھیان رکھنا کہ تم نے میرے پہلو میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی تھی۔ اپنی خواہش سے پڑھی تھی اور میں نے تمہیں ایسا کرنے کا نہیں کہا تھا۔ بس...... پڑھتے رہنا...... اسے پڑھنے کے بعد قائم کرنا پڑتا ہے۔ میں نے سچ کہا تھا کہ یہ برائی سے بچاتی ہے۔ اچھائی کی طرف لے جاتی ہے۔ دنیا کو اس کی اشد ضرورت ہے۔“

سنبل لحاتی سوچ میں اتری۔ احمد نے درست کہا تھا۔ ایسے میں دل سے بولی۔ ”تھینک یو احمد! یہ تمہارا دوسرا احسان ہے مجھ پر...... میں نے دوراہا چھوڑ دیا ہے۔ اب میں مسلمان ہوں۔ صرف مسلمان...... میں نماز پڑھوں گی...... نہیں بلکہ قائم کروں گی۔ مگر...... مگر......“

اس کا لہجہ بھرا گیا۔ ایسے میں لاؤنج میں سرگوشی جیسے اناؤنسمنٹ گونجنے لگی۔ اس کی فلائیٹ تیار تھی۔ ایک جھٹکے سے احمد کی طرف بڑھی۔ لپٹ گئی۔ اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے سیاہ پڑتے ہونٹ چومنے لگی۔ اس کی یہ حرکت غیر اضطراری تھی۔ غیر ارادی تھی۔ کپکپاتے وجود کو اس کا حصہ بنائے رونے لگی۔ کہنے لگی۔ ”تم خود غرض ہو احمد۔ اگر یہ ملک اتنا ہی اچھا ہے تو تمہاری زبان نے ایک مرتبہ بھی مجھے یہاں رہ جانے کا مشورہ کیوں نہیں دیا...... تم نے یہ چاہا ہی نہیں کہ میں تمہارے وطن میں رہ جاؤں...... نہ ہمیشہ کے لیے، نہ چند دنوں کے لیے...... تم نے تو بس یہ چاہا کہ میں یہاں سے فوراً چلی جاؤں......“

اس پر عجیب نوع کی ہسٹریائی کیفیت سوار تھی۔ احمد نے کچھ کہنا چاہا۔ اسے پرسکون کرنا چاہا مگر اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ ”احمد! تم نے میری خاطر جان ہتھیلی پر رکھ دی۔ سچ کہا تھا تم نے کہ تم نے سینہ پھاڑ کر مجھے اسلام آباد پہنچایا مگر پھٹے ہوئے سینے میں میرا نام تک نہیں لکھا...... ہائے احمد! تم پتھریلے علاقے کے پتھر دل انسان ہو۔ تم نے تو مجھے عورت اور خود کو مرد ہی نہیں سمجھا...... کیوں؟ کیوں میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ثابت ہوئی؟“

احمد کا بدن سن رہ گیا۔ اس نے سنبل کا چہرہ دیکھنا چاہا مگر وہ اس کے سینے میں گھسا ہوا تھا۔ بال ہونٹوں پر سرسرا رہے تھے۔ چھت میں نصب لائٹس کی روشنی میں بالوں کی ایک لٹ کچھ زیادہ ہی چمک رہی تھی۔ اس نے اسے ہونٹوں سے لگایا۔ زبان سے چھو کر منہ میں بھر لیا۔ سنبل کی لرزش بار آواز کافی مدھم ہو گئی تھی۔ دل سن رہا تھا۔ ”احمد! میں نے پہلی مرتبہ تمہارے سینے سے لگنے کے بعد محبت کا پیام قبول کر لیا تھا۔ تم نے بیسیوں مرتبہ مجھے دل سے لگا کر پرے ہٹا دیا۔ نہیں سمجھ پائی، تم کیا ہو؟......“

پھر کانوں میں سنبل کی آواز اتری۔ ”بتاؤ ناں...... اگر تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی تو تم نے سوتے میں میرا ہاتھ کیوں چوما تھا؟“

ایسے میں احمد کو احساس ہوا کہ الوداعی ملاقات سنبل کا راستہ کھوٹا کرنے لگی تھی۔ اس نے آہستگی سے اسے خود سے علیحدہ کیا اور پسنجر گیلری کی طرف اشارہ کیا کہا۔ ”سنبل! خود کو سنبھالو۔ ان سوالوں کے جواب میرے پاس بھی نہیں ہیں۔ گڈ بائی......“

سفارت خانے کے ایک طویل قامت اہلکار نے قدم بڑھائے۔ سنبل کے پاس آ کر انگریزی میں مخاطب ہوا۔ ”میڈم! فلائیٹ تیار ہے۔ اب تمہیں چلنا چاہیے۔“

وہ چند الٹے قدم چل کر رکی۔ چاہا کہ دوڑ کر احمد تک آئے مگر ایک ہی فیملی کے چار پانچ افراد کے گھیرے میں آ گئی۔ ان کے جلو میں پسنجر گیٹ کی طرف دھکیل دی گئی۔ جب تک احمد دکھائی دیتا رہا، الٹے قدموں چلتی رہی پھر دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ احمد نے ستون کا سہارا لیا۔ کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا پھر بالکونی کی طرف چلا گیا۔ جب سنبل پسنجر بس سے نکل کر جہاز کے دروازے سے لگی سیڑھیوں والی گاڑی کی طرف بڑھی، احمد کو نظر آئی۔ اس نے کھڑے ہو کر لاؤنج کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کچھ دیر احمد کو تلاش کرتی رہیں پھر اس کا ہاتھ ہلنے لگا۔ احمد نے بھی آہستگی سے ہاتھ اٹھا دیا۔ سفارت خانے کے اہلکار اور گارڈ پسنجر بس میں سوار ہو گئے۔ ایک ایک کر کے مسافر بھی پلین میں سوار ہو گئے۔ وہ بھی اوجھل ہو گئی۔ خودکار انداز میں بند ہوتے دروازے میں ائر ہوسٹس کا لہراتا ہوا ہاتھ آخری منظر کے طور پر ثبت ہو گیا۔ احمد ریلنگ تھام کر جھکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر موٹی موٹی رگیں نمایاں تھیں جبکہ آنکھوں میں خوفناک اندھیرے کا راج تھا۔ جہاز رن وے پر سرکا اور اس کا سائز بتدریج چھوٹا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بہت دور جا کر اس نے زمین چھوڑ دی۔ وہ بڑبڑایا۔ "خدا حافظ سنبل!"

جہاز نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پژمردہ قدموں سے ویٹنگ لاؤنج میں آیا۔ ایک دروازے سے گارڈ اور سفارت خانے کے لوگ داخل ہو رہے تھے۔ دوسرے دروازے سے احمد نکل رہا تھا۔ ٹیکسی کی تلاش میں چند قدم چلا۔ ایسے میں بڑبڑایا۔ "یار احمد! جانے والی تو چلی گئی...... تم بھی اپنے سندر بن کا رخ کرو۔ تمہاری گاڑی اور سامان تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ چل بابا......"

لعنت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چھ طرح کے لوگ ہیں میں نے ان پر لعنت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر لعنت کی ہے اور ہر نبی نے بھی لعنت کی ہے۔

(۱) اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا۔

(۲) اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا۔

(۳) زبردستی مسلط ہونے والا تاکہ جسے اللہ نے ذلیل کیا ہے اسے عزت دے اور جسے اللہ نے عزت دی ہے اسے ذلیل کرے۔

(۴) اللہ کے حرام کو حلال سمجھنے والا۔

(۵) میری اولاد سے اس چیز کو حلال جاننے والا جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔

(۶) میری سنت کو ترک کر دینے والا۔

مرسلہ: اسرار علی...... کراچی

سنبل کو سنڈرلینڈ آئے دو ماہ بیت گئے تھے۔ دماغ پر نفسیاتی مرض کی طرح حملہ کرنے والے سندر بن کے واقعات کے ہولناک تاثرات مدھم ہو گئے تھے۔ آج وہ ڈیوٹی سے لوٹی تو اسے کمپیوٹر کا خیال آیا۔ اپنی عادت کے مطابق اس نے ٹشو پیپرز کی مدد سے کمپیوٹر کی صفائی کی۔ آن کیا۔ فیس بک کھولی۔ ڈھیر سارے پیغامات اور تصاویر اس کے انتظار میں تھیں۔ اس نے پہلے تصاویر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ ایسے میں ہلکی سی مانوس بیپ کے ساتھ چیٹ روم کا چوکھٹا کھل گیا۔ اس نے دیکھا۔ سمیر آن نیٹ تھا۔ اسے 'سلام' کہہ رہا تھا۔ اس کی توجہ سمیر کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس نے لکھا تھا۔ "ڈیئر سنبل! میں کافی دنوں سے ٹرائی کر رہا ہوں مگر تم نے فیس بک پر آنا ہی چھوڑ رکھا ہے۔ خیر تو ہے نا؟" اس نے لکھا۔ "مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ تم کیا

کررہے ہو؟ رقیہ کیسی ہے؟''

سمیر نے کہا۔ ''تمہیں حیرانی کی ایک بات بتانی ہے۔ دس دن قبل پربت شاہ کا سب سے چھوٹا بیٹا جمال شاہ ہمارے اسکول آیا تھا۔ وہ اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے ملا۔ آپی رقیہ سے بھی۔ پتہ ہے اس نے کیا کیا؟''

وہ منہ بنا کر بولی۔ ''کوئی غلط کام ہی کیا ہوگا۔''

''نہیں ڈیئر...... اس نے سندر بن کے دو نئے بچوں کو اسکول میں داخل کرایا۔ اسکول میں چوبیس بچے بچیاں پڑھتی ہیں۔ ان تمام کی سال بھر کی فیس ادا کی۔ اپنی جیب میں تمام بچوں کے لیے ان سلی یونیفارم بھر کر لایا تھا۔ اپنے ہاتھوں بانٹ کر گیا ہے۔ ہے ناں حیرانی کی بات؟''

اسے سمیر کے لکھے پر یقین نہیں آیا بولی۔ ''ناممکن...... میں نہیں مان سکتی۔ اس نے تمہاری آپی یا کسی اور ٹیچر کے لیے......''

''نہیں ڈیئر...... یہی تو بڑی بات ہے۔ اس نے اسکول میں تقریر بھی کی۔ آپی کو 'باجی' کہہ کر پکارا۔ ٹھہرو...... میرے پاس اس کی یونیفارم بانٹنے کی کئی فوٹو موجود ہیں۔ چند ایک ٹیگ کردی تھیں جو یقیناً تم نے نہیں دیکھیں۔ ان میں سے ایک کا لنک بھیجتا ہوں۔ کلک کرکے دیکھ لو۔''

چند لمحوں بعد چیٹ باکس میں تین سطری لنک ابھرا۔ سنبل نے کلک کیا۔ فل سکرین پر ایک تصویر دھندلائی پھر واضح ہوئی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی سنبل کے بدن کو گویا بجلی کا جھٹکا لگا۔ وہ کرسی میں بیٹھی نہ رہ سکی۔ کھڑی ہوگئی۔ جلدی سے آنکھیں ملیں اور جھک کر اپنا چہرہ ایل سی ڈی کے برابر جھکایا۔ تصویر کو دیکھا، بے اختیار لبوں سے نکلا۔ ''احمد...... یہ تو احمد ہے...... جمال شاہ تو نہیں ہے......''

وہ بے جان انداز میں کرسی میں ڈھے گئی۔ تصویر کے نیچے سمیر نے لکھا رکھا تھا۔ ''ڈیئر! یہ شاہ سائیں کا چھوٹا بیٹا جمال شاہ ہے...... اس کا پورا نام احمد جمال شاہ...... دو ماہ پہلے اپنی پڑھائی مکمل کرکے لاہور سے سندر بن آیا تھا۔''

سنبل کا ہاتھ دل پر جا ٹکا۔ یوں لگا جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا ہو۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں احمد کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں اور ہونٹوں کی سرخی میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔ کافی دیر اسی طرح بیٹھی رہی پھر تھکے تھکے انداز میں اٹھی اور وضو کرنے کے لیے واش بیسن کی طرف بڑھ گئی۔

وہ بالکل احمد کے انداز میں خود کلامی کر رہی تھی۔ ''کیوں احمد! تم نے مجھے اتنا بڑا دھوکہ دیا...... مجھے توڑ کر رکھ دیا...... نہیں...... نہیں...... تم اتنے بڑے جھوٹے ہو گئے؟ یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا...... مگر نہیں...... تم نے مجھ سے جھوٹ تو کوئی بولا ہی نہیں تھا...... بس اپنا آپ مجھ سے چھپایا تھا اور خود کو اس طرح چھپانا جھوٹ بولنے سے بھی برا ثابت ہوا......''

چہرے پر ہاتھوں کے پیالے میں بھرے ہوئے پانی کا پہلا چھینٹا پڑا...... پھر دوسرا...... پھر تیسرا...... نہیں کہیں اس کی مزاحمتوں نے دم توڑ دیا اور وہ نڈھال سی ہوکر وضو کرنے لگی۔ ایک دم بند آنکھوں کے عقب میں ذہن روشن ہوگیا اور اس کے دل کو جیسے قرار سا آ گیا۔